رہنمائے

اسلامی نظریہ حیات

(سوالاً جواباً)

بمطابق جدید نصاب

برائے امتحان بی۔ اے اسلامیات پنجاب یونیورسٹی

بتجدید نظر و اضافہ

غلام احمد حریری

ایم۔ اے (عربی)، ایم۔ اے (علوم اسلامیہ)، ایم۔ او۔ ایل (عربی)، فاضل السنہ شرقیہ۔ فاضل درس نظامی
علوم اسلامیہ مغربی پاکستان زرعی یونیورسٹی لائلپور

امتیاز احمد سعید

ایم اے (علوم اسلامیہ)
ایم۔ اے (عربی)، جے۔ ڈی۔ ڈبلیو
پی۔ ای۔ ایس شعبہ علوم اسلامیہ
گورنمنٹ کالج لاہور۔

مجید بک ڈپو

بھوانہ بازار لائلپور
اردو بازار لاہور

Marfat.com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

اشاعت اوّل — اگست ۹۶۷[illegible]ء

〃 چہارم — اکتوبر [illegible]ء

تعداد — ایک ہزار

ناشر — افتخار احمد مجید

طابع — منظفر حسین ظفر

مطبع — لائلپور لفیس پرنٹنگ پریس

ہدیہ — چار روپے پچاس پیسے

۲۹۷
غ ۱۳۵ر
۱۷۱۹۷

DATA ENTERED

Marfat.com

DATA ENTERED

نقطۂ آغاز

پاکستان کا مقصدِ وجود ایک اسلامی ریاست کا قیام ہے جسمیں مسلمان اسلامی نظریہ حیات کے اصول و ضوابط کے مطابق زندگی گذار سکیں اور اسلام کو ایک دین کامل اور ایک مکمل ضابطۂ حیات کی حیثیت سے زندگی کے تمام شعبہ جات پر منطبق کر سکیں۔ دینِ اسلام کے بارے میں اس غلط فہمی کی تاریخ خاصی پرانی ہے کہ اسلام صرف ایک نظامِ عبادات ہے جسمیں طاعت و عبادت کے طور طریقے بیان کئے گئے ہیں۔

قیامِ پاکستان سے قبل بحیثیت مجموعی مسلمانوں نے کبھی بھی اسلام کو ایک کامل نظامِ حیات کے طور سے دیکھنے اور اپنانے کی کوشش نہیں کی۔ انگریز کے عہدِ اقتدار میں دینِ اسلام کے ناقص تصور کو اور شہ ملی اور یہ غلط اندازِ فکر عام طور سے جڑ پکڑتا چلا گیا۔ دینِ اسلام کو عبادات کی حد تک محدود کرنے کے کچھ اسباب و وجوہ بھی تھے جو اس شعور کی پختگی کا باعث ہوئے۔ برصغیر پاک و ہند میں اسلام کے سوا جن مذاہب کا سکہ رواں تھا مثلاً ہندو مت۔ بدھ مت۔ یہودیت اور عیسائیت وغیرہ ان میں سے کوئی بھی نظامِ زندگی ہونے کا دعویدار نہیں۔ پھر اسلام کا یہ انوکھا دعویٰ کسی کی سمجھ میں کیونکر آسکتا تھا؟ مسلمانوں نے دوسروں کی دیکھا دیکھی دین اسلام کو چند رسوم تک محدود کر دیا۔ انگریز نے جس مذہبی آزادی کا ڈھنڈورا پیٹا تھا اس میں نماز روزہ کی اجازت اور محمڈن لاء کے نام سے مسلمانوں کے چند مخصوص قوانین ضرور موجود تھے مگر وہ اسلام کو پوری زندگی پر منطبق کرنے کی اجازت آخر کیوں دیتا؟ اور اگر دیتا تو اسکے اپنے قانون کی کیا حیثیت ہوتی اور اسکا اقتدار کیونکر باقی رہتا؟

انگریز نے کشت زارِ ہند میں اسلام کے ناقص تخیل کا جو شجرۂ خبیثہ بویا تھا اسکے چلے جانیکے بعد بھی نہ صرف باقی رہا بلکہ خوب پھلا پھولا اور برگ و بار لایا۔ انگریز نے انگریزی زبان و ادب کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب و ثقافت اور غلامانہ طرزِ فکر و تدبر بھی ترکہ میں دیا

Marfat.com

تھا وہ اسلام کے ادھورے تصور کو ہوا دیتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد بھی اسلام کو ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے اختیار کرنے کی توقعات نہ ہو سکیں، ضرورت اس بات کی داعی تھی کہ نئی پود کے قلب و ذہن کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لئے ان کے دل کی گہرائی میں یہ بات اتار دی جاتی کہ دین اسلام کو زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی کرنے ہی سے دنیوی کامرانی و شادمانی اور اخروی صلاح و فلاح وابستہ ہے۔ نیز یہ کہ اسلام کا ناقص تخیل دورِ غلامی کی یادگار ہے۔ لہذا جلد از جلد غلامی کی اس یادگار کو مٹانا ضروری ہے۔

کراچی یونیورسٹی کا یہ اقدام قابلِ تحسین ہے کہ اس نے "اسلامی نظریۂ حیات" کے نام سے ایک مبسوط کتاب شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ یہ کتاب تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب کسی ایک مصنف کی تحریر کردہ نہیں بلکہ ملک کے مشہور مصنفین کی کتب کے اقتباسات کی جامع ہے۔ سالِ رواں میں پنجاب یونیورسٹی نے اس کتاب کا پہلا اور تیسرا حصہ بی۔ اے کلاسز کے طلبہ علوم اسلامیہ کے نصاب تعلیم کے طور پر مقرر کیا ہے۔ چونکہ کتاب دقیق و عمیق افکار و مسائل پر مشتمل تھی، خصوصاً پہلا حصہ، جن کا فہم و ادراک طلبہ کے لئے چنداں آسان نہیں۔ اس لئے ہم نے ملک کے ایک مشہور اہلِ علم و قلم عربی زبان و ادب کے فاضل اور تجربہ کار پروفیسر سے "رہنمائے اسلامی نظریۂ حیات" کے نام سے یہ کتاب لکھوائی۔ مؤلف نے طلبہ کو کتاب کے اندراجات سے روشناس کرانے کی انتہائی کوشش کی ہے۔ بعض جگہ جہاں مضمون تشنۂ تکمیل تھا اپنی طرف سے مفید اضافے بھی کئے ہیں۔ تفہیم مطالب کے لئے سوال و جواب کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اصل کتاب پڑھنے کے بعد جو سوالات صفحۂ ذہن پر ابھر سکتے تھے کتاب کی روشنی میں ان کا جواب دیا گیا ہے۔ بہر کیف کتاب کو سمجھانے سے متعلق جہد و سعی کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا۔ امید ہے کہ علوم اسلامیہ کے اساتذہ و طلبہ ہماری ناچیز خدمت کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور ہمیں اپنے زریں مشوروں سے مستفید فرمائیں گے۔

مجید بک ڈپو

بھوانہ بازار لائلپور

Marfat.com

فہرست

صفحہ	مضامین	نمبر شمار
۱	مقدمہ۔	۱
۳	دین کا مفہوم۔	۲
۵	اسلامی نظریۂ حیات۔	۳
۶	مغرب کا اصل مسئلہ۔	۴
۸	اشتمالیت (کمیونزم)	۵
۱۰	زندگی کی وحدت۔	۶
۱۱	وقت کی ضرورت۔	۷
۱۴	اسلام ـــــ ایک مکمل نظامِ حیات۔	۸
۱۵	زندگی کے بنیادی مسائل اور ان کا حل۔	۹
۱۷	علم کے ذرائع۔	۱۰
۳۲	مذہب کی ضرورت۔	۱۱
۳۴	مذہب اور دوسرے جذبات میں فرق و امتیاز۔	۱۲
۳۸	فلسفہ مادیت۔	۱۳
۴۵	نفسیات اور مذہب۔	۱۴
۵۲	مذہب اور ضابطۂ اخلاق۔	۱۵
۶۰	مذہب ایک انسانی ضرورت ہے۔	۱۶
۶۳	صحیح اور غلط مذہب میں تمیز۔	۱۷
۶۸	**مذاہبِ عالم** (ایک تقابلی مقابلہ) مذہب کی تعریف۔ مذہب کا ارتقاء ہندو مذہب کی مختصر تاریخ۔ ہندو مذہب کی کتب مقدسہ۔ ہندو مذہب کے افکار و عقائد۔ ۱۔ برہما ۲۔ وشنو ۳۔ شیوجی۔	۱۸

۱۹	بدھ مت۔	۷۶
۲۰	یہودیت۔	۸۰
۲۱	عیسائیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام۔ عیسائیوں کے افکار و معتقدات۔ کفارہ کا مسئلہ۔ عیسائیوں کے فرقے۔ نشر و اشاعت۔ عیسائیوں کی کتب مقدسہ	۸۵
۲۲	اسلام :- دین اسلام کی حقیقت۔ عقائد و اعمال۔ مسلمانوں کی تعداد	۹۲
۲۳	ایک تقابلی مطالعہ۔	۹۵
۲۴	دور حاضر کی تحریکیں اور مذہب	۱۰۰
۲۵	معاشرتی ارتقاء کا تصور اور اسکے نتائج۔	۱۱۰
۲۶	اشتمالیت۔	۱۱۷
۲۷	تاریخ کی مادی تعبیر۔	۱۱۹
۲۸	طبقاتی کشمکش۔	۱۲۴
۲۹	قدر زائد کا نظریہ۔	۱۲۶
۳۰	تصور ریاست۔	۱۲۸
۳۱	مغربی تہذیب کا مستقبل۔	۱۳۲
	حصہ سوم (اسلام کا نظام حیات)	
۳۲	اسلامی نظام حیات۔	۱۳۸
۳۳	لفظ شریعت کی تشریح۔	۱۴۰
۳۴	شریعت کا مقصد اور ہمہ گیری۔	۱۴۲
۳۵	معروف و منکر کی اقسام۔	۱۴۵
۳۶	اسلامی شریعت کے ماخذ	۱۴۸
۳۷	ماخذ اول ــــ الکتاب	۱۵۰
۳۸	قرآن پاک کا موضوع۔ مقصد اور طرز خطاب۔	۱۵۳
۳۹	قرآن پاک کا موضوع۔ مقصد اور طرز خطاب۔	[illegible]

Marfat.com

۴۰	قرآن پاک کی جمع وتدوین اور حفاظت۔	۱۶۲
۴۱	**ماخذ دوئم ——— سنّت**	۱۶۹
۴۲	حدیث کی کتابت اور جمع وتدوین۔	۱۸۷
۴۳	کتابت حدیث میں صحابہ کا کردار۔	۱۹۲
۴۴	**ماخذ سوئم ——— اجتہاد۔**	۱۹۴
۴۵	اجتہاد کی تعریف۔ شرائط اور ضروریات۔	۱۹۵
۴۶	اسلام کے معاشی اصول۔	۲۰۱
۴۷	اصل مسئلہ:۔ معاشی خوشحالی کا تصور۔	۲۰۲
۴۸	اسلام کے معاشی اصول	۲۰۵
۴۹	معاشیات اور اخلاق ومذہب۔	۲۰۸
۵۰	معاشی جدوجہد اور اسکا مقام ومقاصد۔	۲۱۰
۵۱	حلال وحرام کی تمیز۔	۲۱۷
۵۲	حرمت سود۔	۲۱۸
۵۳	تجارتی اخلاقیات کا ضابطہ (ا) باہمی رضامندی (ب) دیانت (ج) ذخیرہ اندوزی کی ممانعت (د) جوّا اور سٹّہ کی ممانعت (ہ) اہل تجارت کا ذاتی اخلاق۔	۲۲۱
۵۴	اسراف کی بندش۔	۲۲۴
۵۵	ارتکاز دولت کی ممانعت۔ (۱) زکوٰۃ (۲) صدقاتِ واجبہ (۳) انفاق (۴) قانون وراثت (۵) حق سوی الزکوٰۃ (۶) العفو۔	۲۲۵
۵۶	اسلام کا سیاسی نظام۔ ملکیت وتصرف کا حق۔	۲۳۳
۵۷	اسلامی ریاست کی خصوصیات۔ عدل اجتماعی کی ضمانت	۲۴۶

Marfat.com

اصولی اور نظریاتی ریاست

اسلام اور لادینی ریاست۔	۲۵۵
اسلام اور تھیاکریسی۔	۲۶۰
شورائی اور جمہوری ریاست۔	۲۶۴
شہریوں کے حقوق و فرائض۔	۲۷۰
شہریوں کے حقوق کا تحفظ۔	۲۷۴
اسلام۔ اشتراکیت اور جمہوریت۔	۲۷۹
فلاحی ریاست۔	۲۸۴
معلم اور داعی ریاست۔	۲۹۰
اسلامی تصورِ قومیت۔	۲۹۶
خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول۔	۳۰۴

اسلام کے تقاضے

اسلام کا تصورِ دین۔	۳۰۸
اسلام کی دنیوی برکتیں۔	۳۱۲
اسلام کی امتیازی خصوصیات اور ان کا تقاضا۔	۳۲۰
امتِ مسلمہ کی ذمہ داریاں۔	۳۲۶
شہادتِ حق۔	۳۲۸
موانع اور ان کا سدِّباب۔	۳۳۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

سوال : دلائل کی روشنی میں ثابت کیجئے کہ دینِ اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔

جواب : دینِ اسلام کو دیگر مذاہب میں جو خصوصی امتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ وہ رائج الوقت مذاہب کی طرح چند افکار و عبادات اور چند رسوم کا مجموعہ ہی نہیں بلکہ وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جسکی وسعت سے انسانی زندگی کا کوئی شعبہ خارج نہیں ہے۔ اسلام انسان سے اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ جونہی وہ مسجد کی چار دیواری میں قدم رکھے اسلامی صفات کا زندہ پیکر نظر آنے لگے۔ اور جب مسجد کی حدود سے باہر نکلے تو اسلامی شعائر و احکام کے لبادہ کو اتار پھینکے۔ بخلاف ازیں اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ پوری انسانی زندگی اس سے متاثر ہو اور انسان اپنی انفرادی و اجتماعی۔ معاشرتی و تمدنی۔ معاشی و سیاسی غرضیکہ زندگی کے کسی پہلو میں بھی اسلامی ہدایات کو نظر انداز کرنے کا مرتکب نہ ہو۔

ارشادِ باری ہے

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً (سورہ بقرہ)

اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

Marfat.com

دراصل اسلام اس بات کا داعی بن کر آیا ہے کہ خدا کی زمین پہ خدا کا قانون جاری ہو اور اس کائنات ارضی کے ہر گوشہ میں خالق حقیقی کی مرضی پوری ہو۔

حکیم الامت علامہ اقبال نے ایک مشہور صوفی کا قول ذکر کر کے دور حاضر کے محدود مذہبی نقطۂ نظر اور اسلام کے وسیع انقلابی زاویۂ نگاہ کا فرق بڑی خوبی سے واضح کیا ہے صوفی صاحب واقعۂ معراج پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں

"محمد عربی آخری آسمان پر گئے اور واپس آ گئے۔ بخدا اگر میں جاتا تو کبھی لوٹ کر نہ آتا"

(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ مطبوعہ بزم اقبال لاہور) ۱۸۸

اس ایک جملہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ محدود مذہبی تصور اور انبیاء کے انقلابی نقطۂ نظر کے مابین کس قدر فرق و امتیاز پایا جاتا ہے۔ جس شخص کے پیش نظر ذاتی اصلاح اور روحانی بلندی کا حصول ہوتا ہے وہ قرب الٰہی کے لئے اپنی تمام تر مساعی وقف کر دے گا اور جب یہ مقصد اسے حاصل ہو جائے گا تو وہ دنیا کی طرف لوٹنے اور اس کی آلودگیوں سے ملوث ہونے کو کبھی پسند نہیں کرے گا۔ اس کے عین برعکس ایک نبی معرفت ربانی کی بلندیوں پہ پہنچ کر بنی نوع انسان کی اصلاح کے فریضہ سے کبھی غافل نہیں ہوتا اور جو نور ہدایت اسے بارگاہ ایزدی سے ملتا ہے اس کی مدد سے وہ ایک نئی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ انبیائے کرام کا سلسلہ دنیا میں اسی لئے جاری کیا گیا تھا کہ وہ نوع انسانی کی کایا پلٹ کر رکھ دیں اور ایک نیا معاشرہ قائم کریں۔ تمام انبیاء یہی مشن لے کر دنیا میں آئے ہیں۔ سرور رسل صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فریضہ مکمل ترین اور معیاری شکل میں انجام دیا۔ اسلام انسانی زندگی کی ذمہ داریوں سے بھاگنے کا سبق نہیں دیتا بلکہ پوری زندگی کو سنوارنے کے لئے ایک مکمل ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے اسی نظام زندگی کو "دین" اور "اسلامی نظریۂ حیات" کہتے ہیں

Marfat.com

دین کا مفہوم

سوال ۲: دین سے کیا مراد ہے۔ مختصراً بیان کیجئے۔

جواب: دین کا لفظ عربی زبان میں مختلف معانی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جن میں چار معانی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جو حسب ذیل ہیں

۱: کسی صاحب اقتدار کا غلبہ و تسلط

۲: اطاعت و بندگی

۳: طریق کار اور ضابطہ جس کی پیروی کی جائے۔

۴: جزا و سزا

قرآن کریم کی اصطلاح میں لفظ دین ایک ایسے نظام حیات سے عبارت ہے جو درج ذیل عناصر و اجزاء سے مل کر بنا ہو۔

۱: اللہ تعالیٰ کا حاکم اعلیٰ ہونا۔

۲: اس کی حاکمیت کے آگے سر نیاز جھکانا۔

۳: وہ کامل ضابطۂ حیات جو اس حاکمیت کے زیر اثر ہو۔

۴: اعمال کی جزا و سزا۔

قرآنی اصطلاح میں دین سے مراد ایک ایسا نظام زندگی ہے جس میں انسان کسی کی حاکمیت تسلیم کر کے اس کی اطاعت قبول کرے۔ اس کے حدود و قیود سے تجاوز نہ کرے۔ اسکی اطاعت شعاری کو اپنے لئے موجب عزت و انعام اور اسکی نافرمانی کو باعث ذلت و سزا تصور کرے۔ حاکمیت اعلیٰ کا منصب صرف ذات خداوندی کو حاصل ہے۔ دین اسلام کی بنیاد خداوند تعالیٰ کی حاکمیت پر رکھی گئی ہے۔ اسلام ہی وہ دین ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے لئے ضابطۂ حیات قرار دیا ہے۔

قرآن حکیم میں دین اسلام کی حقیقت ان الفاظ میں واضح کی گئی ہے!

Marfat.com

ارشاد ہوتا ہے:۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

(المائدہ ۵۔ ۳)

آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لئے اسلام کو دین کے طور پر پسند کیا۔

ارشاد فرمایا:۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

(آل عمران۔ ۱۹)

بے شک خدا کے نزدیک اصل دین اسلام ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ

(آل عمران۔ ۱۹)

جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین تلاش کرے گا اس سے وہ دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

اسلام کے لغوی معنی سر جھکانے اور اپنے آپ کو سپرد کر دینے کے ہیں۔ اسلام امن و آشتی اور صلح کو بھی کہتے ہیں۔ اسلام وہ دین ہے جو خدا کی حاکمیت کی بنیاد پر ایک نظام حیات پیش کر کے انسانوں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اسکی پیروی کریں اور اسے اپنے لئے لائحہ عمل قرار دیں۔ لفظ اسلام سے اس جانب اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جو زندگی اطاعت خداوندی سے بہرہ ور ہو گی وہ انسانیت کے لئے صلح و امن اور رحمت و برکت کی پیامبر ہو گی۔

مذکورہ بالا بیان سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ دین اور اسلام دونوں الفاظ ایک ہی حقیقت کے آئینہ دار ہیں اور معنوی اعتبار سے ان میں کوئی فرق و امتیاز نہیں پایا جاتا۔

اسلامی نظریۂ حیات

سوال ۳: اسلامی نظریۂ حیات سے کیا مراد ہے؟

جواب: نظام زندگی ہونے کے اعتبار سے اسلامی تعلیمات کے دو پہلو ہیں

ا ایک پہلو نظری و فکری ہے۔ ایک طرف اسلام ہمیں زندگی کے حقائق سے آگاہ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کائنات ارضی میں انسان کا منصب و مقام کیا ہے؟
وہ دنیا میں کیوں آیا؟ حیات دنیوی میں اسکا نصب العین کیا ہونا چاہیئے؟
خلیفۂ خدا ہونے کی حیثیت سے اس پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں؟ کن افکار و عقائد پر ایمان لانا ضروری ہے؟

۲ اسلامی تعلیمات کا دوسرا پہلو عملی ہے۔ ارکان اسلام کا مقصد یہی ہے کہ انسان نظری و فکری الجھنوں میں مشغول رہ کر عملی زندگی سے کٹ نہ جائے۔ عقائد اسی قدر ضروری ہیں جو فکری اصلاح کے لئے ناگزیر ہوں۔ عقائد میں غیر ضروری انہماک قوت عمل سے محروم کر دیتا ہے۔ اس لئے اسلامی تعلیمات میں اعمال کو خاص حیثیت حاصل ہے
عقائد اور ضابطۂ عمل کے مجموعے کا نام "اسلامی نظریۂ حیات" ہے۔ عمرانیات کی اصطلاح "آئیڈیالوجی" کا لفظ ایسے ضابطۂ فکر و عمل پر استعمال کیا جاتا ہے جو اپنی فکری و فلسفیانہ بنیاد رکھتا ہو اور تمدن و معاشرت کی گتھیاں سلجھاتا ہو۔

ڈاکٹر جمیل جالبی؟ بوآس نے "لغت فلسفہ" میں آئیڈیالوجی کی تعریف یوں بیان کی ہے کہ "آئیڈیالوجی سے نظریات کا وہ ضابطہ یا پروگرام مراد ہوتا ہے جسکی بنیاد کسی فکر و فلسفہ پر رکھی گئی ہو۔"

مشہور ماہر لسانیات ویبسٹر اسکی لکھتا ہے۔
"کسی تہذیبی، سیاسی یا معاشرتی تحریک کے لائحہ عمل کے علمی بیان کو آئیڈیالوجی"

کہتے ہیں"۔

ان تعریفات پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ نظریۂ حیات سے کسی تحریک یا نظام تمدن کے وہ عقائد و افکار مراد ہوتے ہیں جن پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہوتی ہے۔ نیز وہ معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی لائحہ عمل بھی اس میں شامل ہے جو ان افکار سے ماخوذ ہوتا ہے۔ جب ہم "اسلامی نظریات" کی اصطلاح بولتے ہیں تو اس سے مراد وہ فکری نظام اور لائحہ عمل ہے جو اسلام نے پیش کیا۔

نظریۂ حیات زندگی کے تمام شعبوں کو متاثر کرتا اور انہیں روشنی عطا کرتا ہے جس طرح ایک لڑی ہار کے موتیوں اور تسبیح کے دانوں کو باہم مربوط کر دیتی ہے اسی طرح نظریۂ حیات کی روح زندگی کے تمام شعبوں کو ایک وحدت بنا دیتی ہے۔ یہ روح زندگی کے ہر شعبہ میں جاری و ساری ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں یک رنگی اور ہم آہنگی نظر آنے لگتی ہے۔ انسانی زندگی میں حسن و خوبی کے جو مظاہر نظر آتے ہیں وہ اسی یگانگت و ہم آہنگی کی پیداوار ہیں۔

مغرب کا اصل مسئلہ

سوال نمبر ۴: آیا اہل مغرب کے یہاں کوئی نظریۂ حیات ہے یا نہیں؟ تفصیلاً لکھئے۔

جواب: اسے یورپ کی بد قسمتی کہئے کہ وہ کسی نظریۂ حیات سے بہرہ ور نہیں ہے یورپ میں عیسائیت کا سکہ رواں ہے مگر وہ بھی اسے کوئی نظریۂ زندگی نہ دے سکی جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ خود عیسائیت کا دامن اس سے خالی ہے۔ موجودہ عیسائیت

چند مذہبی رسوم کی ضرور حامل ہے مگر وہ زندگی کا کوئی لائحہ عمل پیش نہیں کر سکتی۔ یورپ میں کسی نظریۂ حیات کے فقدان کا نتیجہ آخر اس صورت میں برآمد ہوا کہ اہل یورپ نے اسکی ضرورت ہی سے انکار کر دیا اور کہنے لگے کہ نظریۂ حیات ایک بیکار چیز ہے۔

یورپ کی انتشار خیالی آخر رنگ لائی اور زندگی کے ہر شعبہ میں افراتفری اور بدنظمی کے آثار نظر آنے لگے۔ عالمی ریاست کی جگہ قومی حکومت نے لے لی اور سلطنتِ روما چھوٹی چھوٹی قومی ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔ مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا گیا۔ معاشیات میں نفع اندوزی اور سرمایہ پرستی کا رجحان رونما ہوا۔

اہل مغرب چونکہ دین حق کی ضیا پاشیوں سے محروم ہیں اس لئے ان کے بے دین فلسفی زندگی کی گتھیوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے سلجھانے میں مصروف رہے اور مربوط نظام فکر پیش نہ کر سکے۔ مثلاً سب سے پہلے ڈیکارٹ نے روح اور مادہ کی ثنویت (دوئی) کا عقیدہ اختراع کیا اور دونوں کو مستقل بالذات وجود قرار دیا۔ مشہور فلاسفر لائیبنز نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کیا کہ کائنات میں کارفرما وجود دو نہیں بے شمار ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات کا ہر جوہر (ایٹم) خود ایک کائنات ہے اور اپنا جداگانہ وجود رکھتا ہے۔ فلاسفہ اسی ڈگر پر گامزن رہے۔ لاک اور ہیوم نے روح کے مقابلہ میں مادہ کو افضل قرار دیا۔ ریاضیات اور طبعیات میں نئی نئی تحقیقات ہوئیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل مغرب "کل" کو خیرباد کہہ کر "جزو" کے پرستار بن گئے۔

ان افکار و آراء کے پیش نظر اہل مغرب میں یہ رجحان ابھرا کہ کوئی ایک نظریۂ حیات ایسا نہیں ہو سکتا جو منتشر شعبہ ہائے زندگی میں ہم آہنگی اور یگانگت پیدا کر دے۔ اہل مغرب لادینیت (SECULARISM) اور مادیت

(MATERIALISM) کی راہ پر گامزن ہیں۔ ظاہر ہے کہ لادینیت اور مادیت منفی تحریکیں تھیں وہ کوئی مثبت نظام زندگی پیش نہیں کر سکتی تھیں۔ اس طرز فکر نے مختلف شعبہ ہائے حیات کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا۔ چنانچہ معیشت و معاشرت اور اخلاق و تمدن کے درمیان کوئی ربط و ضبط باقی نہ رہا۔ اگرچہ زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی ہوئی مگر شعبہ ہائے حیات کے مابین کوئی مربوط نظم قائم نہ ہو سکا۔ تاریخ کا طالب علم یورپ کی سیاسی جمہوریت کے بلند بانگ دعاوی اور معاشیات میں نفع اندوزی کے جذبہ اور مزدوروں پر مظالم دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ اس عملی تضاد کی اصل وجہ یہ ہے کہ اہل مغرب لادینیت و مادیت پر متفق ہیں۔ حالانکہ یہ ایک منفی چیز ہے۔ مگر ان کے یہاں کوئی مثبت نظریۂ زندگی موجود نہیں جو زندگی کے مختلف شعبوں میں وحدت و یگانگت پیدا کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ آج مغربی تہذیب میں ہر جگہ انتشار کے مظاہر نظر آتے ہیں۔

اشتمالیت

سوال ۵: اشتمالیت (کمیونزم) زندگی کے مسائل حل کرنے میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہے؟ تبصرہ کیجئے۔

جواب: یورپ میں جو فکری انتشار نظریۂ حیات کے نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا کمیونزم (COMMOUNISM) اسکا توڑ مہیا کرنے کے لئے عالم وجود میں آیا۔ چونکہ کمیونزم کے پاس ایک اپنا ضابطۂ حیات تھا اس لئے شروع شروع میں اسے بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہر جگہ اس کے چرچے ہونے لگے۔ دکھی انسانیت

نے اسے آلامِ روزگار کا واحد علاج تصور کیا۔ مگر جونہی اشتمالیت نے نظری و فکری حدود سے آگے بڑھ کر عمل کی دنیا میں قدم رکھا تو اسکی ناکامی کا راز طشت از بام ہونے لگا اس کی وجہ یہ تھی کہ اشتمالیت خود ایک منفی تحریک تھی۔ اور اس کی بنیاد اس نظریہ پر رکھی گئی تھی کہ لوگوں کو مزدور و سرمایہ دار کے دو طبقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اشتمالیت کی تحریک صحت مند نظریۂ حیات پیش کرنے سے قاصر رہی تھی۔ مزید برآں اس کے یہاں مذہب و اخلاق کو سرے سے کوئی اہمیت حاصل نہیں۔ ان وجوہ و اسباب کی بنا پر کمیونزم میں اب لوگوں کے لئے کوئی جاذبیت باقی نہیں رہی تھی

اس بات کا کیا علاج کہ دنیا میں ایک طرف تو صحت بخش نظریۂ حیات کا وجود کہیں نظر نہیں آتا اور دوسری طرف ایک ایسے ضابطۂ حیات کی ضرورت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے جو زندگی کے مسائل کو صحت مند بنیادوں پر حل کرے۔ یہ ایک مسلّم صداقت ہے کہ زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے۔ انسان کی شخصیت ایک ہی ہے۔ اور وہ بیک وقت دو متضاد کردار ادا نہیں کر سکتا۔ ایسا کرنے کی صورت میں وہ انتشار کا شکار ہو جائے گا۔ دورِ حاضر میں ہر طرف بے اطمینانی کے آثار نظر آتے ہیں۔ طبقاتی کشمکش نوجوانوں کی سینہ زوری اور دین سے بیگانگی اس بات کی زندہ دلیل ہے کہ دورِ حاضر کا انسان ذہنی سکون و اطمینان کی دولت سے یکسر محروم ہے۔ انہی حالات کے پیشِ نظر پروفیسر جوڈ نے کہا تھا

"ہم نے فضاؤں میں پرندوں کی طرح اڑنا اور سمندروں میں مچھلیوں کی طرح تیرنا تو سیکھ لیا ہے لیکن زمین پر انسانوں کی طرح رہنا ہمیں ابھی تک نہیں آیا ہے"

پروفیسر جوڈ کے اس زرّین ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ بلاشبہ انسان نے اس سائنسی دور میں مادی اعتبار سے بہت ترقی کی ہے۔ مگر مادی ترقی کے ساتھ ساتھ

اسکی روحانی واخلاقی اقدار میں انحطاط رونما ہوتا گیا ہے۔ حالانکہ صحیح معنی میں انسان بننے کے لئے روحانی واخلاقی ترقی بھی اسی قدر ضروری ہے جسقدر مادی ترقی۔ جب تک انسان اپنی زندگی کے یہ تقاضے پورے نہیں کرتا وہ خدا تعالیٰ کی زمین پر ایک چلتا پھرتا حیوان ضرور ہے مگر اسے انسانیت کے بلند پایہ لقب سے ملقب نہیں کیا جا سکتا۔

زندگی کی وحدت

سوال ۶: وحدت حیات سے کیا مراد ہے؟ انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے ربط و تعلق پر روشنی ڈالیئے۔

جواب: یہ درست ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف شعبے ہیں۔ مثلاً معیشت، سیاست، تمدن اور معاشرت وغیرہ۔ یہ شعبے بظاہر ایک دوسرے سے بے تعلق نظر آتے ہیں مگر ان میں حد درجہ ربط و تعلق پایا جاتا ہے۔ جسطرح ایک جسم کے اعضاء باہم مربوط ہوتے ہیں اور ان کا باہمی ربط و تعلق ہی اعضاء کو ایک حسین و جمیل جسم کی صورت میں جلوہ گر کرتا ہے۔ اسی طرح انسانی زندگی مختلف و متنوع شعبہ ہائے حیات سے عبارت ہے جو باہم حد درجہ منسلک و مربوط ہیں۔ شعبہ ہائے حیات کا باہمی تعلق زندگی میں یک رنگی و ہم آہنگی پیدا کر کے اسے حسین و جاذب نظر بناتا ہے۔

جسطرح یہ بات قرین عقل و قیاس نہیں کہ ایک شخص کا نصف چہرہ مسکرائے اور باقی نصف پر مسکراہٹ کا کوئی اثر نہ ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ تنہا معیشت یا سیاست سے پوری زندگی میں دلکشی پیدا ہو جائے۔ ایک شخص اگر معاشی ترقی کا خواہاں ہو تو

لیے چاہیئے کہ وہ معاشرت، اخلاق اور علم دینیات کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ جس طرح یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص بیک وقت مختلف سمتوں میں چل سکے اسی طرح یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اسکی زندگی کے سیاسی شعبے کا رخ مشرق کی طرف ہو اور معاشرتی شعبے کا رخ مغرب کی جانب۔

یہ حقیقت تجربہ کی روشنی میں واضح ہو چکی ہے کہ تمدنی ترقی حاصل کرنے کے لئے جزو پسندی کے بجائے تہذیبی وحدت کا راستہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ پہلے زندگی کو ایک وحدت قرار دیا جائے اور پھر اس کے مختلف النوع شعبہ جات میں ہم آہنگی اور ربط و نظم پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ دورِ حاضر کی سب سے بڑی ضرورت یہی ہے کہ بنی نوع انسان کو اس فکری انتشار سے نجات دلائی جائے جس سے وہ دوچار ہے اور جو اس کے لئے جان لیوا ثابت ہو رہا ہے۔ اس میں ذرہ بھر شبہ نہیں کہ اس انتشار خیالی کا واحد علاج ایک صحت مند نظریۂ حیات میں مضمر ہے۔ جب تک اس کائنات ارضی پر بسنے والے اسلام کے پیش کردہ نظامِ زندگی کو مکمل طور پر اختیار نہیں کر لیتے فکری انتشار کا ازالہ کسی طرح ممکن نہیں۔

روقت کی ضرورت

سوال ۷ :۔ دورِ حاضر کے فکری و عملی انتشار کو کیونکر دور کیا جا سکتا ہے؟ دلائل کی روشنی میں جواب دیجئے۔

جواب : دورِ حاضر میں متعدد ایسے اسباب جمع ہو گئے ہیں جو اس بات کے مقتضی ہیں کہ ایک صحت مند نظامِ حیات کو جلد از جلد قبول کر لیا جائے۔ مندرجہ ذیل

اسباب خصوصی طور سے ایک متوازن و مثبت نظام زندگی کو مقبول عام بنانے کے لئے زمین ہموار کر رہے ہیں۔

۱ : مصنفین یورپ مثلاً جیمز اسٹورٹ مل اور لارڈ ڈبلیوسن کے زیر اثر یورپ اس زعم میں مبتلا تھا کہ ریاست (STATE) ایک انتظامی ادارہ ہے جسے لوگوں کی دینی و اخلاقی اور معاشی و معاشرتی اصلاح سے کوئی سروکار نہیں۔ آج یہ تصور حرف غلط کی طرح مٹ چکا ہے اور اس کی جگہ ایک نئے زاویۂ نگاہ نے لے لی ہے۔ آج کی ریاست ایک آفاق گیر شے ہے جو زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہے۔ تعلیم و تربیت تہذیب و ثقافت۔ معیشت و معاشرت غرضیکہ انسانی زندگی کا کوئی پہلو اس کی ہمہ گیری سے خارج نہیں۔ اب ریاست ایک مثبت ادارہ ہے جو انسانی زندگی کو مختلف سانچوں میں ڈھالتا ہے۔ اب منفی ریاست کے قیام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲ : یہ بات ایک مسلّم صداقت کے طور پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ بے دینی اور آزاد خیالی دور حاضر کے مسائل کو حل کرنے سے قاصر ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ لادینیت کا سہارا لے کر ماضی کے خلاف بغاوت کی جا سکتی ہے۔ مذہب پسند طبقہ کو برا بھلا بھی کہا جا سکتا ہے مگر اس کا کیا علاج کہ لادینیت اور آزاد خیالی کوئی ٹھوس پروگرام پیش نہیں کرتی۔ اگر مذہب کو زندگی کے پروگرام سے خارج کر دیا جائے تو بھی لادینیت سے زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ یہ امر بھی ایک نظام حیات کو قبول کرنے کا متقاضی ہے۔

۳ : دور حاضر میں جمہوریت ایک بے کار چیز بن کر رہ گئی ہے جس کی حیثیت ایک خوشنما نعرہ سے زیادہ نہیں۔ جمہوریت صرف یہ بتاتی ہے کہ "وہ کرو جو عوام چاہیں"۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام کیا چاہتے ہیں؟ اس کا کوئی واضح جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے

کہ عوام کے پیش نظر کوئی مثبت نظریہ یا تعمیری پہلو سرے سے موجود ہی نہیں۔ دوسری طرف رائج الوقت فلسفے بھی کوئی ٹھوس نظریۂ حیات پیش نہیں کر سکتے۔ وقت کی اہم ضرورت یہ ہے کہ فرد اور ریاست دونوں کے پیش نظر کوئی خاص نظریۂ زندگی ہو یہ ضرورت اتنی ہی ناگزیر و شدید ہے جتنا انسان کے لئے ہوا اور پانی۔ اس کے بغیر ریاست کا وجود و عدم برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مفکرین بیسویں صدی کی ریاست کو نظریاتی ریاست کے نام سے پکارتے ہیں۔

۴: موجودہ دور کی حیرت انگیز سائنسی ایجادات نے دنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دی ہے۔ تیز رفتار وسائل حمل و نقل کی بدولت اب مہینوں کا سفر دنوں اور دنوں کا سفر گھنٹوں میں طے ہوتا ہے۔ جغرافیائی بُعد کے کم ہونے سے اب دور افتادہ ملکوں کے ڈانڈے باہم مل گئے ہیں۔ ذرائع نشر و اشاعت کی فراوانی نیز ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو مربوط کر دیا ہے۔ اب پوری دنیا ایک شہر اور پوری انسانیت ایک خاندان بنتی جا رہی ہے۔ مذکورہ بالا اسباب و ذرائع ببانگ دہل اعلان کر رہے ہیں کہ اب انسانیت کثرت و تقسیم کے فلسفہ کو خیرباد کہہ کر وحدت کی وادی میں پناہ لے رہی ہے۔ دورِ حاضر تہذیم مغرب کے قدیم فلسفہ کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

موجودہ دور میں انسان کو ایک ایسے نظریۂ حیات کی ضرورت ہے جو پوری انسانیت کو ایک مضبوط و مستحکم رشتہ میں منسلک کر دے اور ان کے باہمی تنازعات و اختلافات کو ختم کر کے ان کی کثرت کو وحدت میں بدل دے۔ خدانخواستہ اگر یہ بات نہ ہو پائی تو اس امر کا خطرہ دامنگیر ہے کہ کثرت اور تقسیم پسندی کا فلسفہ انسان کی تمام صلاحیتوں کو ضائع کر دے اور اس کے سامنے بقاء و ارتقاء کے سب راستے مسدود ہو جائیں۔

Marfat.com

اسلام — ایک مکمل نظامِ حیات

سوال ۵: اسلام دورِ حاضر کے مسائل حل کرنے میں کہاں تک کامیاب ہے؟ دلائل کی روشنی میں جواب دیجئے۔

جواب: اس میں شبہ نہیں کہ دینِ اسلام زندگی کے مسائل کو نہایت خوش اسلوبی سے حل کرتا ہے اور دنیا کا کوئی نظریۂ حیات اس ضمن میں اسکا حریف نہیں بن سکتا جو شخص بھی تعصب کی عینک اتار کر اسلامی نظامِ حیات کا مطالعہ کرے گا وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہو گا۔

اسلام ایک ایسا نظامِ زندگی پیش کرتا ہے جو ایک طرف زندگی کے مسائل کا منصفانہ حل پیش کر کے ہر طرح کی فکری الجھنیں دور کرتا ہے اور دوسری جانب تہذیبی اور تمدنی زندگی کے لئے ایک مفصل پروگرام دیتا ہے۔ اسلام کا پیش کردہ نظامِ زندگی اس قدر ہمہ گیر ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اسکی وسعتوں سے خارج نہیں۔ اسلام انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے مفصل ہدایات دیتا ہے۔ فرد ہو یا معاشرہ۔ سرمایہ دار ہو یا مزدور۔ کسان ہو یا زمیندار اسلام نے ہر ایک کے لئے نادر ترین ہدایات کا ذخیرہ باقی چھوڑا ہے اور ہر ایک کو خاص حدود کا پابند بنایا ہے۔ اسلام کا پیغام رنگ و نسل۔ ذات برادری اور جغرافیائی حدود و قیود سے آشنا نہیں۔ اسکی نگاہ میں محمود و ایاز کی کوئی تمیز نہیں۔ صہیب رومیؓ اور بلال حبشیؓ اسلام کی پناہ میں آکر وہ منصب و مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ جو ابوجہل و ابولہب کو قریشی ہونے کے باوصف حاصل نہ ہو سکا۔

اسلام انسانی معاشرہ کے تمام مسائل کا حل پیش کرتا ہے لہٰذا اس کے لئے ترقی کی راہ ہموار کرتا ہے۔ اسلام جسمانی زندگی کے پہلو بہ پہلو روحانی زندگی کو بھی نظر انداز نہیں کرتا اور وہ مادی وسائل کو اخلاقی مقاصد کے حصول کے لئے استعمال

Marfat.com

رنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسلام نہ یہ چاہتا ہے کہ دوسرے مذاہب کی طرح مادی زندگی سے بالکل ہی آنکھیں موند لی جائیں اور نہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ مادی زندگی میں نہمک ہو کر روحانی اقدار کو یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔ دین اسلام دراصل انسان کو یہ بات سکھانا چاہتا ہے کہ اس کائنات ارضی کی ہر چیز تیری خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے اور تجھے صرف ان کے لئے خلق نہیں کیا گیا۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسمان کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

(اقبال مرحوم)

زندگی کے بنیادی مسائل اور ان کا حل

سوال ۹: انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کون سے ہیں اور ان کا حل کیوں ضروری ہے؟

جواب: تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ انسان زندگی سے متعلق چند سوالات بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہر دور کے فلاسفر، علماء اور مصلحین نے اپنی اپنی دانست کے مطابق ان کا جواب دیا ہے۔ مذہب ان کا حل پیش کرتا ہے۔ فلسفہ ان کو زیر بحث لاتا ہے۔ تمدن ان کی بنیاد پر اپنی عمارت قائم کرتا ہے جب تک یہ مسائل حل نہ ہوں نہ زندگی کا کوئی مسئلہ طے ہو سکتا ہے نہ تمدن کا نقشہ جم سکتا ہے۔ وہ اساسی مسائل یہ ہیں۔

۱: اس دنیا کا آغاز و انجام کیا ہے؟
۲: کیا اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی بھی ہے؟

Marfat.com

۳ : اگر ہے تو وہ کس قسم کی زندگی ہے اور اس کے لئے ہمیں دنیوی زندگی میں کیا کچھ کرنا چاہیئے ؟

۴ : کائنات کی حقیقت کیا ہے ؟

۵ : اس کائنات کو کون چلا رہا ہے اور وہ کن صفات کا حامل ہے ؟

۶ : خالقِ کائنات اور بنی نوعِ انسان کا باہم کیا تعلق ہے ؟

۷ : کیا اس کارگاہ حیات میں کوئی اخلاقی قانون بھی ہے ؟ بصورت اثبات اسکی تفصیلات کیا ہیں ؟

۸ : کائناتِ عالم میں انسان کا منصب کیا ہے ؟

۹ : وہ خود مختار ہے یا مجبور محض ؟ وہ کسی دوسری طاقت کے سامنے جوابدہ ہے یا نہیں ؟

۱۰ : انسان کی زندگی کا نصب العین کیا ہے ؟

یہ بنیادی سوالات ہیں جن کو کوئی نظام حیات ایک لمحہ کے لئے بھی نظرانداز نہیں کر سکتا۔ ہر تمدن خواہ کسقدر گھٹیا کیوں نہ ہو ان سوالات کا حل ضرور تلاش کرے گا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ تمدن کے سب متعلقات ان مسائل سے وابستہ ہیں اور ان مسائل کو حل کئے بغیر تمدن کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ تمدن کے سب شعبے اخلاق و معاملات۔ معیشت و معاشرت۔ سیاست و اجتماعیات علم و فلسفہ۔ سب ان کے زیر اثر ہیں۔

صرف یہی نہیں کہ ان سوالات کا حل تلاش کرنا صرف اہل علم اور اربابِ دانش کا حصہ ہے بلکہ عوام کے لئے بھی ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا ازبس ناگزیر ہے۔ اس لئے کہ دانستہ یا نادانستہ طور پر ان کے بارے میں کوئی رائے قائم کئے بغیر کوئی کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ موٹی سی بات ہے کہ جب تک زندگی اور موت کے

Marfat.com

بارے میں کوئی نظریہ قائم نہ کیا جائے، انسانی افعال میں نظم و ضبط کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔ انسان بلا جبر و اکراہ اپنی مرضی سے جب کوئی کام انجام دیتا ہے تو اس کا مقصد یقیناً یا تو دنیوی فلاح ہوگا یا اخروی۔ ظاہر ہے کہ اخروی فلاح کو اسی صورت میں پیش نظر رکھا جا سکتا ہے جب انسان تصور آخرت کو جزو ایمان سمجھتا ہو۔

ان مسائل کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ معاشرہ کا ہر فرد ان مسائل کا کچھ نہ کچھ جواب اپنے ذہن میں ضرور رکھتا ہے۔ اسی جواب پر اسکی زندگی کے معاشرتی مسائل کا انحصار ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ کوئی قوم ایک خاص انداز سے ان مسائل کو حل کرتی ہو مگر عملی طور پر ان کا تمدن اس سے بالکل مختلف ہو۔ بخلاف ازیں اس قوم کے تمدن و معاشرت کی گاڑی ہمیشہ اسی راہ پر رواں دواں ہوگی جو ان کے نظریات و افکار نے متعین کی ہوگی۔

علم کے ذرائع

سوال ۱۰: وہ کون سے وسائل و ذرائع ہیں جن کی مدد سے زندگی کے بنیادی مسائل کو حل کر سکتے ہیں؟ تفصیلاً لکھیے۔

جواب: ہم بنیادی مسائل کو حل کرنے میں ان وسائل و ذرائع کو کام میں لائیں گے جن سے تحصیل علم میں مدد لی جاتی ہے۔ ہم ان پر ترتیب وار روشنی ڈالتے ہیں۔

۱: حواس خمسہ: دیکھنے، سننے، چھونے، چکھنے اور سونگھنے کی قوتوں کو عربی میں علی الترتیب باصرہ، سامعہ، لامسہ، ذائقہ اور شامہ کہتے ہیں بحیثیت

Marfat.com

مجموعی ان کو حواس خمسہ کہا جاتا ہے۔ ان قوتوں کے ذریعے سے ہمیں محسوسات کا علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ حواس ہمارے علم کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ یقینی ذریعہ ہیں۔ تاہم ان کے ذریعہ صرف محسوسات کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ غیر محسوسات کا ادراک ان سے ممکن نہیں۔ خلاصہ یہ کہ حواس سے صرف مادی اشیاء کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو بنیادی مسائل موضوع بحث ہیں وہ سب مابعد الطبعیاتی (MATAPHYSICAL) ہیں۔ بنابریں ان کے حل میں حواس خمسہ سے کوئی مدد نہیں مل سکتی۔

۲ : عقل : تحصیل علم کا دوسرا ذریعہ عقل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عقل انسان و حیوان کے مابین وجہ امتیاز اور بنی نوع آدم کی عظیم خصوصیت ہے۔ تاہم عقل زندگی کے بنیادی مسائل کو حل کرنے سے قاصر ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ عقل محسوسات و مشاہدات کے بغیر تنہا حصول علم کے لئے کافی نہیں۔ علوم عقلیہ کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ ان کی بنیاد معمولی قسم کے محسوسات اور سطحی معلومات پر رکھی گئی ہے۔ جہاں حواس کام نہیں کرتے وہاں عقل بھی بے بس نظر آتی ہے۔ جب مذکورہ صدر مسائل حواس کے دائرہ سے خارج ٹھہرے تو وہ یقیناً عقل کی گرفت میں بھی نہیں آ سکتے۔

ؔ نکل جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے۔

(اقبالؒ)

عقل کی اس کوتاہ دامنی کے باوصف انسان نے ان سوالات کو حل کرنے کی سعی ناکام کی ہے۔ اس سلسلہ میں "فلسفہ" عالم وجود میں آیا۔ فلسفہ کسی نوع کا بھی ہو وہ اپنی اصل و اساس کے اعتبار سے ایک ہی ہے۔ خدا کی ذات و صفات کے

Marfat.com

بارے میں عقل کا صریح فیصلہ یہ ہونا چاہیئے تھا کہ یہ ہمارے ادراک سے باہر ہے۔ مگر مقام حیرت ہے کہ ہر فلسفہ نے ایسے دقیق مسئلہ کو عام محسوسات کے دائرہ میں داخل کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یونانی فلسفہ اور علم کلام کے ماہرین ان مسائل میں گمراہ ہو گئے۔

۳: وجدان: وجدان عربی زبان میں پالینے یا حاصل کرنے کو کہتے ہیں اصطلاحاً وجدان حواس خمسہ اور عقل کے علاوہ ایک ایسا ذریعۂ علم ہے جو تزکیہ نفس یعنی ترک دنیا، نفس کشی اور ریاضت سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ علم بلا واسطہ عطیۂ الٰہی کے طور پر ملتا ہے البتہ ریاضت و نفس کشی اس کے حصول میں معاون ہوتے ہیں۔

ہمارے نزدیک یہ تو ممکن ہے کہ انسان اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر کے کچھ ایسی معلومات حاصل کرے جو حواس کے ذریعہ ممکن نہیں مگر یہ معلومات کسی طرح بھی یقینی، مشکوک اور شبہات سے پاک نہیں ہو سکتیں۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ اشراقی فلاسفہ جو اس ذریعۂ علم پر ایمان رکھتے ہیں عالم آخرت کے بارے میں مختلف الرائے ہیں۔ اگر اشراق کے ذریعہ حاصل کردہ علم یقینی ہوتا تو اس مسئلہ میں ان کے یہاں کبھی اختلاف پیدا نہ ہوتا۔ علاوہ ازیں اگر اس ذریعہ کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے مسائل زیر بحث کے حل کرنے میں کچھ مدد نہیں ملتی۔ اہل کشف کا دعویٰ ہے کہ ایک نیا عالم نظر آتا ہے۔ نئی صورتیں اور نئے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان نئی صورتوں اور نئے رنگوں سے نہ تو زندگی اور موت کا مسئلہ حل ہوتا ہے نہ خدا کی صفات معلوم ہوتی ہیں۔ گویا بنیادی سوالات کا کوئی حل نہیں نکلتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظریہ کے حامل کوئی مثبت نظام حیات پیش نہیں کر سکے۔

Marfat.com

۴ : وحی : وحی اس علم کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کو بنی نوع انسان کی رہنمائی کے لئے عطا کرتا ہے۔ انبیاء و رسل خدا کے اس علم کو بندوں تک پہنچاتے ہیں۔ وحی کی تین خصوصیتیں ہیں جو اس کو علم کے دیگر ذرائع سے ممتاز کرتی ہیں۔

پہلی خصوصیت : وحی کے ذریعہ وہ علم حاصل ہوتا ہے جو حواس خمسہ کی مدد سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وحی مابعد الطبیعیاتی مسائل پر روشنی ڈالتی ہے جب کہ حواس خمسہ سے صرف مادی محسوسات کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے

دوسری خصوصیت : اس علم کا ذریعہ دوسرے ذرائع سے جداگانہ نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس میں حواس خمسہ اور منطقی استدلال سے بالکل کام نہیں لیا جاتا۔ نبی جب پیش آمدہ حقائق کو اپنے مخصوص پیرایہ میں بیان کرتا ہے تو اس کے نزدیک یہ حقائق محسوسات سے بھی زیادہ یقینی و قطعی ہوتے ہیں۔

تیسری خصوصیت : وحی کے ذریعہ حاصل شدہ علم اشراقی علوم کی طرح عملی زندگی سے لاتعلق نہیں ہوتا بلکہ وہ انسانی زندگی کی شرح و تفصیل ہی پر مشتمل ہوتا ہے اور ایک ٹھوس نظام حیات پیش کرتا ہے۔

سوال ۱۱ : علم کے مختلف ذرائع میں سے آپ کے نزدیک کونسا ذریعہ زیادہ قابل اعتماد ہے اور کیوں؟

جواب : مندرجہ ذیل وجوہ و اسباب کی بنا پر ان چاروں ذرائع میں سے وحی ہمارے نزدیک زیادہ قطعی و حتمی علم کی حامل ہے۔

Marfat.com

۱: وحی نظامِ زندگی سے بحث کرتی اور زندگی کا عملی پروگرام پیش کرتی ہے لہٰذا وحی کا پیش کردہ علم ہی انسانی زندگی کی رہنمائی کے لئے سرمایۂ ہدایت ہے۔ تاریخ اس بات کی زندہ گواہ ہے کہ الہامی علوم بعض معاشروں کے نظامِ زندگی کی بنیاد رہ چکے ہیں۔

۲: جب اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بنی نوع انسان کی مادی ضرورتوں کو پورا کرنے کا اہتمام کیا ہے تو انسان کے لئے روحانی رہنمائی مہیا کرنا اس کی رحمت سے کچھ بعید نہیں۔ چنانچہ وحی اسی روحانی تشنگی کا ازالہ کرتی ہے۔ یہ وصف علم کے دیگر ذرائع میں موجود نہیں۔

۳: وحی کے ذریعہ قطعی اور یقینی علم حاصل ہوتا ہے جب کہ دیگر ذرائع سے حاصل کردہ علم مشکوک و مشتبہ ہوتا ہے۔

۴: وحی سے حاصل شدہ علم اختلاف و تضاد سے پاک ہوتا ہے۔ بخلاف ازیں عقلی علوم میں کثیر اختلاف پایا جاتا ہے اور ان کے نظریات ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں۔

سوال ۱۲: وحی کی صداقت و حقانیت کن دلائل سے ثابت ہے؟ تفصیلاً بیان کیجئے۔

جواب: جب یہ بات دلائل کی روشنی میں ثابت ہو چکی ہے کہ وحی عقل کے عین مطابق ہے اور ان دونوں کے مابین کوئی تضاد نہیں پایا جاتا تو ایک دانشمند آدمی پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ وحی سے ثابت شدہ حقائق کو جانچنے پرکھنے اور اگر

وہ صحیح ثابت ہوں تو ان پر ایمان لے آئے۔ کسی آدمی کے قول کو جانچنے کے لئے ہمارے پاس دو معیار ہیں۔

۱: قائل کی شخصیت کو جانچا جائے۔

۲: قول کے معنی و مفہوم پر غور کیا جائے۔

جہاں تک پہلے معیار کا تعلق ہے سب انبیائے کرام صادق القول اور راستباز ہیں۔ خدا کے پیغام کو پہنچانے میں انہوں نے کبھی تساہل و تغافل سے کام نہیں لیا۔ بنا بریں وحی کا جو پیغام انہوں نے ہم تک پہنچایا وہ ہر قسم کے شک و شبہ سے پاک اور ہر لحاظ سے یقین و اعتماد کے لائق ہے۔

صداقتِ اقوال کا پہلا معیار: باقی رہا دوسرا معیار تو اس ضمن میں یہ امر قابلِ لحاظ ہے کہ کسی قول کی صحت کے لئے ضروری ہے کہ وہ تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف نہ ہو۔ اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ میں نے ہاتھی کو ہوا میں اڑتے ہوئے دیکھا ہے تو اسکی یہ بات قابلِ تسلیم نہیں۔

انبیاءؑ کے اقوال اس معیار پہ پورے اترتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے فرمودات یا تو مابعد الطبیعات سے متعلق ہونے کی بنا پر تجربہ و مشاہدہ کے دائرہ سے باہر ہیں، یا عقل و قیاس کے عین مطابق ہیں۔ رسالت کی تاریخ اس بات کی زندہ گواہ ہے۔ کہ کسی نبی نے کوئی بات خلافِ عقل نہیں کہی۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بنی نوعِ انسان اس کی کوئی بات سمجھ نہ سکیں۔

صداقتِ اقوال کا دوسرا معیار: قول کی صداقت کا دوسرا معیار یہ ہے کہ وہ تناقض و تضاد سے پاک ہو۔ انبیائے کرام کے ارشادات ہمیشہ تضاد کے عیب سے پاک رہے ہیں۔ حضرات انبیاءؑ سب کے سب دین اسلام کے مبلغ ہیں اور ان کے اقوال سرچشمہ وحی سے مستفاد ہیں۔ بنا بریں ان کے اقوال میں فروعی قسم کا فرق

Marfat.com

وامتیاز ہو سکتا ہے لیکن اصول میں کوئی فرق نہیں۔

صداقت اقوال کا تیسرا معیار: اقوال کی صحت کا تیسرا معیار یہ ہے کہ ان پر عمل کرنے سے خوشگوار نتائج برآمد ہوں۔ ظاہر ہے کہ انبیاء کی تعلیمات سے ہمیشہ مفید نتائج برآمد ہوئے اور انسانیت عدل وانصاف اور خوشحالی و فارغ البالی کی نعمتوں سے مالامال ہوئی۔

اقوال کے ناقابل اعتماد ہونے کی ایک وجہ یہ ہوتی ہے کہ قائل جھوٹا اور بدکردار ہوتا ہے۔ ایسا شخص یا تو دانستہ جھوٹ گھڑ لیتا ہے یا صحیح قول کو توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے۔ مگر انبیاء کا دامن اس سے پاک ہے۔ یہاں تک کہ ان کے دشمن بھی ان کو بلند کردار اور صادق القول تسلیم کرتے ہیں۔ بعض اوقات نادانستہ طور پر بھی قول میں غلطی واقع ہو جاتی ہے جسکی وجہ یہ ہوتی ہے کہ قول کا ناقل سلیم العقل نہیں ہوتا۔ یا حافظہ کی کمزوری کی وجہ سے اصل بات بھی بھول جاتا ہے۔ انبیاء بالاتفاق اس کمزوری سے بھی پاک ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہی اشخاص کو نبی منتخب کرتا ہے جو سلیم المزاج، سنجیدہ اور صائب الرائے ہوں۔

غیر شعوری طور پر قول میں غلطی واقع ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ فنّی علوم کے زیر اثر اس کے مفہوم میں تبدیلی پیدا ہو جائے۔ انبیاء اس غلطی سے بھی محفوظ ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ فنّی اور ادبی علوم سے یکسر بیگانہ ہوتے ہیں یہ اس بات کی قوی دلیل ہے کہ ان کی تعلیمات دوسروں کے علوم کا نتیجہ نہیں بلکہ کسی غیر معمولی ذریعہ سے ان پر نازل ہوتی ہیں اور کسی تبدیلی کے بغیر بنی نوع انسان تک پہنچا دی جاتی ہیں۔

Marfat.com

سوال ۱۳: حسی تمدن سے کیا مراد ہے؟ تفصیلاً لکھئے

جواب: انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کا اصل اور واقعی حل وہی ہے جو انبیائے کرام نے پیش کیا۔ حسی تمدن کی بنیاد محسوسات پر رکھی جاتی ہے وہ ان مسائل کے حل کرنے میں بری طرح ناکام رہتا ہے۔ ایسے تمدن کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱: اس تمدن کی بنیاد ان ظاہری اشیاء پر رکھی جاتی ہے جن کو حواس خمسہ کے ذریعہ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ حواس سے چونکہ صرف مادی اشیاء کا ادراک کیا جاسکتا ہے اس لئے حسی تمدن صرف انہی اشیاء کا قائل ہے جو حواس سے محسوس کی جاتی ہوں۔ جو امور حواس کی گرفت سے باہر ہوں وہ اس کے نزدیک صرف وہمی اور فرضی ہیں۔ چونکہ یہ تمدن انسانی خواہشات کو سب سے زیادہ پورا کرنے والا ہے اس لئے یہ دنیا کا مقبول ترین تمدن ہے۔ امریکہ کے ماہر عمرانیات پروفیسر سوروکن نے ایسے تمدن کا نام (SENSATE CULTURE) تجویز کیا ہے۔ عرف عام میں ایسے تمدن کو مادی تمدن (MATERIALISTIC CULTURE) کہتے ہیں۔

۲: یہ تمدن محسوسات کی دنیا سے آگے بڑھ کر کسی چیز کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کی نگاہ میں غیر مادی خدا اور موت و حیات کوئی چیز نہیں۔

۳: اس تمدن کو تسلیم کرنے والا لازمی طور سے آزاد خیال مذہب سے متنفر اور خود غرض ہوگا۔

۴: اس تمدن پر ایمان لانے والے اخلاقی حدود کے پابند نہیں ہوتے۔ ان کے نزدیک ہر وہ بات جائز اور درست ہے جس میں ان کا ذاتی نفع مضمر ہو اور ہر وہ عمل روا ہے جس سے جسمانی آرام اور خوشی حاصل ہو۔

۵: حسی تمدن پر ایمان لانے والے حاضر نفع کو ترجیح دیتے ہیں اور ان کے لئے

Marfat.com

انہیں جو کچھ بھی کرنا پڑے بے دریغ کر ڈالتے ہیں۔ وہ ہوا کا رخ دیکھ کر چلتے ہیں نفع اندوزی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوتا ہے۔ وہ اخلاقی جرأت اور صبر کے الفاظ سے آشنا ہی نہیں ہوتے

۶: جس معاشرہ میں حسی تمدن کا دور دورہ ہو وہ اخلاق عالیہ سے یکسر عاری اور انواع و اقسام کے مظالم سے لبریز ہوتا ہے۔ اس میں لوگ مختلف اخلاقی نقائص میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ کم تولنے لگتے ہیں یا شہوت رانی کے نئے نئے من مانے طریقے ایجاد کرتے ہیں۔

۷: حسی تمدن کی بڑی علامت یہ ہے کہ اس میں سینما، کلب، ناچ گھر، شراب خانے اور قمار خانے عام طور سے پائے جاتے ہیں۔ یہ ادارے اگرچہ انسانیت کے لئے حد ضرر رساں اور شہوانی جذبات کی تسکین کا ذریعہ ہیں مگر حسی تمدن میں ان کو سماجی اداروں کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

۸: جب کسی قوم میں اجتماعی شعور کی بہتات ہو تو اس میں انفرادی مفاد پرستی اجتماعی نفع اندوزی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے خلاف نبرد آزما ہو جاتی ہے۔ لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ قوم و ملک کی عظمت کے نام پر انسانی خون کی ارزانی اور ہر طرح کے ظلم و تعدی کو نہ صرف جائز بلکہ حب الوطنی کی دلیل قرار دیا جاتا ہے۔ ظہور اسلام سے قبل عرب قبائل اسی غلط فہمی کا شکار رہتے۔ لطف یہ ہے کہ اس نام نہاد روشنی کے دور میں حسی تمدن کے علمبرداروں نے ۱۹۱۴ء اور ۱۹۳۸ء کی دو جنگوں میں جسقدر انسانی خون بہا چکے ہیں اتنا خون انسانی تاریخ کی مجموعی جنگوں میں بھی نہیں بہایا گیا۔ مقام حیرت ہے کہ انسان کشی کے یہ سب مظاہر حسی تمدن کی نگاہ میں لائق تحسین ہیں موجب نفرت نہیں۔

Marfat.com

سوال ۱۴: عقلی تمدّن سے کیا مراد ہے؟ اس کے محاسن و معائب پر تفصیلی روشنی ڈالیئے۔

جواب: انسانیت کی تاریخ میں کوئی ایسا تمدّن نہیں ملتا جو خالص عقل کی بنا پر استوار کیا گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان جو کام انجام دیتا ہے ضروری نہیں کہ وہ عقل کی روشنی میں تکمیل پذیر ہوتے ہوں بلکہ انسان کے اکثر کاموں میں جذبات کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ جذبات انسان میں عمل کی تحریک پیدا کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں وہ فعل وقوع پذیر ہوتا ہے۔

کوئی تمدّن خالص عقلی نہیں ہوتا۔ جو تمدّن عقلی کہلاتے ہیں درا صل وہ بھی اپنی اصل و اساس کے اعتبار سے مادی ہوتے ہیں۔ ان کو عقلی تمدن صرف ظاہری اعتبار سے کہا جاتا ہے۔ اس کی حد یہ ہے کہ فلسفہ جو سراسر عقل پر مبنی ہوتا ہے بعض اوقات عقل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ افلاطون اور ارسطو جیسے یونانی فلاسفر جو عقل کے علم بردار تھے یونان کی بعض وہمی باتوں کو حقیقت سمجھنے لگے۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ تمدّن میں جو جذباتی یا وہمی اجزاء پائے جاتے ہیں عقل ان پر کڑی تنقید نہیں کرتی بلکہ خود ان کی بھول بھلیوں میں گرفتار ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا ہے کہ جذباتی اجزائے تمدن عملی طور پر غالب نظر آتے ہیں۔ اس کی واضح مثال یہ ہے کہ یونان کے تفریحی مشاغل میں یہ بات شامل تھی کہ انسانوں کو درندوں سے پکڑوایا جاتا اور تماشائی اس دلدوز منظر سے تفریح طبع کا سامان بہم پہنچاتے۔ ہندوستان میں ستی کی قبیح رسم عرصہ دراز تک موجود رہی۔ ظہورِ اسلام سے قبل عربوں میں دختر کشی عام طور سے رائج تھی۔

مقامِ حیرت ہے کہ ان ممالک کے مدعیانِ عقل نے ان مظالم کا سدباب کرنے

Marfat.com

گے بجائے ان کے جواز میں عقلی گھوڑے دوڑانے شروع کئے اور طرح طرح کی تاویلیں کر کے ان کا عقلی جواز ثابت کیا حالانکہ دنیا کا کوئی عقلمند انسان ان انسانیت کش مظالم کو قرین عقل و قیاس قرار نہیں دیتا۔

یورپ کے موجودہ تمدن کی مدح و ستائش میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاتے ہیں اور اسے علمی و عقلی تمدن کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ تمدن علم و عقل سے یکسر عاری اور سراسر مادی تمدن ہے۔ یورپی تمدن کی کل کائنات مادی خواہشات کی تکمیل ہے اور بس۔

سوال ۱۵: اشراقی تمدن پر روشنی ڈالئے اور اسکی خصوصیات قلمبند کیجئے۔

جواب ۱۵: اشراقی تمدن سے وہ تمدن مراد ہے جس میں دنیوی لذات کو یکسر نظر انداز کر کے تجرد اور ترک دنیا کا شیوہ اختیار کیا جائے یہ تمدن مادی تمدن کی ضد ہے جسطرح مادی تمدن میں روح اور اس کے متعلقات کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا اسی طرح اشراقی تمدن میں جسم اور مادیت کے خلاف جنگ لڑی جاتی ہے۔ اس تمدن کی بنیاد اس نظریہ پر رکھی گئی ہے کہ انسانی جسم ایک قید خانہ ہے جس میں روح کو محبوس و مقید کر دیا گیا ہے۔ جب تک روح اس قفس سے آزاد نہیں ہو جاتی طائر روح ترقی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ روح اپنے اصلی مرکز سے اسی صورت میں متصل ہو سکتی ہے جب اس قفس عنصری سے چھٹکارا حاصل کرے یا یہ قید خانہ اس حد تک کمزور ہو جائے کہ روح جب چاہے اس کی قید سے آزاد ہو کر اپنے مرکز کی طرف پرواز کر سکے۔ اشراقی تمدن کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱ : یہ تمدن جسم کے تقاضوں کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے

۲ : یہ تمدن مادیت کا دشمن ہے

۳ : اس تمدن میں اہلی زندگی کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور تجرد در رہبانیت کی ترغیب دلائی جاتی ہے۔

۴ : یہ تمدن عورت کو لعنت قرار دیتا ہے۔

۵ : روحانی کمال حاصل کرنے کے لئے اس تمدن میں طرح طرح کی جان توڑ ریاضتیں کی جاتی ہیں۔

۶ : شہری زندگی پہ ویرانوں اور بیابانوں کی سکونت کو ترجیح دینا ان کا خاص نظریہ ہے۔

ایسے تمدن کی تابندہ مثال دور وسطیٰ کا مسیحی یورپ ہے۔ اس دور میں عیسائیت پادریوں کی غلط رہنمائی کے باعث اشرافیت کے بجائے جوگیانہ اور غیر فطری نظام بن گئی۔ مشہور مورخ لیکی (LECKY) نے اپنی کتاب تاریخ اخلاق یورپ (HISTORY OF WESTERN MORALS) میں عیسائیوں کی غیر فطری ریاضتوں کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ ان سے حسب ذیل نتائج برآمد ہوئے۔

۱ : جہاں جہاں عیسائیت کا اثر و رسوخ تھا وہاں تمدن کی بنیادیں ہل گئیں۔

۲ : ملک کی آبادی میں بڑی تیزی سے کمی ہوتی چلی گئی۔

۳ : امراض و اموات کا دور دورہ ہوا۔

۴ : یورپ کے رہنے والے قحط سالی کا شکار ہو گئے۔

۵ : علم نے رخت سفر باندھا اور جہالت کا سکہ جاری ہوا۔

۶ : شہریت کے آثار مٹ گئے۔ وسائل حیات میں کمی آگئی۔

۷ : پوری مسیحی دنیا جہالت وحشت اور تاریکی کی لپیٹ میں آگئی

یہی وجوہ واسباب تھے جن کی بنا پر قرون وسطی کو قرون مظلمہ (DARK AGES) کہا جانے لگا۔

سوال ۱۶: اسلامی تمدن کے عناصر ترکیبی کیا ہیں؟ تفصیلاً لکھیئے

جواب: انبیائے عظام نے وحی الٰہی کی روشنی میں جو نظریۂ زندگی پیش کیا ہے اسے اسلامی تمدن کہا جاتا ہے۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ محض حواس عقل یا اشراق کی مدد سے ایک صحت مند معاشرہ قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اب یہ بتانا باقی ہے کہ وحی و الہام کے ذریعہ ایسے معاشرہ کا قیام کیوں کر ممکن ہے جس میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔ انبیائے کرام زندگی کے بنیادی مسائل کا جو حل پیش کرتے ہیں اسلامی معاشرہ اس پر مبنی ہوتا ہے۔ لہٰذا اسلامی تمدن کے مطالعہ سے پہلے یہ دیکھنا ناگزیر ہے کہ انبیائے کرام نے انسانی زندگی کے بنیادی مسائل کو کس طرح حل کیا۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ وہ حل حسب ذیل ہے۔

۱: انسان اور اسکی زندگی

انسان اور اسکی زندگی کے بارے میں انبیائے کرام نے چار نکات پیش کئے ہیں

اوّل: انسان خدا کی مخلوق اور اس دنیا میں خدا کا نائب ہے۔

دوئم: وہ اشرف المخلوقات ہے اور تمام مخلوقات پر فوقیت رکھتا ہے

سوئم: انسان کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ زندگی کے تمام امور میں خدا کی دی ہوئی ہدایات پر عمل پیرا ہو۔

چہارم: موجودہ زندگی کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے جس میں موجودہ زندگی کے اعمال کی جزا یا سزا دی جائے گی اور ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا۔

۲ : کائنات کی حقیقت

کائنات سے متعلق قرآن کریم میں تین باتیں واضح کی گئیں ہیں۔

اول : ہر چیز خدا کی پیدا کردہ ہے۔

دوئم : اس کائنات کا نظام خدا کے قانون (سُنّتُ اللّٰہ) کے مطابق چل رہا ہے۔

سوئم : یہ دنیا انسان کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے اور اسطرح انسان کے لئے ایک آزمائش گاہ ہے۔

۳ : اللّٰہ اور اسکی صفات

قرآن کریم میں صفات الٰہی کا تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے۔ صرف چند صفات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱ : خداوند کریم اس کائناتِ ارضی کا واحد خالق و مالک اور مُدبّر ہے۔

۲ : وہ جسم اور اس کے لوازمات سے پاک ہے۔

۳ : وہ بے مثال ہے۔ حواس کے ذریعہ اسکا ادراک ممکن نہیں۔

۴ : وہ رحیم اور عادل ہے اسکی صفتِ عدل کا تقاضا ہے کہ وہ وحی کے ذریعہ انسانوں پر راہ ہدایت واضح کرتا ہے۔ اسی بناپر وہ روزِ قیامت اچھے اور بُرے اعمال کی جزا یا سزا دے گا۔

سوال ۱۷ : اسلامی تمدّن کے اجزائے ترکیبی انفرادی اعتبار سے انسان پر کیا اثر ڈالتے ہیں ؟ وضاحت کیجئے۔

جواب : اسلامی تمدّن انسانی قلب و ذہن کی جو کایا پلٹ کرتا ہے اس کی بڑی بڑی خصوصیات حسب ذیل ہیں :-

۱ : اسلامی تمدن کے عناصر ترکیبی سب سے پہلے انسان میں اس تصور کو جنم دیتے

Marfat.com

ہیں کہ یہ عالم ارضی نہ تو ایسی سلطنت ہے جسکا کوئی حاکم نہ ہو اور نہ ہی چند بادشاہوں کی مشترکہ جاگیر ہے۔ بلکہ اسکا ایک ہی مالک ہے جو اسکا خالق بھی ہے۔ اور حاکم بھی اس نظریہ کے ذہن میں راسخ ہو جانے سے اقوام و قبائل کی تقسیم سطحی معلوم ہونے لگتی ہے۔ انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ انسانیت ایک وحدت ہے۔

۲ : تصور آخرت کے ذہن میں پختہ ہونے سے اصلاح عمل کا جذبہ ابھرتا ہے۔ انسان کو اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی معلوم ہوتا ہے۔ انسان لغو قسم کی تفریحات سے کترانے لگتا ہے۔

۳ : انسان میں احساس ذمہ داری کا جذبہ کروٹ لیتا ہے۔

۴ : ظلم و تعدی اور ایذا رسانی سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔

۵ : جب انسان اپنے آپ کو خدا کی زمین میں اسکا نائب و خلیفہ تصور کرنے لگتا ہے تو اس سے انسان میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ مخلوقِ خدا کا حاکم نہیں بلکہ خادم ہے۔ وہ ہر لحظہ خائف رہتا ہے کہ اس سے کہیں ظلم و تعدی کا صدور نہ ہو جائے اس کے برعکس ہر وقت قیام عدل و انصاف کی دھن سوار رہتی ہے۔

۶ : اسلامی تمدن میں نہ مادی تمدن کی سی خود غرضی اور مطلب برآری ہوتی ہے نہ اشراقی تمدن کا جوگیا پن اور ترک دنیا۔

۷ : اسلامی تمدن مصلحت شناسی اور زمانہ سازی کا قائل نہیں کہ ہوا کا رخ دیکھ کر چلا جائے بلکہ اسکی تعلیم یہ ہے:-

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

۸ : ترک دنیا اسلام کی نگاہ میں اسی طرح قابل مذمت ہے جیسے دنیوی مشاغل میں ڈوب جانا اور دینی امور سے اغماض برتنا۔ اسلام کی تعلیم ہے

لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ — اسلام میں ترک دنیا نہیں ہے

Marfat.com

اسلامی تمدن نے انسانی قلب و ذہن کی جو کایا پلٹ کی اس کا واضح ثبوت ہم کو قرون اولیٰ میں ہی مل سکتا ہے۔ خلافت راشدہ اسلامی تمدن کی بہترین مثال ہے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی یہ حالت تھی کہ خود موٹا جھوٹا پہنتے اور روکھا سوکھا کھاتے۔ اگر کوئی شخص کوئی لذیذ کھانا پیش کرتا تو دریافت فرماتے کیا سب مسلمانوں کو یہ کھانا میسر آ سکتا ہے؟ اگر جواب نفی میں ہوتا تو کھانا قبول نہ کرتے۔

عمر ثانی حضرت عمر بن عبدالعزیز اموی کا یہ عالم تھا کہ سرکاری کام کے لئے جو شمع جلتی تھی اس کی روشنی سے ذاتی کام نہ لیتے۔ اگر کوئی شخص ذاتی گفتگو چھیڑ دیتا تو فوراً اس کو گل کر دیتے اور اپنا ذاتی چراغ منگوا لیتے تھے۔ یہ ہیں اسلامی تمدن کے اخلاق عدل و تقویٰ کی روشن ترین مثالیں۔

مذکورہ صدر بیانات اس حقیقت کے آئینہ دار ہیں کہ زندگی کے بنیادی مسائل کا حل معرفت وحی اور رسالت کے ذریعہ ممکن ہے۔ جس تمدن کی عمارت مذکورہ صدر اصول و احکام پر استوار کی جائے گی وہ تمدن صدور جہ صحت مند اور مستحکم ہوگا۔

مذہب کی ضرورت

سوال ۱۸: مذہب کی ضرورت و اہمیت دلائل کی روشنی میں واضح کیجئے۔

جواب: مذہب کی ضرورت انسانی تاریخ کے ہر دور میں مسلم رہی ہے۔ یہ درست ہے کہ مختلف زمانوں میں انسانوں نے مختلف مذاہب اختیار کئے مگر بحیثیت مجموعی انسانوں نے مذہب کی ضرورت سے کبھی انکار نہیں کیا اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ مذہب کا جذبہ انسان میں فطری اور ازلی ہے۔ عرب میں بعض لوگ ذات خداوندی کے منکر تھے۔ اس کے باوصف جب وہ حوادث آلام میں گرفتار ہوتے یا بحری جہازوں میں سوار ہوتے اور طوفان بادو باراں میں گھر جاتے یا تلاش جان کے لالے پڑ جاتے تو وہ بھی معبود حقیقی کو پکارنے لگتے

مذہب ایک طرف انسان کو اس کی درماندگی و بے چارگی سے آگاہ کرتا ہے اور دوسری طرف انسان کو ایک ایسی ہستی کے تصور سے روشناس کرتا ہے جو لامحدود ہے اس سے انسان میں یہ احساس کروٹ لیتا ہے کہ وہ ایسی ذاتِ بے پایاں کے سامنے سرِ نیاز جھکا دے اور اس کے قوانین و احکام کی اطاعت کو اپنا شیوہ بنائے۔

خلاصہ یہ کہ مذہب دیگر انسانی جذبات کی طرح ایک جذبہ ہے۔ دانستہ یا نادانستہ، بخوشی یا بجبر کسی مذہب کو تسلیم کرنے کے لئے انسان مجبور ہے۔ بعض لوگ بظاہر مذہب کے منکر ہوتے ہیں مگر بعض چیزوں کو مافوق الفطرت مانتے ہیں۔ گویا وہ اس چیز کو وہی درجہ دیتے ہیں جو مذہب خدا کو دیتا ہے۔ اس طرح وہ لامذہب ہونے کے مدعی کہلانے کے باوجود غیر شعوری طور پر ایک مذہب کو اختیار کر لیتے ہیں

مذہب کا جذبہ انسان میں پیدائشی ہے۔ انسان جب اپنے گرد و پیش پر غور و فکر کرتا ہے تو بڑی آسانی سے اس نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ کائناتِ عالم کا یہ طویل و عریض سلسلہ کسی خالق و مالک کے بغیر عالمِ وجود میں نہیں آیا۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ظہور پذیر ہونے کے بعد یہ کارخانۂ قدرت خود بخود قائم نہیں رہ سکتا بلکہ اپنی بقا کے لئے کسی کا محتاج ہے۔ اسی اندازِ فکر سے انسان میں مذہب کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ فلسفہ بھی اسی کی پیداوار ہے۔

خداوند تعالیٰ نے اس کائناتِ ارضی پر جن ان گنت اور غیر محدود نعمتوں کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے ان کو دیکھ کر ایک حد درجہ ناشکرا انسان بھی حمدِ باری کے ترانے الاپنے لگتا ہے اور اس کے جسم کا ہر رگ و ریشہ مجسم حمد بن جاتا ہے۔

تشکر و امتنان کا یہی جذبہ مذہب کے احساس کو جنم دیتا ہے۔ ایک منکرِ خدا جب پکار اٹھتا ہے کہ "ہم کو کیا ہی اچھی نعمتیں ملی ہیں" تو غیر شعوری طور پر وہ نہ صرف خدا کا قائل ہو جاتا ہے بلکہ اپنا تعلق اپنے رب سے استوار کر لیتا ہے۔

مذہب اور دُوسرے جذبات

میں فرق و امتیاز

اس میں شبہ نہیں کہ مذہب ایک جذبہ ہے۔ مگر اس میں اور دیگر جذبات میں گہرا فرق و تفاوت پایا جاتا ہے۔ اگر مذہب ایک فرضی جذبہ کا نام ہوتا تو اسلام اور دیگر مذاہب میں کچھ فرق نہ ہوتا۔ اس لئے کہ کوئی مذہب اس جذبہ سے خالی نہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ مذہب ایک حقیقی جذبہ ہے۔ جس طرح خالق کائنات نے انسان کے تمام جذبات کی تسکین کا سامان بہم پہنچایا ہے اسی طرح اس نے مذہبی جذبہ کی تسکین کا اہتمام بھی کیا ہے۔ قرآن کریم اور تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ہر زمانہ میں انبیائے کرام آ کر انسانوں کو خدا کا پیغام پہنچاتے رہے ہیں۔ اس کائناتِ ارضی پر انبیائے کرام کی تشریف آوری اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ انسان طلبِ حق کے لئے کس قدر بیتاب ہے۔ انبیاء کی آمد اسی طلبِ صادق کا جواب ہے۔ خلاقِ عالم نے بنی نوعِ انسان کی شدید ضرورت کے پیشِ نظر حضرات انبیاء کو مبعوث کیا۔ اگر اس خاکدانِ ارضی پر انبیاء کی تشریف آوری نہ ہوتی تو بنی آدم زیورِ آدمیت سے عاری رہتے۔ پیغمبروں نے انسان کو شرفِ انسانیت بخشا۔ اس کی ہستی کی تکمیل کی اور اسے اس کا مذہب عطا کیا۔

مذکورۃ الصدر بیان اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ انسان میں طلبِ حق کا جو جذبہ موجود تھا اس کی تسکین کے لئے خداوندِ عالم نے انبیائے عظام کے ذریعہ جو ہدایت بھیجی اسی کا نام مذہب ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر انسان میں ایک ایسی ہستی کا شعور جنم لیتا ہے جو اس کو قوانینِ حیات دیتی ہے یہ ایسے قوانین ہیں جو فہمِ انسانی کو اپیل کرتے ہیں اور ان سے مفید نتائج برآمد

Marfat.com

ہوتے ہیں۔ مگر یہ نہ سمجھا جائے کہ صرف ان قوانین کا نام ہی مذہب ہے۔ بخلاف ازیں مذہب انسان کو ایک ہمہ گیر زاویۂ نگاہ بھی دیتا ہے جو انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے۔ اس تصور کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کائنات ارضی کی ہر چھوٹی بڑی چیز انسان کے لیے مظہر ربوبیت بن جاتی ہے اور وہ ہر چیز میں خداوندی جلال و جمال کا نظارہ کرنے لگتا ہے۔ انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ کائنات عالم کی کوئی چیز یونہی از خود معرض وجود میں نہیں آگئی بلکہ اس کا کوئی خالق و صانع ضرور ہے۔

اس نقطۂ نگاہ کے نتائج بڑے دور رس ثابت ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ پوری انسانی زندگی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ہو مثلاً سیاست و معاشرت ہو یا معیشت۔ صلح و جنگ ہو یا اخلاق و عبادات ان تمام شعبہ ہائے حیات پر اسی نظریہ کی حکمرانی ہوتی ہے۔

سوال:۔ ۱۹ جب تاریخ کے ہر دور میں منکرین مذہب موجود رہے ہیں تو یہ بات کیونکر صحیح ہے کہ مذہبی جذبہ ایک فطری جذبہ ہے؟

جواب:۔ یہ درست ہے کہ کوئی زمانہ منکرین مذہب کے وجود سے خالی نہیں رہا مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مذہب ایک فطری جذبہ نہیں۔ ہر قانون میں کچھ نہ کچھ استثنائی صورتیں ہوتی ہیں مثلاً قوت گویائی سے بہرہ ور ہونا انسان کی صفت لازمہ ہے مگر بعض انسان پیدائشی گونگے ہوتے ہیں۔ تعلیم یافتہ خاندان میں بعض اشخاص جاہل مطلق ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ پوری قوم میں ایک خاص جذبہ کا فقدان ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض آدمی مذہبی جذبہ کے حامل نہیں ہوتے۔

Marfat.com

جس طرح ماحول سے متاثر ہو کر بعض آدمی اپنی قوت گویائی اور دیگر قویٰ کو زائل کر دیتے ہیں۔ اسی طرح بعض اوقات مادی تعلیم کی کثرت یا روحانی تاریکی اور جہالت کی وجہ سے مذہبی جذبہ مردہ ہو جاتا ہے اور سادی فضا الحاد کے مسموم اثرات سے متاثر ہو جاتی ہے مگر یہ سب اثرات لامذہب ماحول کا نتیجہ ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مذہب کے فطری جذبہ ہونے سے انکار کر دیا جائے اور کہا جائے کہ مذہب ایک غیر فطری اور اکتسابی وصف ہے۔

مشہور برطانوی فلسفی جیمز اسٹوارٹ مل نے یہ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ مذہب ایک فطری جذبہ نہیں ہے مگر آخر کار وہ خود بھی مذہب کی گرفت سے نہ بچ سکا۔ اس نے مذہب انسانیت (RELIGION OF HUMANITY) کے نام سے ایک نیا فرقہ بنایا جس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی بجائے نوع انسانی کی ہمدردی کو مقصد اعلیٰ قرار دیا۔ اس طرح فلسفی مذکور نے غیر شعوری طور پر ایک مذہب اختیار کر لیا۔

آگسٹ کومٹ کا زاویہ نگاہ

انیسویں صدی کے مشہور فرانسیسی فلسفی آگسٹ کومت (AUGUST COMTE) نے کہا تھا کہ موجودہ سائنسی دور نے مذہبی رجحانات کو ختم کر دیا ہے۔ اس کا قول ہے کہ مذہب انسانی فکر کی ابتدائی منزل ہے۔ دوسری منزل فلسفہ اور تیسری سائنس ہے مگر تاریخی حقائق فلسفی مذکور کے قول کی تردید کرتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں مذہب سے فرار اختیار کرنے کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ تاہم مذہبی جذبہ کو کلیتہً مٹایا نہ جا سکا۔ اور فلسفہ کے ساتھ ساتھ اس دور میں مذہب بھی زندہ رہا۔ دو عظیم جنگوں کے بعد یورپ اور امریکہ میں مذہبی رجحانات میں کافی اضافہ

Marfat.com

ہوا ہے۔ موجودہ دور میں مذہبی لٹریچر دنیا بھر میں ادب کی دیگر اقسام کے مقابلہ میں بہت زیادہ پیدا ہو رہا ہے۔ ماضی قریب میں لادینی جمہوریت (SECULAR DEMOCRACY) کے نام سے جو مظالم ڈھائے گئے ہیں اب اس کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ دنیا بھر میں صرف روس ایک ایسا ملک ہے جہاں مذہب کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ مگر اب وہاں بھی مذہب کی ضرورت کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ منکرین مذہب کسی قوی دلیل سے مذہب کا ابطال ثابت نہیں کر سکے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ خدا موجود نہیں بلکہ وہ صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ذاتِ خداوندی کو تسلیم نہیں کریں گے۔ اہل یورپ نے مذہب کے خلاف جو جدید فلسفہ ایجاد کیا تھا حق یہ ہے کہ وہ مذہب کی تردید نہ کر سکا۔ دورِ حاضر کے فلاسفہ تو مذہب کی ضرورت اور خدا کے وجود کو ثابت کرنے کے لئے دلائل بھی دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جدید مفکرین مذہب کی اہمیت کے قائل ہیں۔

Marfat.com

فلسفۂ مادیت

سوال نمبر ۲۰:۔ فلسفۂ مادیت کی توضیح کیجئے اور بتائیے کہ اس کو تسلیم کرنے سے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں؟

جواب:۔ فلسفۂ مادیت ایک ایسا فلسفہ ہے جس کے نزدیک اس کائنات کی ہر چیز مادہ کی پیداوار ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ جب ہم مادہ (MATTER) کے جواہر کی حقیقت اور ان کی حرکت کے طریقوں سے پوری طرح واقف ہو جائیں گے تو اس دنیا کے تمام اسرار ہم پر واضح ہو جائیں گے۔ طبیعاتی سائنس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ حرارت۔ روشنی بجلی اور مقناطیس سب ایک ہی قوت کی مختلف صورتیں ہیں جو بذاتِ خود یا کسی چیز کے واسطہ سے ایک دوسری میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ انسانی زندگی کے بارے میں سائنس دان اگرچہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچے تاہم اس بات کا امکان ہے کہ حیاتِ انسانی بھی ایک قسم کا کیمیائی یا طبعیاتی عمل ہو ایک سائنس دان کے قول کے مطابق وہ مشترک قوت جو تمام کائنات میں کارفرما ہے اور جس کے نتیجے میں روشنی، حرارت اور بجلی وغیرہ وجود میں آتی ہے کچھ بعید نہیں کہ وہی قوت خود زندگی میں بھی کارفرما ہو۔ اگر زندگی کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے تو وہ محض ایک مادی چیز بن جائے گی۔ اور اس کے بارے میں مذہب کے سارے نظریات بیکار ثابت ہوں گے۔

سائنس دان ابھی تک یہ فتویٰ صادر نہیں کر سکے کہ انسانی فہم و شعور بھی مادی اور کیمیائی ہے۔ البتہ ان کا خیال ہے کہ ہر ذہنی عمل اور ہر جذبہ و احساس کسی نہ کسی طرح ایک طبعیاتی عمل سے ضرور متعلق ہے۔ اسی طرح انسانی ذہن و شعور کی

Marfat.com

ہر تبدیلی انسان کے طبعیاتی اور مادی نظام کی تبدیلیوں سے لازمی طور پہ منسلک ہے اس لئے عین ممکن ہے کہ انسانی جذبات و احساسات کو بھی مادی قدرات اور جواہر ہی کی ایک تبدیل شدہ صورت قرار دیا جا سکے۔

چونکہ اکثر افراد سائنس سے مرعوب ہیں اس لئے کچھ بعید نہیں کہ وہ اس نظریہ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ مذہب، اخلاق اور تصورِ آخرت سے منکر ہو جائیں گے۔ مادی فلسفہ کی قبولیت کا یہ نتیجہ ہے کہ دورِ حاضر میں اکثر لوگ مذہبی و اخلاقی اقدار کو ترک کرتے جا رہے ہیں۔

سوال نمبر ۲۱ :۔ علمی دلائل سے فلسفۂ مادیت کا ابطال کیجئے

جواب :۔ فلسفۂ مادیت انسانی ذہن و شعور کو مادی عمل میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ فلسفہ اس کی دلیل یہ دیتا ہے کہ جس طرح میکانکی قوت کو کیمیائی قوت میں تبدیل کرنا ممکن ہے اسی طرح کیمیائی اور میکانکی قوتوں کو حیاتی قوت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ یہ تصور ایک بنیادی غلطی پہ مبنی ہے۔ یہ تصور اپنی ابتداء مادہ سے کرتا ہے اور ذہن کو مادے کا ایک عمل قرار دیتا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ذہن کو پہلے ہی قدم پر تسلیم کر لیتا ہے۔ جب کوئی انسان مادے کی حقیقت کو تسلیم کرتا ہے تو یہ اس کا ایک ذہنی عمل ہے۔ یہاں تک کہ ذہن سے انکار بھی ایک ذہنی عمل ہے۔ اس طرح اس کے انکار ہی میں اس کا اقرار شامل ہے۔

یہ بات ہرگز تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ ذہن سے آزاد بھی ایک مادی دنیا موجود ہے۔ اس دنیا کا کوئی نہ کوئی تعلق ذہن سے ہونا لازمی ہے۔ ہم جس بات پر بھی غور کریں اور جیسے بھی کریں اس کا تعلق ذہن کے ساتھ ضرور ہوگا۔

فلسفۂ مادیت کا سب سے بڑا دعویٰ یہ ہے کہ یہ فلسفہ مابعد الطبعیاتی

Marfat.com

تصورات کو بھی مادی تصورات کے رنگ میں رنگ دیتا ہے۔ ایک عام آدمی جب اپنے گردوپیش پر نگاہ ڈالتا ہے تو اسے ہر طرف مادہ کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ مابعد الطبیعیاتی تصورات کو بھی مادی حقائق تسلیم کرنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر 'وجود'، 'کیفیت'، 'کمیت'، 'تعداد'، 'حالت'، 'یکسانیت'، وغیرہ مابعد الطبیعیاتی تصورات ہیں مگر فلسفۂ مادیت کا ماہر ان کو بھی مادی حقائق قرار دیتا ہے۔

مسئلہ زیر بحث پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ہمارا سارا علم، تجربہ اور وجدان کی پیداوار ہے۔ یہ تجربہ مشاہدہ کا حاصل نہیں البتہ مشاہدہ اس کا ایک لازمی جزو ہے۔ انسانی ذہن تجربات و مشاہدات میں وحدت پیدا کرتا ہے۔ پھر ان کو اسباب و علل کے رشتہ میں منسلک کرتا ہے۔ اگر ذہن پہلے ہی سے ان مشاہدات کے لئے قانونِ اسباب مہیا نہ کرتا تو ان سے علم کا حصول ممکن نہ ہوتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ قوانین تجربات سے پہلے کے ہیں اور انسان کا علم ان قوانین اور مشاہدات کے میل جول سے معرضِ وجود میں آتا ہے۔ مذکورہ صدر حقائق سے مادی فلسفہ کے اس دعویٰ کی تردید ہوتی ہے کہ انسانی ذہن سے کام لئے بغیر ہم اس کائنات کے مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔

سوال ۲۲: فلسفۂ مادیت کا یہ دعویٰ کہاں تک صحیح ہے کہ مادی قوانین عالمگیر ہیں؟ اس پر عالمانہ تنقید کیجئے۔

جواب: فلسفۂ مادیت کا یہ دعویٰ کہ طبیعیاتی یا مادی قوانین ہمہ گیر اور ہر چیز پر حاوی ہیں قابلِ تسلیم نہیں ہے۔ سائنس دان ابھی تک اس بات کو ثابت نہیں کر سکے کہ قوتِ حیات (حیاتی توانائی) طبیعیاتی یا کیمیائی توانائی کی تبدیل شدہ

Marfat.com

صورت ہے۔ مادۂ حیات اگرچہ ایک کیمیائی مرکب ہے مگر سائنسدانوں کے لئے یہ ممکن نہیں کہ مختلف عناصر کو یکجا کر کے ان میں حیات پیدا کر دیں۔ عناصر یکجا ہو کر بھی بے جان ہی رہیں گے۔ جن چیزوں میں نشو و نما کی قوت نہیں پائی جاتی۔ وہ افزائش نسل کی صلاحیت سے بھی خالی ہیں۔ اگر ایک چیز کسی وقت میں صرف کیمیائی خصوصیت رکھتی ہو اور کسی دوسرے وقت اس میں نشو و نما یا افزائش نسل کی خصوصیت پیدا ہو جائے تو یہ چند جدید عوامل کا نتیجہ ہو گا جو پہلے اس میں نہ تھے۔ اگر یہ عوامل اس میں پیدا نہ ہوتے تو وہ چیز جدید خصوصیت سے بہرہ ور نہ ہو سکتی تھی۔

اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ مادہ میں زندگی کے آثار پوشیدہ ہیں تو بھی حیات کا مادی ہونا لازم نہیں آتا۔ موٹی سی بات ہے کہ حیات اور غیر حیات دونوں باہم متضاد چیزیں ہیں لہٰذا ان دونوں پر ایک قانون کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا حیات کی سادہ سے سادہ صورت سے لے کر اس کی اعلیٰ و ترقی یافتہ صورتوں تک کسی میں بھی ہمیں میکانکی قوت کی کارفرمائی نظر نہیں آتی۔ بخلاف اس کے جاندار چیزوں میں مادی اسباب کے علاوہ ایک غیر محسوس سبب پایا جاتا ہے جو زندگی پیدا کرنے کا موجب ہے جسے ہم سبب نفسی (SELF CAUSATION) کہہ سکتے ہیں۔ جاندار چیزوں میں مادی اسباب کی بجائے ایک اندرونی حرکت پائی جاتی ہے۔ اسی حرکت کے باعث ان میں ذہانت اور شعور پیدا ہوتا ہے جو ترقی کی منزلیں طے کرتے کرتے اپنے انتہائی مقام تک پہنچ جاتا ہے۔

سوال ۲۳ :۔ زندگی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے بتائیے کہ کون سے امور اس کو مادہ سے ممتاز کرتے ہیں؟

Marfat.com

جواب :- زندگی کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں جو وحدت و تنظیم پائی جاتی ہے وہ مادہ میں مفقود ہے۔ یوں تو پتھر میں بھی یکساں قسم کے اجزا پائے جاتے ہیں۔ جن سے وہ ترکیب پاتا ہے مگر پتھر کی وحدت اور ایک ذی حیات چیز کی وحدت میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ پتھروں کے ڈھیر کو آپ جب الگ الگ کر دیں گے تو ہر پتھر جداگانہ وحدت کا حامل بن جائے گا۔ ایک پتھر کے الگ الگ ٹکڑے اپنی اپنی جگہ کامل وحدت ہیں۔ ان کو یکجا کر دیں تو یہ ایک بے ربط ڈھیر بن جاتا ہے۔

انسانی یا حیوانی زندگی کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ ایک انسان میں اجزا اس انداز سے ترتیب دیئے گئے ہیں کہ اگر ان کو الگ کر دیا جائے تو وہ اپنی افادیت کھو دیتے ہیں اور ان کی انفرادی وحدت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر انسان کے ہاتھ یا کسی عضو کو کاٹ دیا جائے تو اس کی عضوی حیثیت زائل ہو جاتی ہے۔ انسانی اعضاء کو بحیثیت مجموعی بدن کہتے ہیں اگر ان کو الگ الگ کر دیا جائے تو ان میں سے کسی عضو کو بدن نہیں کہہ سکتے۔ انسانی اعضاء کی اس وحدت کو عضوی وحدت (ORGANIC UNITY) کہتے ہیں۔ انسانی اعضاء اور بدن میں جزو اور کل کا تعلق پایا جاتا ہے۔ یہ تعلق کسی مادی قوت کی پیداوار نہیں بلکہ ایک اندرونی قوت پر مبنی ہے جسے حیات کہتے ہیں۔ انسانی بدن اور اسی طرح تمام ذی حیات اشیاء ایک بامقصد کل ہیں۔ ان کے تمام اجزا اپنے اپنے فرائض ادا کرتے ہیں۔ کوئی جزو دوسرے جزو کا کام انجام نہیں دے سکتا۔ گویا بدن بحیثیت کل اور اجزا بحیثیت جزو اپنے اپنے مقاصد کی تکمیل میں سرگرم ہیں۔ ظاہر ہے کہ مادہ میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی۔

زندگی کی تیسری اور سب سے اعلیٰ خصوصیت یہ ہے کہ انسانی شعور

Marfat.com

ترقی کی منزلیں طے کرتے کرتے خود شناسی کے مقام کو چھو جاتا ہے۔ خود شناسی ایک ایسا مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان خود ہی عالم ہوتا ہے۔ خود ہی معلوم اور خود ہی علم۔ یہاں پہنچ کر انسان سب امتیازات کو بھول جاتا ہے اور ایسی وحدت میں گم ہو جاتا ہے جس میں کل اور جزو کی کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔ اس مقام پر پہنچ کر مذہب انسان کی دستگیری کرتا ہے اور اس پر احکام ربانی کی صداقت منکشف ہونے لگتی ہے۔

زندگی کے یہ مظاہر اور خاص طور پر خود شناسی کا مقام ارفع مادی مظاہر سے اس قدر مختلف ہے کہ اسباب و علل کا مادی قانون ان کی تشریح سے قاصر رہتا ہے۔ یہ بات یوں بھی بعید از عقل ہے کہ خود شناسی ایسے اعلیٰ مظہر پر ایک ایسے قانون کا اطلاق کیا جائے جو ادنیٰ مظاہر کے لئے بنایا گیا ہے۔ اعلیٰ قانون سے اسفل مظاہر کی تشریح تو کر سکتے ہیں مگر اس کا عکس ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلسفۂ مادیت زندگی کے اعلیٰ مظاہر کی توضیح سے قاصر رہتا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں شعور اور ادراک کی حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

سوال ۲۴ :- کیا مادی فلسفے کا رد خود اسی کے مہیا کردہ دلائل سے ممکن ہے؟ تفصیلاً لکھئے۔

جواب :- اگر ہم مادی فلسفہ پر ایک اور طریقہ سے غور کریں تو خود اس کے نظریات ہی سے اس کا بطلان ثابت ہو جاتا ہے۔ طبعیاتی علوم کے مطالعہ سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ حرارت، روشنی، بجلی، مقناطیس وغیرہ ایک ہی مشترک توانائی کی تبدیل شدہ صورتیں ہیں جو خود بخود یا کسی دوسرے عمل کے ذریعہ ایک دوسرے میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ کیمیاوی مظاہر کا بھی یہی حال ہے اور تو

Marfat.com

اور زندگی جس مادۂ حیات پر مشتمل ہے وہ بھی چند کیمیائی عناصر کا مجموعہ ہے۔ سائنس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ارتقا کا عمل زندگی کے تمام مظاہر میں جاری ہے۔ ایک ادنیٰ جاندار اسی طرح زندگی سے بہرہ ور ہے جس طرح اشرف المخلوقات انسان۔ البتہ زندگی کی نوعیت میں فرق ہے۔

اگر اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ زندگی نباتات میں بھی پائی جاتی ہے بلکہ بعض نباتات اس قدر ترقی یافتہ ہیں کہ ان میں اور نچلے درجے کے حیوانات میں فرق کرنا دشوار ہے۔ اگر بعض خصوصیات کی بنا پر ہم حیوانات میں زندگی کے قائل ہیں تو ان ہی دلائل کی رُو سے نباتات کو کیوں نہ زندہ تسلیم کیا جائے۔ مزید غور و فکر سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ابتدائی نباتات میں چند چیزیں ایسی ہیں جن کو جمادات سے تمیز نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً مرجان میں نباتات کی طرح قوت نشو و نما موجود ہے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ جمادات بھی صفتِ حیات سے خالی نہیں۔ اگرچہ جمادات کی حیات اس درجہ ترقی یافتہ نہ ہو جیسے انسان کی زندگی۔

اس مقام پر پہنچ کر زندگی کی حقیقت آشکارا ہو گئی اور یہ واضح ہو گیا کہ کائنات عالم کے ہر ذرہ میں حیات پائی جاتی ہے نیز یہ کہ مادی اجسام میں حیات کو کہیں باہر سے نہیں لایا جاتا بلکہ وہ پہلے ہی ان کے اندر موجود ہے۔ یہ ثابت ہو جانے کے بعد مادی فلسفہ کے تمام دلائل و براہین از خود باطل ہو جاتے ہیں۔

Marfat.com

نفسیات اور مذہب

سوال ۲۵ :- یہ بات کس حد تک درست ہے کہ نفسیات کا علم مذہب کا ابطال کرتا ہے؟ نیز ولیم جیمس نے مذہب کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان پر تنقید کیجئے :

جواب :- نفسیات ایک جدید علم ہے جس نے پچھلی صدی میں حد درجہ ترقی کی ہے۔ نفسیات کے علماء نے مذہب کی مخالفت ضرور کی ہے مگر مذہب کا ابطال ثابت کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ البتہ نفسیات کے بعض نظریات سے مذہب کو نقصان پہنچا ہے۔ ان میں کرداریت (BEHAVIORISM) کا نظریہ بھی شامل ہے۔ یہ نظریہ مادی فلسفہ کی پیداوار ہے۔ یہ نظریہ انسانی اعمال و افعال کی تشریح کے لئے کافی نہیں اور اسے خود اپنی خامی کا اعتراف ہے نظریۂ کرداریت کے حاملین کے علاوہ جن ماہرین نفسیات نے مذہب کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔ ان میں ولیم جیمس، لیوبا اور فرائڈ کے اسماء قابل ذکر ہیں فرائڈ کے زیر اثر جو دیگر نفسیاتی مکتبہ ہائے فکر رونما ہوئے۔ انہوں نے بھی اپنے انداز میں مذہب کا ذکر کیا ہے۔ ولیم جیمس کو ان تینوں میں تقدم زمانی کا شرف حاصل ہے۔ اس نے ۱۹۰۲ء میں "مذہبی تجربات کی اقسام" کے عنوان سے اڈنبرا میں لیکچر دیئے جو بعد میں کتابی صورت میں شائع کئے گئے اس کتاب میں ایک جدید انداز سے مذہب کی نفسیاتی توضیح کی گئی ہے۔ یہ کتاب دراصل ان ماہرین نفسیات کی تردید میں لکھی گئی تھی جو سمجھتے تھے کہ مذہب ایک معمولی چیز ہے جس کی نہایت آسان نفسیاتی توجیہہ ممکن ہے جیمس نے

منکرین مذہب کو یہ بھی بتانا چاہا ہے کہ نظام ہائے مذہبی میں ان کی دانست سے کہیں زیادہ مواد موجود ہے۔ اس کتاب میں ولیم جیمس کا مقصد یہ ہے کہ مذہب کے لئے ایک بنیاد مہیا کی جائے۔ وہ مذہب کی اہمیت کو گھٹانا نہیں چاہتا تھا۔ البتہ اس کا انداز صرف مدافعانہ تھا۔ وہ مذہب کی اہمیت کے اثبات میں مثبت دلائل پیش نہ کر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب سے مذہب کو فائدہ کی بجائے نقصان پہنچا۔ ولیم جیمس کے خیالات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ مذہبی علماء کے اکثر وجدان ایک اعصابی مرض سے زیادہ نہیں ہوتے جو ذہنی ناہمواری کا نتیجہ ہوتا ہے تاہم اس بات کا امکان ہے کہ ایسے وجدانات سے ایک مثالی زندگی کا تصور حاصل کیا جا سکے۔

۲۔ مذہبی وجدان سے حقیقت کی معرفت حاصل ہوتی ہے لیکن یہ وجدان صرف صاحب وجدان ہی کے لئے مفید ہے۔ دوسروں کے لئے اس کا قابل قبول ہونا ضروری نہیں۔

۳۔ مذہبی حقائق کے لئے یہ ضروری نہیں کہ انہیں سائنٹفک اصولوں پر صحیح ثابت کیا جائے۔ سائنسی طریقہ سے جانچ پڑتال مذہبی حقائق کی صداقت کے لئے معیار نہیں ہے۔

ولیم جیمس کی مساعی سے مذہب کو بہت کم فائدہ پہنچا۔ وہ دلائل کی روشنی میں مذہب کی اہمیت و ضرورت ثابت نہ کر سکا۔ ان دنوں یہ نظریہ زوروں پر تھا کہ مذہبی عقائد چونکہ عقل کی ترازو میں پورے نہیں اترتے لہذا ان کو رد کر دینا چاہئے۔ جیمس نے اس نظریہ کا ابطال کرنا چاہا مگر اس نے یہ تسلیم کر لیا کہ مذہبی عقائد کا عقل کے معیار پر پورا اترنا ضروری نہیں البتہ ایسے عقائد کا انتخاب ضروری ہے جو ہمارے عمل کی اچھی طرح رہنمائی کر سکیں۔ اگرچہ وہ عقلی معیار پر پورے نہ اترتے

Marfat.com

ہوں۔ جیمس کے طرزِ استدلال میں سب سے بڑا نقص جو مذہب کے حق میں ضرر رساں ثابت ہو سکتا ہے یہ ہے کہ اس کے یہاں مذہبی وجدان کی صحت یا عدمِ صحت کا کوئی معیار نہیں۔ اس کے نزدیک وجدان ایک عام مظہر ہے جو تمام اقوام و ازمنہ میں قدرِ مشترک کے طور پر پایا جاتا رہا ہے۔ جیمس یہ بھی کہتا ہے کہ مذہب کی حقیقت وہ قدرِ مشترک نہیں ہے جسے تمام مذاہب میں تلاش کیا جائے بلکہ مذہب کی حقیقت تو صحیح معنوں میں اس اختلاف سے معلوم ہوتی ہے جو ایک مذہب اور دوسرے مذہب میں پایا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو مذہب ایک مبہم سا جذبہ بن کر رہ جائے گا۔

جیمس کے قول کے مطابق اسلام اور مسیحیت میں کچھ فرق باقی نہیں رہے گا۔ جس طرح انسانیت، وحشت و تہذیب کے درمیان قدرِ مشترک کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ دونوں کے اختلاف سے انسانیت کی حقیقت کا ظہور ہوتا ہے۔ اسی طرح مذہب کی حقیقت ان عوامل سے معلوم نہیں کی جا سکتی جو دنیا کے تمام مذاہب میں پائے جاتے ہیں بلکہ ان کے باہمی اختلافات سے مذہب کی حقیقت نکھر کر سامنے آتی ہے۔

ولیم جیمس کا قول ہے کہ نہ تو مذہبی وجدان کو نقل کر کے دوسروں تک پہنچایا جا سکتا ہے اور نہ ہی دوسروں کے لئے وہ کوئی حتمی و یقینی چیز ہے۔ جیمس کے نزدیک مذہبی لوگوں اور دیوانوں میں فرق و امتیاز دشوار ہے۔ اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ انبیائے عظام اور دیگر مذہبی اکابر (نعوذ باللہ) سب دیوانے تھے۔ جیمس کے قول سے دعوت و ارشاد کی بے وقعتی بھی واضح ہے۔ مذہبی وجدان سرے سے جب قابلِ نقل ہی نہیں اور نہ دوسروں کے لئے واجب الایقان ہے تو اس کو دوسروں تک پہنچانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جیمس کے قول کے مطابق مذہب ایک ہنگامی ضرورت کی چیز ہے اور اس کے قبول کرنے کا صرف ایک ہی اصول ہے۔ وہ اصول یہ ہے کہ اگر انسان مذہبی عقائد کو اپنے عمل کی

Marfat.com

رہنمائی کے لئے استعمال کر سکتا ہے تو اسے ان عقائد کو قبول کر لینا چاہیئے۔ گویا مذہب کی ضرورت ایک مشروط چیز ہے۔

جیمس کا یہ نظریہ کہ مذہبی رہنماؤں کے وجدان نفسیاتی مرض کا مظہر ہیں خود اس کے اپنے فلسفہ کی روشنی میں بھی غلط ثابت ہوتا ہے۔ تاریخ انسانیت اس امر کی زندہ گواہ ہے کہ انبیائے کرام اور بزرگان دین نہایت پاکیزہ سیرت اور نیک نہاد تھے۔ یہ قول ان پر بہتان عظیم ہے۔ ولیم جیمس مذہبی رہنماؤں اور دیوانوں میں فرق نہ کر سکا حالانکہ سائنٹیفک طریقہ سے بھی ان کے وجدانات کا فرق واضح ہو سکتا ہے۔

سوال نمبر ۲۶: لیوبا نے مذہب کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان پر تنقید کیجئے؟

جواب :- لیوبا نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ مذہب ایک نفسیاتی عمل ہے۔ بنا بریں خدا اور آخرت کا وجود اور دیگر مذہبی عقائد کسی طرح بھی حقیقی نہیں ہو سکتے۔ لیوبا کا قول ہے کہ جو نفسیاتی قوانین مذہبی مظاہر میں کار فرما ہیں۔ وہ ان مادی قوانین سے بالکل مختلف نہیں جن سے ہم مادی اجسام کی حرکت کا مطالعہ کرتے ہیں جس طرح ایک راکٹ کے مدار کا تعین ممکن ہے اور اس کی حرکت اور منزل مقصود کا پتہ چلایا جا سکتا ہے اسی طرح مذہبی وجدان اور اس کے آغاز و انجام کو بھی متعین کیا جا سکتا ہے مگر لیوبا کا یہ قول درست نہیں۔ ہم سب اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ طبعیاتی علوم میں جو پیشین گوئیاں ہم کر سکتے ہیں نفسیاتی مظاہر میں نہیں کر سکتے مثلاً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بکر چونکہ ایک خاص درجہ ذہانت کا حامل ہے اس لیے وہ امتحان میں وظیفہ حاصل کر لے گا۔ اگر یہ پیشین گوئی درست نکلتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ نفسیاتی قوانین صحیح ہیں ورنہ غلط۔ مگر یہ

Marfat.com

کہنا کہ مذہبی وجدانات کے بارے میں ہم کو نفسیاتی علم پر اتنا عبور حاصل ہو چکا ہے کہ ہم ان تمام عوامل سے آگاہ ہیں جو اس قسم کے مظاہر میں کارفرما ہیں عظیم جسارت ہے۔ لطف یہ ہے کہ خود علم نفسیات نے بھی ابھی تک یہ دعویٰ نہیں کیا۔

مابعد الطبیعیاتی امور کو تسلیم کرنے سے صرف اس لئے انکار کرنا کہ ہمیں نفسیاتی طور سے ان کی معرفت حاصل ہو گئی ہے، نہ اب ممکن ہے اور نہ قریب زمانہ میں اس کی امید کی جا سکتی ہے۔ مذہبی وجدانات کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی نفسیاتی قانون سے متصادم نہیں ہیں۔

لیوبا کے نظریات کی بنیاد دراصل مذہبی رہنماؤں کا یہ یقین ہے کہ مذہب وجدان پر مبنی ہے۔ بے شک یہ درست ہے کہ لوگوں کے وجدانات بڑی حد تک مذہب کی اساس ہیں مگر یہ مذہب کی ضرورت کی صرف ایک دلیل ہے۔ اس لئے کہ مذہب کی صداقت میں اور بھی بہت سے دلائل پیش کئے جا سکتے ہیں۔ کسی ایک دلیل کو منتخب کر لینا شیوۂ انصاف سے بعید ہے۔ عقلی شہادتیں، مذہبی وجدانات، نظم کائنات، انسان کی انفرادی اور اجتماعی ضروریات سب مل کر مذہب کی ضرورت و اہمیت کی تشکیل کرتی ہیں۔

سوال ۲۷:۔ سگمنڈ فرائڈ نے مذہب کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا ہے؟ اس کے نظریات پر تبصرہ کیجئے۔

جواب:۔ سگمنڈ فرائڈ مذہب کو صرف ایک نفسیاتی مسئلہ قرار دیتا ہے۔ اس نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "ایک التباس کا مستقبل" (THE FUTURE OF AN ILLUSION) میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مذہب ایک مغالطہ ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ مذہب کے

Marfat.com

ایک مغالطہ ہونے کا دعویٰ فرائڈ نے سادہ لوحی کی بنا پر نہیں کیا بلکہ وہ اس پر کامل یقین رکھتا اور مذہبی اصولوں کو کاذب سمجھتا تھا۔ اس کی کتاب کا نقطۂ آغاز یہ مفروضہ ہے کہ اگر مذہبی عقائد ایک مغالطہ ہیں تو پھر لوگ ان میں شدید ایمان کیوں رکھتے ہیں؟۔ فرائڈ کے نزدیک مذہبی عقائد لاشعوری اور غیر عقلی قوتوں کی پیداوار ہیں انسان نے آغاز تخلیق سے اپنے آپ کو فطری مظاہر کے درمیان محصور اور بے بس پایا۔ مذہبی عقائد نے انسان کو ایک مضبوط قلعہ کی طرح پناہ دی۔ پھر معاشرے کی ترقی ہوئی تو مذہبی عقائد نے معاشرتی احکام کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا۔ خدا کے تصور اور دیگر مذہبی عقائد نے انسان کو تسکین و اطمینان کی دولت سے مالا مال کیا۔ معاشرتی احکام کے تحفظ کے لئے انفرادی قربانیوں کو ایک مذہبی فعل تصور کیا جانے لگا۔

فرائڈ کے قول کے مطابق مذہبی عقائد کو اس لئے قبولِ عام حاصل ہوا کہ انہوں نے انسان کی ایک وقتی ضرورت پوری کی تھی، اس لئے نہیں کہ وہ حق و صداقت پر مبنی تھے۔ مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح درست نہیں کہ مذہبی عقائد بالکل غلط تھے۔ فرائڈ نے التباس یا مغالطہ کا لفظ ہر ایسے اعتقاد کے لئے استعمال کیا ہے جو انسان کی پوشیدہ خواہشات کی پیداوار ہو مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ عقیدہ غلط ہو۔ فرض کیجئے ایک شخص خدا کا منکر ہے تو اس کا انکار اسی قسم کا ایک التباس ہے جیسے اس کا اقرار۔ فرائڈ نے جو نفسیاتی اصول پیش کئے ہیں وہ مذہبی عقائد کو جھٹلا نہیں سکتے۔ غالباً فرائڈ نے مذہبی اصولوں کو اس لئے غلط سمجھا کہ ان کو عقلی طور پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ فرائڈ کی یہ منطق کسی طرح قابل قبول نہیں کہ مذہبی عقائد چونکہ انسانی خواہشات کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوئے ہیں اس لئے غلط ہیں، اس لئے کہ خواہش صحیح چیز کی بھی کی جا سکتی ہے اور غلط کی بھی۔ ایک شخص دنیوی زندگی کو آخری قرار دیتا ہے اور

Marfat.com

دوسرا اخروی زندگی کا طالب ہے۔ حقیقت کا فیصلہ انسان کی چاہت اور طلب سے نہیں بلکہ خود حقائق کے پیش نظر کیا جائے گا۔

عقائد کی اہمیت کو گھٹانے کے سلسلہ میں یہ بات پورے یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ فرائڈ اگرچہ مذہبی عقائد کا ابطال نہ کر سکا تاہم اس نے مذہبی عقائد کی اہمیت کو گھٹانے کے سلسلہ میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ فرائڈ کے متبعین نے اس بات کو ثابت کر لینے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ مذہب لاشعوری خواہشات پر مبنی ہے مثلاً تحلیل نفسی کا ایک ماہر یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ اس لئے خدا پر ایمان لاتے ہیں کہ آپ بچپن میں والد کے محتاج تھے اور یہ احساس احتیاج آپ میں ابھی تک موجود ہے۔ آپ نے یہ احساس اپنے باپ سے خدائی باپ کی طرف منتقل کر دیا اور اس طرح خدا پر ایمان لے آئے۔ اس دلیل میں اگرچہ کوئی منطقی ربط نہیں پایا جاتا۔ تاہم نفسیات کی بنا پر بعض غیر معقول باتوں کو بھی تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ فرائڈ کے نظریات اگرچہ مذہبی عقائد کی صداقت کو جھٹلا نہ سکے مگر اس نے منکرین مذہب کو دلائل کے اسلحہ سے مسلح کر دیا اور وہ مذہب کے خلاف صف آرا ہو گئے۔

Marfat.com

مذہب اور ضابطۂ اخلاق

سوال ۲۸ :۔ مذہب اور اخلاق کے ربط و تعلق کی تفصیلات بیان کیجئے۔

جواب :۔ دنیا میں مظاہر پرستی کا دور ہے۔ ہر شخص اسی چیز کو اپنے لئے پسند کرتا ہے جو ظاہری طور پر پرکشش اور دلفریب ہو۔ اگرچہ اس کا باطن کتنا ہی معیوب کیوں نہ ہو۔ یہی حال مذہب کا بھی ہے۔ اکثر لوگ مذہبی تعلیمات میں بیان کردہ اخلاق سے متاثر ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں مذہب کا حاصل اخلاق کے سوا کچھ نہیں۔ اگر اخلاقیات کے باب کو الگ کر لیا جائے تو کتاب مذہب میں کوئی دلربائی و رعنائی باقی نہیں رہتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اخلاق کے فوائد و مصالح نمایاں اور محسوس ہوتے ہیں۔ یہ لوگ مذہب کے دوسرے نشاط بخش پہلوؤں سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ ان کی مثال یوں ہے جیسے اکثر لوگ آفتاب درخشاں کی تابانی و درخشانی میں گم ہو کر اس بات پر غور کرنے کی مطلقاً ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ آفتاب کی حقیقت کیا ہے؟ وہ کیونکر عالم وجود میں آیا اور اس کا صانع و خالق کون ہے؟

جو لوگ اخلاقیات کے سوا دیگر مذہبی تعلیمات سے متنفر ہوتے ہیں وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں کہ اخلاق کا منبع مذہب نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ جو لوگ مذہبی عقائد کو کچھ زیادہ خطرناک نہیں سمجھتے مگر مذہبی تعلیمات کے ذوق سے آشنا بھی نہیں ہوتے وہ اخلاقیات ہی کو اپنا منتہائے مقصود سمجھتے ہیں۔ چونکہ ہر مذہب میں کسی حد تک اخلاقی تعلیمات موجود ہوتی ہیں۔

Marfat.com

اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ ہر مذہب لائق اتباع اور اس کی پیروی موجب نجات ہے ۔ یہ دونوں فریق غلط کار ہیں۔ نہ اخلاق کی اشاعت مذہب کے بغیر ممکن ہے اور نہ مذہب صرف اخلاقیات ہی محدود ہے بلکہ مذہب میں اخلاق کے سوا اور بھی بہت کچھ ہے ۔

انسان طبعاً حریص واقع ہوا ہے۔ جب وہ کوئی کام کرنے لگتا ہے۔ تو پہلے یہ سوچتا ہے کہ اسے کیا فائدہ حاصل ہو گا۔ وہ برائی سے اسی صورت میں باز رہتا ہے جب سزا کا خوف دامنگیر ہو۔ اگر طالب علم کو یہ بات معلوم نہ ہو کہ علم بیش بہا فوائد کا موجب ہے تو وہ رات کی میٹھی نیند سے کبھی محروم نہ رہے۔ کسان موسم گرما کی چلچلاتی دھوپ میں ہل چلانے میں مصروف ہوتا ہے اور ٹھنڈی ہوا اور سایہ سے لطف اندوز نہیں ہوتا۔ وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہے کہ اگر ٹھنڈے سایہ سے بہرہ اندوز ہوتا رہا تو سال بھر فاقہ کشی سے دوچار ہونا پڑے گا۔

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنے فائدہ کے لئے دوسروں کو نقصان پہنچانے سے بھی نہیں چوکتا۔ خوشحال ہونے کی صورت میں وہ مہنگے داموں چیزیں خرید کر اپنے مصرف میں لاتا ہے۔ چیزیں ارزاں خرید کر ذخیرہ اندوزی کرتا ہے اور دوسروں کی تکلیف کو خاطر میں نہیں لاتا۔ ظلم و ستم، دوسروں کی حق تلفی، جانداروں پر زیادتی کرنا اور لوٹ کھسوٹ، یہ برائیاں ہر جگہ عام ہیں ظاہر ہے کہ ملکی قوانین ان برائیوں کو ختم نہیں کر سکتے بلکہ اس سے بڑھ کر کسی چیز کی ضرورت ہے جو انسان کو نیکیوں پر آمادہ کرے اور برائیوں سے روکے اگر قانون کی افادیت کو تسلیم کر لیا جائے تو بھی وہ لوگ جو دائرہ قانون میں داخل نہیں یا اقتدار کی باگ ڈور پر قابض ہیں قانون کے پابند نہیں ہوں گے ۔ بنا بریں امن عالم کو قائم رکھنے، لوگوں کو قانون کا پابند کرنے اور مظالم

Marfat.com

کے افراد کا صرف ایک مؤثر ترین ذریعہ ہے۔ اس سے مذہب اور اخلاق کا ربط و تعلق بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔

سوال ۲۹ :۔ حامِلین تہذیب جدید کا دعویٰ ہے کہ "اخلاق حسنہ کی تکمیل مذہب کے بغیر ممکن ہے لہٰذا مذہب کی کوئی ضرورت نہیں"۔ اس پر تبصرہ کیجئے؟

جواب :۔ اپنے آپ کو مہذب قرار دینے والوں کے تہذیب جدید کے بارے میں یہ دعاوی "طبل بلند بانگ در باطن ہیچ" کے مصداق ہیں۔

تہذیب جدید کے علم برداروں نے کمزور اقوام پر جو مظالم ڈھائے ہیں اور جس طرح انہیں صفحۂ ہستی سے مٹانے کی سعی لاحاصل کی ہے وہ انسانیت کے نام پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ اس کی روشن مثال ہندوستان میں انگریزوں کا عہد اقتدار ہے۔ انگریز نے اپنے عہد سلطنت میں ہندوستانیوں کی تذلیل میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور ایسے ہتھکنڈے جاری رکھے جن سے اہل ہند کے دور غلامی کو طویل سے طویل تر بنایا جا سکے۔ تہذیب کے دعویداروں نے محکوم اقوام کو جس طرح اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنایا اور انسانوں کو حیوانوں سے بھی کم تر درجہ تک پہنچا دیا وہ مہذب قوموں کے اخلاق کی ایک زندہ مثال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مہذب اقوام کا حسن سلوک ہمیشہ انہی اقوام تک محدود رہا جو قوت و شوکت میں ان کی ہم پلہ تھیں۔ اپنے آپ کو مہذب کہنے والے کمزور اقوام سے بہیمانہ سلوک روا رکھتے رہے ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ مذہب نے آغاز کار سے انسانی اخلاق پر جو انمٹ نقوش ثبت کئے تھے، وہ صدیوں میں بھی زائل نہیں ہو سکتے چہ جائیکہ چند نسلوں کی مادی

تعلیم اس کو بالکل فنا کر دیتے۔ مذہب نے انسانی قلوب و اذہان پر یہ پائیدار اثر چھوڑا ہے کہ برائی رُوح کو تاریک کر دیتی ہے۔ مذہب ہی کے زیرِ اثر سب عاقل و جہلاء اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ قانون سازِ حقیقی ذاتِ باری تعالیٰ ہے جو اس کائناتِ ارضی کے چپہ چپہ پر حکمران ہے۔ مذہب ہی کی برکت سے یہ خیال اب تک تمام دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔

مذہب کے بغیر اخلاقی ترقی کے امکانات اس وقت روشن ہوں گے جب خدا سے انکار اور الحاد و دہریت کی عمر بھی اتنی ہی طویل ہو جتنی مذہب کی۔ حالانکہ مذہب کی عمر بہت طویل ہے اور اس کے اثرات بڑے دیرپا ہیں۔ ان کے مقابلہ میں لادینیت کا ظہور بہت بعد میں ہوا۔ اگر خدانخواستہ کبھی الحاد کا ایسا دور آئے کہ سب لوگ منکرِ خدا ہو جائیں تو وہ تاریخِ انسانی کا منحوس ترین دور ہو گا۔ اس وقت نہ حکومت قیامِ امن کی مساعی میں کامیاب ہو گی۔ نہ قانون کا خوف لوگوں کو راہِ راست پر لا سکے گا۔ مگر خدا کے فضل و کرم سے انسانیت ایسا دن کبھی نہیں دیکھے گی اور مذہب کی مخالفت کرنے والے اپنے مقاصدِ مذمومہ میں ہرگز کامیاب نہ ہوں گے۔ اس لئے کہ مذہب انسانی فطرت میں داخل ہے۔ "وَلَنْ تَجِدَ لِفِطْرَةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا"

منکرینِ مذہب ہزار کوشش کریں وہ مذہب کو نیست و نابود نہیں کر سکتے در اصل بات یہ ہے کہ مذہب کا جذبہ انسان کی جبلت میں داخل اور اس کے رگ و پے میں سمایا ہوا ہے اور اسے ذہن و قلب سے نکال باہر کرنا انسان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو منکرِ مذہب کہتے ہیں وہ بھی کسی نہ کسی چیز کو معبود کا درجہ دے کر غیر شعوری طور پر مذہبی آدمی بن جاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ اپنا مذہبی آدمی ہونا تسلیم نہ کریں۔

Marfat.com

رومتہ الکبریٰ والوں نے ملک کو دیوتا تسلیم کر لیا۔ ڈاکٹر رل نے انسانی زندگی کو معبود کا درجہ دے دیا۔ دراصل مذہب اور اخلاق کا تصور انسانی فطرت میں اتنا گہرا ہے کہ اس تصور سے رہائی ممکن نہیں۔

سوال نمبر ۳۰:- ڈاکٹر رل کا قول ہے کہ "خدا کو ماننے کے بجائے اگر انسانی زندگی کو معبود تسلیم کر لیا جائے تو بھی اخلاقی اقدار کو زندہ رکھا جا سکتا ہے"۔ اس پر تنقید کیجئے۔

جواب:- ڈاکٹر رل سے پہلے رومتہ الکبریٰ والوں نے بھی اسی نظریہ کا اظہار کیا تھا مگر عملی طور پر وہ اپنے فلسفہ ذہن سے مذہب کے اثرات کو مٹا نہ سکے۔ ڈاکٹر رل کا یہ استدلال کہ نوع انسانی کی عمر چونکہ طویل اور بے انتہا ہے اس لئے عمر کو خدا مان لینا چاہیئے، بڑا مضحکہ خیز ہے۔ بھلا طوالت عمر کا خدا ہونے سے کیا تعلق؟ یہ تو اسی طرح ہوا جیسے کہا جائے چونکہ خدا کو ماننے کا عقیدہ انسان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکا ہے اور وہ خدا کو تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہے لہٰذا اصلی اور حقیقی خدا کی بجائے مصنوعی خدا کیوں نہ گھڑ لیا جائے۔ یہ کتنی لغو بات ہے۔ خالق حقیقی کے ہوتے ہوئے من گھڑت خداؤں کو اختراع کرنا کس قدر بعید از قیاس ہے۔ پھر یہ بات بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ جب قیام قیامت اور جزا و سزا کے عقیدہ سے صرف نظر کر کے عمر انسانی کو معبود تسلیم کیا جانے لگا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ زندگی کو عیش و لذت کی نذر کر دیا جائے۔ جب تک دنیا کی حیات ناپائیدار کے علی الرغم ایک بلند پایہ اور ابدی زندگی کا تصور پیش نظر نہ ہو نہ نیکی کرنے کی رغبت پیدا ہوتی ہے اور نہ برائیوں سے اجتناب کا جذبہ پیدا ہوتا ہے

Marfat.com

ڈاکٹر رِل نے اخلاق حسنہ پیدا کرنے کے لئے مذہب سے قطعِ نظر ایک تجویز یہ پیش کی ہے کہ اپنے آباؤ اجداد اور بزرگوں کی روحوں کو حاضر جان کر ان کی خوشنودی حاصل کی جائے۔ اس طرح خدا کو تسلیم کئے بغیر اخلاقِ حسنہ کی تحریک کے لئے ایک زبردست محرک ہمارے سامنے ہوگا۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ڈاکٹر رِل اخلاق کی تحریک کے لئے کوئی محسوس محرک پیدا کرنا چاہتے ہیں مگر جہاں اگر غور سے دیکھا جائے تو بھروسہ اسی غیر محسوس طاقت پر ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ محرک خدا کی بجائے بزرگوں کی روحیں ہوں۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ ایک طرف تو فلسفہ یہ کہتا ہے کہ روح کوئی چیز نہیں اور مرنے کے بعد جسمانی اجزا اپنے اپنے عناصر میں مل جاتے ہیں اور غبار بن کر اڑ جاتے ہیں۔ اور دوسری جانب ڈاکٹر رِل ارواح کی رضا جوئی کو اخلاقِ حسنہ کیلئے محرک قرار دیتے ہیں۔ اس تضاد بیانی میں جمع و تطبیق کی کیا صورت ہوگی؟

خلاصہ یہ کہ فطرتِ انسانی میں داخل ہونے کی بنا پر مذہب کی اصلاح و ترقی جس طرح فرض عین ہے اسی طرح محرکِ اخلاقِ حسنہ ہونے کے لحاظ سے مذہب کی نشر و اشاعت اخلاقی فریضہ ہے۔

سوال ۱۱ :۔ بعض لوگوں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ چونکہ اخلاقی تعلیم سب مذاہب میں موجود ہے اس لئے سب مذہب درجہ کے اعتبار سے مساوی ہیں اور سب ہی باعثِ نجات ہیں۔ اس کے موافق یا مخالف آپ جو رائے رکھتے ہوں اسے دلائل سے ثابت کیجئے؟

جواب :۔ کسی مذہب کی اہمیت صرف اسی بات سے واضح نہیں ہوتی

کہ اس نے اخلاقیات کے بارے میں کیا تعلیم دی ہے۔ بخلاف ازیں کسی مذہب کا اصل معیار وہ تصور ہے جو اس نے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور دیگر بنیادی مسائل کے بارے میں پیش کیا ہو۔ جو لوگ صرف اس لئے تمام مذاہب کو باعث نجات سمجھتے ہیں کہ سب میں اخلاقی تعلیم موجود ہے وہ لوگ مذہب کی اہمیت سے آگاہ ہونے کے باوجود مذہب کی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ آغاز آفرینش سے لے کر اب تک مذہب کی تمام شکلوں میں ہستی باری تعالیٰ کا یقین اور اس کا قرب حاصل کرنے کو زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد قرار دیا جاتا ہے۔ جب مذہب کا حاصل قرب خداوندی کا حصول ہے تو ماننا پڑے گا کہ اخلاق حسنہ مثلاً رحم و کرم، عدل و انصاف، شرافت و شجاعت وغیرہ مذہب سے بیگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ جس طرح بہادرانہ کارنامے انجام دینے سے آدمی تجارت کا ماہر نہیں بن سکتا اور تجارتی امور میں مہارت حاصل کر کے وہ اعلیٰ درجہ کا معمار نہیں بن سکتا۔ اسی طرح محض اخلاق حسنہ سے موصوف ہو کر کوئی شخص معرفتِ الٰہی کا ذوق آشنا نہیں ہو سکتا۔

جو لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ محض اخلاق کی مدد سے خدا کی معرفت حاصل کر لیں گے وہ گویا جو بو کر گندم کاٹنے کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ جب دنیا میں علت و معلول کا سلسلہ قائم ہے اور ہر مقصد کے حصول کے لئے اس کے مناسب اسباب پیدا کئے جاتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ معرفتِ ربانی حاصل کرنے کے لئے مذہب کی پناہ نہ لی جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ محض اخلاق میں مذہب کا سراغ لگانا چاہتے ہیں وہ اندرونی طور پر مذہب کے منکر ہیں مگر برملا اس کے اظہار کی قدرت سے محروم ہیں۔ مذہب دشمنی میں یہ لوگ منکرین مذہب سے کسی طرح کم نہیں

اور اگر ان کا بس چلے تو مذہب کی بیخ کنی کر دیں۔

خدا کی معرفت حاصل کرنے کے بعد انسان میں یہ داعیہ ابھرتا ہے کہ اس کے ساتھ تعلق قائم کیا جائے۔ تعلق باللہ کے قیام کا ایک ذریعہ تو یہ ہے کہ شرعی طریق پر اس کی عبادت کی جائے۔ دوسرا طریق یہ ہے کہ خداوندی اوصاف مثلاً رحم و کرم، لطف و مروّت، عدل و احسان وغیرہ اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ انسان اپنی استطاعت کی حد تک ان اوصاف کو حاصل کرے اور مخلوقِ خدا کے ساتھ وہی سلوک روا رکھے جو اپنے ذہن میں خدا کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق سے تعلق باللہ کے قیام میں کس حد تک مدد ملتی ہے یوں تو جملہ مذاہب میں اخلاقی تعلیمات کی بھرمار ہے مگر اسلام نے اخلاقیات کو جزوِ دین قرار دیا ہے۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ اخلاق و عبادت سے اسی قدر تعلق باللہ پیدا ہوگا جس درجہ کی معرفتِ خداوندی قبل ازیں حاصل ہو چکی ہے مثلاً اگر کوئی شخص خدا کو مجسّم سمجھ کر اس کی عبادت کرتا ہو اور عبادت کرنے سے اس کے دل پر یہ عقیدہ ثبت ہو جائے کہ وہ جسم نہیں رکھتا اس سے واضح ہوتا ہے کہ اخلاق تعلق باللہ کے قیام میں اگرچہ مفید ہیں تاہم مذہب کا دار و مدار معرفتِ خداوندی ہی پر ہے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ معرفتِ خداوندی حاصل کئے بغیر صرف اخلاق کی مدد سے کوئی شخص عارفِ کامل بن جائے اور فقط حسنِ معاشرت کے بل بوتے پر اسے خدا تک رسائی حاصل ہو جائے۔

Marfat.com

مذہب ایک انسانی ضرورت ہے

سوال ۳۲ :۔ دلائل و براہین کی روشنی میں ثابت کیجئے کہ مذہب ایک فطری ضرورت ہے؟

جواب :۔ انسان کی انتہائی خواہش یہ ہے کہ وہ سکون و اطمینان کی دولت سے مالا مال ہو اور اس میں قلق و اضطراب کا کوئی شائبہ موجود نہ ہو۔ نظامِ تسکینِ کامل کے حصول کا ذریعہ انسانی جذبات کی تسکین ہے۔ انسانی جذبات کی دو قسمیں ہیں :۔

۱۔ وہ جذبات جن کی فوری تسکین مطلوب ہے۔ مثلاً بھوک، پیاس وغیرہ۔

۲۔ وہ جذبات جن کی دائمی تسکین ضروری ہے۔

مذہب کا تعلق دوسری قسم کے جذبات کے ساتھ ہے۔ مذہب انسان کیلئے ایک ایسا نظامِ زندگی مہیا کرتا ہے جس سے جذبات کی انفرادی تسکین کی بجائے اسے کلی طمانیت حاصل ہوتی ہے۔ مذہب انسانی جذبات کو ختم نہیں کرتا۔ بلکہ ان کی موزوں اور مناسب تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔ مذہب انسانی زندگی کی تمام اقدار پر حاوی ہے۔ مذہب زندگی کے تمام اعمال و افعال اور شعبوں میں ایک نظم پیدا کرتا ہے۔ انسانی زندگی ایک کل ہے اور اپنے مختلف شعبوں کے لئے ایک ہی قسم کے اصول کی متقاضی ہے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو انسانی زندگی کا توازن باقی نہ رہے۔ حیاتِ انسانی میں نظم اور توازن پیدا کرنے کے لئے مذہب دو کام کرتا ہے :۔

۱۔ مذہب زندگی کا ایک خاص نصب العین مقرر کرتا ہے جس سے ذہنی

Marfat.com

انتشار وجمود ہو کر انسان کے افکار و نظریات میں ایک نظم و ربط پیدا ہو جاتا ہے
۴۔ مذہب انسانی زندگی کے تمام شعبوں کے لئے تفصیلی ہدایات دیتا ہے جن کی روشنی میں انسان اپنی زندگی کے لئے قوانین وضع کر سکتا ہے۔

جذباتِ انسانی کی تسکین کامل کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ انسان اپنے جذبات کی تسکین میں ایک حیوان سے قطعی مختلف ہے۔ حیوان کی زندگی میں جو جذبات ابھرتے ہیں مثلاً بھوک، پیاس، نیند یا جنسی خواہش۔ وہ ان کی فوری تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اس کی زندگی کا ہر جذبہ ایک مستقل اکائی ہے، جس کا دوسرے جذبات کے ساتھ کچھ تعلق نہیں بخلاف ازیں انسان اپنے بعض جذبات کو اس لئے نظر انداز کر دیتا ہے کہ ان کی تسکین اس کی کلی زندگی میں بحیثیت مجموعی مضر ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ انسان کے پیش نظر اس کی ذاتی تسکین ہی نہیں بلکہ خاندانی طمانیت بھی مدّنظر ہے۔ ہر ایسا عمل جو اس کے خاندان کو فائدہ پہنچاتا ہے اس کے لئے باعث تسکین ہے اور جس سے اس کے خاندان کو فائدہ نہ پہنچتا ہو وہ اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہے۔ انسان کا یہ تصور خاندان کی حدود سے آگے بڑھ کر قوم، معاشرہ، دنیا اور پھر تمام کائنات تک پہنچ جاتا ہے۔ انسان کی زندگی میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب اس کی ذاتی کی تسکین ایک ماورائی تسکین میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ زاویۂ نگاہ انسان کو ایک ایسی ماورائی حقیقت سے ہمکنار کرتا ہے جس کو خدا کہتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر بندے کے سب کام رضائے الٰہی کے تابع ہو جاتے ہیں۔ انسان ذاتی جہد وسعی سے اس مقام کو حاصل کر سکتا ہے۔ مذہب ایسی ہمہ گیر تسکین کے حصول کے لئے رہنمائی کرتا اور سہولت بہم پہنچاتا ہے۔ مذہب کے دامن میں پناہ لئے بغیر یہ سکون و اطمینان ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا

Marfat.com

مادی وسائل کی فراوانی انسان کو فرعون و قارون تو بنا سکتی ہے مگر روحانی اطمینان کی دولت سے مالا مال کرنا اس کے بس کا روگ نہیں ہے ۔

صحیح اور غلط مذہب میں تمیز

سوال نمبر ۳۳: ۔۔ ماننے اور جاننے میں کیا فرق ہے؟ اس فرق کے پیشِ نظر اسلام کی صداقت واضح کیجئے۔

جواب: ۔۔ ماننے کا مطلب یہ ہے کہ جو بات انسان کی نگاہ میں صحیح ہو دل وجان سے اس کو تسلیم کر لیا جائے۔ مذہبی اصطلاح میں اسی کو ایمان کہتے ہیں۔ جاننے سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز کی گہرائی میں اتر کر اس کی حقیقت و ماہیت کا کھوج لگانے کی کوشش کی جائے۔ سچے مذہب کی نشانی یہ ہوتی ہے کہ انسانی فطرت میں اس مذہب کی تعلیمات کو ماننے اور ان پر ایمان لانے کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ تعلیمات فطرتِ انسانی کے مطابق اور اس سے ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انبیائے کرام ہمیشہ لوگوں کو دعوتِ ایمان دیتے رہے مگر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ انہیں ایمان کی بجائے ان باتوں کا کھوج لگانے اور ان کی تہہ تک پہنچنے کیلئے کہا جا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ان حقائق کے منکر ہو گئے۔

اصل بات یہ ہے کہ جاننے اور ماننے میں بڑا فرق ہے۔ ہر دور میں انبیاء کی مخالفت اس لئے نہیں کی جاتی تھی کہ وہ لوگ ان کے بیان کردہ حقائق کو مان نہیں سکتے تھے بلکہ اس لئے کہ وہ ان کو جاننے یعنی ان کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر تھے۔ آجکل مذہب کے غیبی حقائق مثلاً جنت، دوزخ، فرشتے اور عذابِ قبر کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا جا رہا ہے، اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ مذہب نے ان امور کو ماننے اور ایمان

لانے کا حکم دیا تھا مگر لوگ ان کو جاننے پر مصر ہیں اور جب جاننے کی قدرت اپنے میں نہیں پاتے تو ان سے انکار کر دیتے ہیں۔

دیگر مذاہب سے قطع نظر، اسلام کا ایک ایک مسئلہ حق و صداقت کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ علمائے اسلام نے اسلامی افکار و عقائد کو میزانِ عقل میں تولنے کے لئے ایک خاص علم وضع کیا ہے جس کا نام ہے "علم الکلام"۔ علم الکلام میں اسلام کے ہر اصول مسئلہ کے بارے میں ثابت کیا جاتا ہے کہ وہ انسانی عقل و فطرت سے کامل طور پر ہم آہنگ ہے۔ علم الکلام کے مطالعہ سے مندرجہ ذیل امور نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

۱۔ دین اسلام کے افکار و آراء ان سوالات کا صحیح جواب ہیں جو فطرتِ انسانی میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

۲۔ علم الکلام کے مطالعہ سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ فطرتِ انسانی میں پیدا ہونے والے سوالات کا جواب حواس و عقل سے دینا ممکن نہیں اور ان کا تسلی بخش حل تلاش کرنے کیلئے حواس کے علاوہ ایک اور ذریعہ کی ضرورت ہے جسے مذہبی اصطلاح میں "وحی" کہتے ہیں۔

۳۔ وحی اور نبوت کے ذریعہ جو علم ہمیں حاصل ہوتا ہے وہ عقل و فطرت کے بالکل مطابق ہوتا ہے۔ ہم ان سوالات کے جوابات کو مان تو سکتے ہیں مگر جان نہیں سکتے۔ کسی مذہب کے متعلق اطمینان حاصل کرنے کے لئے یہی روش قرین عقل و قیاس ہے۔

سوال ۳۴: معرفت کیا چیز ہے؟ دلائل کی روشنی میں واضح کیجئے

جواب: صوفیا کا قول ہے کہ جو لوگ اسلامی عقائد و افکار

Marfat.com

کو مان لینے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ان کی حقیقت بھی معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو وحی و نبوت کی معلومات کا مشاہدہ بھی کرایا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حواسِ خمسہ اور عقل کے علاوہ ہر انسان میں کچھ علمی قوتیں بھی پوشیدہ ہیں۔ قرآنِ حکیم نے وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي میں اسی جانب اشارہ کیا ہے۔ انبیائے کرام کی کامل اطاعت سے یہ خوابیدہ صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ یہ مقام حاصل ہونے سے قبل انسان اسلامی عقائد و افکار کو صرف ماننا ہوتا ہے۔ اس کے بعد ان کو پہچاننے لگتا ہے۔ جو شخص اس سعادت سے بہرہ ور ہو جاتا ہے۔ اسے مذہبی حقائق کی معرفت و شناخت حاصل ہونے لگتی ہے۔ اسی علم کو "معرفت" کہتے ہیں۔ معرفت کے معنی ہیں پہچاننا۔ شناخت و پہچان کا تعلق ان ہی امور سے ہو سکتا ہے جن کا علم پہلے حاصل ہو۔ پھر اس میں مزید ترقی ہو کر ان کی حقیقت تک رسائی حاصل ہو جائے۔ مولانا روم رحؒ اسی حقیقت کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

صد کتاب و صد ورق در نار کُن ۔۔۔ جانِ خود را جانبِ دلدار کُن!
صیقلے کن یک دو روزے سینہ را ۔۔۔ دفترے خود ساز آں آئینہ را

قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوتا ہے۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ (جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں انہیں ہم اپنی راہیں دکھاتے ہیں)

خلاصہ یہ ہے کہ انبیاء کی اطاعت سے آدمی اپنی آنکھوں سے غیبی حقائق کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔ اور مقامِ قال سے گذر کر مقامِ حال پر فائز ہوتا ہے مگر یہ مقامِ بلند اہلِ دل اور اربابِ ایمان کی صحبت و رفاقت سے حاصل ہوتا ہے۔

Marfat.com

اب یہ مسئلہ باقی رہا کہ معرفت اور علم الکلام میں کیا فرق ہے؟ یہ امر پیش نظر رہے کہ اسلامی اصول و عقائد کو علم و عقل کے طریقہ سے ثابت کرنے کا نام علم الکلام ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ سچے اور جھوٹے مذہب میں فرق و امتیاز کا ایک طریقہ تو معرفت (پہچان) ہے جو مجاہدہ اور ریاضت سے حاصل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص اس کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مذہبی حقائق کو علم و عقل اور فطری تقاضوں کی روشنی میں جانچا پرکھا جائے یہ راستہ بھی خاصا کٹھن ہے۔ مذہب کے ایک ایک مسئلہ کو لے کر اسے فطرتِ انسانی پر پیش کرنا اور پھر اس پر بحث و تمحیص کرنا کارے دارد والی بات ہے اور ہر شخص اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ بعض اہل تحقیق نے فرداً فرداً ان دونوں راستوں کو اختیار کرنے کی بجائے ان کے اختلاط سے ایک معجونِ مرکب تیار کیا۔ انہوں نے معرفت اور کلام دونوں کو یکجا کر کے یہ ثابت کیا کہ اسلامی عقائد و اصول عقل انسانی سے ہم آہنگ ہیں۔ پھر اپنے آپ کو سالارِ انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے سیرت و سوانح اور اخلاق و آداب کے سانچہ میں ڈھالا۔ یہ لوگ اپنے عمل و اخلاق اور عقل و علم سے لوگوں کو متاثر کرتے تھے۔ تبلیغِ اسلام کا یہ طریق بہت مقبول ہوا۔ اس میں نہ تو معرفت و ریاضت کی کٹھن منزلیں ہیں اور نہ ہی علم الکلام کی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اشاعتِ اسلام کا یہ طریقہ بے حد موثر ہے۔ اس لئے کہ اس میں عقلی اطمینان کے بہلو بہ پہلو دل کی دنیا بھی شاد و آباد ہو جاتی ہے۔ اولیاء و صلحاء ہمیشہ اسی راہ پر گامزن رہے ہیں۔

جو لوگ اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ مذہب کی بنیاد روایت پرستی اور خوش اعتقادی پر رکھی گئی ہے۔ علم الکلام کے مطالعہ سے ان کی غلط فہمی

ہوتی ہے۔ اس علم کے مطالعہ سے عقل و دانش کی راہیں کھلتی ہیں اور آدمی روایت پرستی کا اسیر ہونے کی بجائے علی وجہ البصیرت اسلامی حقائق کو پرکھنے اور جانچنے لگتا ہے۔ جو لوگ یہ رٹ لگاتے ہیں کہ مذہبی لوگ احمق ہوتے ہیں۔ علم الکلام کا مطالعہ کر کے اپنی غلطی پر نادم ہوتے اور یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ بے دین صرف وہی لوگ ہو سکتے ہیں جنہوں نے اپنی عقل و بصیرت کو کھو دیا اور ملحدانہ زندگی بسر کر کے اپنے فطری جذبات کو پامال کر ڈالا۔

Marfat.com

مذاہب عالم
یا
ایک تقابلی مطالعہ

مذہب کی تعریف

سوال ۳۵ :۔ مختصر الفاظ میں بتائیے کہ مذہب کیا چیز ہے؟ نیز مذہب کے ارتقاء کی تفصیلات مختصراً بیان کیجئے۔

جواب :۔ چونکہ دنیا میں لاتعداد مذہب پائے جاتے ہیں اور ان میں بیان کردہ عقائد و اعمال بھی مختلف ہیں۔ اس لئے مذہب کی کوئی جامع و مانع تعریف کرنا مشکل ہے۔ مسٹر ای۔ بی ٹیلر نے مختصر ترین الفاظ میں مذہب کی تعریف یہ بیان کی ہے۔

"مذہب روحانی موجودات پر اعتقاد کا نام ہے"

اس تعریف سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ مذاہب عالم کا جوہر و خلاصہ کیا ہے مگر وہ مذہب اس تعریف سے خارج ہو جاتے ہیں جن میں ایمان و عقیدہ پر چنداں زور نہیں دیا گیا بلکہ اخلاقیات کو مذہب کی روح قرار دیا گیا ہے مثلاً بدھ مذہب اور کنفیوشس کا مذہب یہی وجہ ہے کہ اس تعریف کو ناکافی سمجھتے ہوئے مسٹر میتھیو آرنلڈ نے مذہب کو "جذباتی اخلاق" سے تعبیر کیا ہے یعنی اخلاق کا وہ مجموعہ جو جذبات کے زیر اثر تربیت پاتا ہے اسے مذہب کہا جاتا ہے۔

پروفیسر وائٹ ہیڈ نے مذہب کی یہ تعریف کی ہے۔

Marfat.com

"مذہب ان صداقتوں کے مجموعہ کا نام ہے کہ اگر انہیں خلوص سے قبول کیا جائے اور عقل و خرد کی روشنی میں سمجھا جائے تو انسانی زندگی میں انقلاب برپا ہو سکتا ہے"

مذہب کا ارتقاء

مذہب کے آغاز و ارتقاء کے بارے میں دو نظریات پائے جاتے ہیں

۱۔ پہلا وہ نظریہ جو مذہب نے پیش کیا ہے۔ اسے مذہبی نقطۂ نگاہ کہتے ہیں

۲۔ ارتقائی نظریہ

۱۔ اس ضمن میں مذہبی زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو اس کائناتِ ارضی پر بھیجا تو اس کی جسمانی ضروریات کے اہتمام کے ساتھ ساتھ اس کی روحانی غذا کا بھی سامان کیا۔ پہلا شخص جسے خدا نے زمین پر بھیجا (حضرت آدمؑ) پہلا پیغمبر بھی تھا۔ اس کے بعد جب بھی دنیا میں جہالت و ضلالت پھیلنے لگی اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو بھیج کر لوگوں کو صراطِ مستقیم سے آگاہ کیا۔ سب سے آخر میں سالارِ رسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری اور مکمل دین دے کر مبعوث کیا۔ سب انبیاء دینِ اسلام کے داعی و مبلغ تھے اس لئے اصولِ دین یکساں تھے البتہ ضروریاتِ زمانہ کے اعتبار سے انبیاء کی تعلیمات میں جزوی سا فرق پایا جاتا ہے۔ جب کوئی قوم امتدادِ زمانہ سے اپنے پیغمبر کی تعلیمات کو بگاڑ دیتی تو اس کی اصلاح کے لئے نئے پیغمبر کو بھیجا جاتا تھا مسیحیت اور یہودیت جن کی نسبت حضرات عیسیٰؑ اور موسیٰؑ کی طرف ہے اصولی طور پر اسلام ہی تھیں۔ ان کے پیروؤں نے اصلی تعلیمات کو مسخ کر ڈالا۔ لہٰذا اب ان کی وہ اصلی صورت باقی نہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے ان تعلیمات کو نازل کیا تھا۔ اب مذہب حق صرف دینِ اسلام ہے۔ اس کی تعلیمات معیارِ صداقت ہیں۔ سابقہ مذاہب و کتب کی جو باتیں اسلامی تعلیمات کے مطابق ہوں وہ درست ہیں۔ باقی

Marfat.com

نہیں۔ یہ دین اپنی آخری شکل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ہم تک پہنچا ہے اور اپنی اصلی شکل میں محفوظ رہا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق انسان کا پہلا عقیدہ توحید تھا۔ پھر انسانوں نے جادۂ توحید سے برگشتہ ہو کر شرک کو اختیار کر لیا۔ خدا کے نبی انسانوں کو شرک سے روکتے اور توحید کا سبق دیتے رہے۔

۲۔ مذہب کے بارے میں ارتقائی نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ انسان پہلے جاہل اور گمراہ تھا۔ آباؤ اجداد کی محبت میں گرفتار ہو کر وہ مشرک بن گیا۔ توحید کا عقیدہ شرک کے ردِّ عمل کے طور سے معرضِ وجود میں آیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انسان جب پیدا ہوا تو اس نے اپنے آپ کو مظاہر قدرت میں گھرا ہوا پایا ہر طرف مظاہر قدرت مثلاً چاند، سورج، ستارے، پہاڑ، سمندر، درخت، طوفان اور بجلی وغیرہ کی بھرمار تھی۔ انسان نے ان کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بے بس و بےکس دیکھ کر ان کی پرستش شروع کر دی کیونکہ انسان کی موت و حیات کا انحصار انہی مظاہر فطرت، مثلاً زلزلوں، طوفانوں، سیلابوں اور آتش فشانیوں پر تھا جب انسان کے علم میں اضافہ ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ مظاہر فطرت میں خدائی قوتیں نہیں پائی جاتیں۔ آغازِ کار میں ہر چیز کو دیوتا بنا لیا گیا تھا۔ علمی ترقی کے ساتھ ساتھ دیوتاؤں کی تعداد کم ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ صرف ایک خدا رہ گیا۔ اس نظریہ کے مطابق انسان میں پہلے شرک پایا جاتا تھا۔ توحید کا عقیدہ شرک کے ردِ عمل کے طور پر پیدا ہوا۔

مذہب کے بارے میں یہ دونوں نظریات پہلے سے چلے آ رہے ہیں دورِ حاضر کے مغربی محققین اب ارتقائی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر مذہبی نظریہ کو اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں۔ مذاہب عالم کا مشہور ماہر پروفیسر شمٹ (SCHMIDT) اپنی کتاب "مذہب کی ابتداء و ارتقاء" میں لکھتا ہے۔

Marfat.com

"اب یہ حقیقت نکھر کر سامنے آچکی ہے کہ انسان کا ابتدائی مذہب عقیدۂ توحید تھا۔ اسی سے آخر کار ایک توحیدی دین نے جنم لیا۔" (ص ۲۶۲)

صحیح طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ دنیا میں کس قدر مذاہب پائے جاتے ہیں؛ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ دنیا میں اگر لاکھوں نہیں تو ہزاروں مذاہب ضرور موجود ہیں۔ ان میں سے بعض مذاہب کے پیروکروڑوں کی تعداد میں ہیں اور بعض کے کم ہیں۔ دنیا میں بڑے بڑے مذاہب ہندومت، بدھ مت، یہودیت، عیسائیت اور اسلام ہیں۔

سوال ۳۶:۔ ہندو مذہب کی مختصر تاریخ، اس کی مذہبی کتب اور اس کے افکار و عقائد پر روشنی ڈالیئے۔

جواب:۔ ہندو مذہب کی تاریخ اور ان کے افکار و عقائد پر تاریکی کے پردے پڑے ہوئے ہیں یہاں تک کہ خود ہندو مذہب کے عالم بھی اس کی گرہ کشائی نہیں کر سکتے۔ اس مذہب میں خدا پرست سے لے کر تینتیس کروڑ تک خداؤں کے ماننے والے پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ بلکہ متناقض عقائد رکھتے ہیں۔ عقائد و افکار کی گوناگونی سے فائدہ اٹھا کر ہندوؤں نے مختلف گروہوں کو اپنے اندر شامل کر لیا اور اس طرح اپنی تعداد بڑھالی ہے۔

ہندو مذہب بہت پرانا ہے اور اس کی تاریخ بھی معلوم نہیں۔ عام خیال ہے کہ ہندومت کا آغاز اس وقت ہوا جب تقریباً ۱۵۰۰ قبل از مسیح میں آریاؤں نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ آریاؤں سے پہلے یہاں دراوڑی نسل کے لوگ آباد تھے جن کی تہذیب کے نشانات موہن جو ڈارو، ہڑپہ اور ٹیکسلا وغیرہ میں کھدائی سے برآمد ہوئے ہیں۔ آریاؤں نے ان لوگوں کو

تہ تیغ کر دیا یا محکوم بنالیا۔ تقریباً ۱۵۰۰ قبل مسیح میں ویدوں کی تصنیف عمل میں آئی۔ ان میں ترکِ دنیا کی تعلیم دی گئی ہے۔ رفتہ رفتہ ہندوؤں میں ذات پات کا امتیاز پیدا ہوا اور ان کے چار طبقے قرار پائے۔ ان میں سب سے بہتر برہمن اور سب سے کمتر شودر سمجھے گئے۔ اس ذات پات کی بنیاد پیدائش ہے۔ جو شخص برہمن پیدا ہوا وہ خواہ کتنے ہی خراب کام کرے برہمن ہی رہے گا۔ اس لئے کہ "برہما" (خالقِ کائنات) نے اسے اپنے سر سے پیدا کیا ہے۔ برہما نے کھشتریوں کو اپنے بازوؤں سے، ویشوں کو اپنے شکم سے اور شودروں کو اپنے قدموں سے پیدا کیا ہے۔ جو جو کام ان ذاتوں کو سونپے گئے اس میں بھی اس بات کا لحاظ رکھا گیا۔ برہمنوں کا کام پوجا پاٹ اور وعظ و نصیحت ہے۔ کھشتریوں کا جنگ اور حکمرانی۔ ویشوں کا کھیتی باڑی اور تجارت۔ شودروں کا کام خدمت گزاری ہے۔

ان ذاتوں کا لحاظ اتنا ضروری سمجھا گیا کہ آپس میں شادی بیاہ بھی ممکن نہیں تھا۔ اچھوتوں کو اس حد تک ناپاک تصور کیا جاتا تھا کہ اونچی ذات کے لوگ ان کے سایہ سے بھی ناپاک ہو جاتے۔ اچھوت اس کنویں سے پانی نہیں بھر سکتے تھے جس سے اونچی ذات کے لوگ پانی پیتے ہوں۔ ان کے برتنوں میں کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ ان کے مندروں میں پوجا پاٹ کے لئے نہیں جا سکتے تھے۔ بعض ہندو لیڈر مثلاً مسٹر گاندھی نے چھوت چھات کی سخت مخالفت کی مگر ذات پات کے امتیاز کو مٹا نہ سکے۔

ہندو مذہب کی کتبِ مقدسہ

ہندو مذہب کی چار کتابیں مشہور ہیں۔ رگ وید[۱]، اتھر وید[۲]، شام وید[۳]، یجر وید[۴]۔ ویدوں کے علاوہ ہندوؤں کی مشہور کتابیں اپنشد ہیں جن کا زمانہ

Marfat.com

تصنیف تقریباً ۸۰۰ قبل مسیح ہے۔ ان کتب میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ تمام کائنات میں ایک ہی روح کار فرما ہے جسے "برہما" کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں تناسخِ ارواح (آواگون) کے عقیدہ پر زور دیا گیا ہے۔ آواگون کے عقیدہ کا حاصل یہ ہے کہ انسانی روح اپنے اعمال کے مطابق اچھے یا برے جسموں میں منتقل ہوتی رہتی ہے اسے جونی چکر کہا جاتا ہے۔ یہ چکر عرصہ دراز تک قائم رہتا ہے۔ جزا، سزا اسی جونی چکر کے ذریعہ دی جاتی ہے لہٰذا قیامت کے برپا ہونے یا اخروی ثواب وعتاب کا مسئلہ خارج از بحث ہے۔ اگر ایک جنم میں نیک اعمال انجام دیئے جائیں تو روح دوسرے جنم میں کوئی اچھا جسم اختیار کر لیتی ہے ورنہ کسی برے جسم میں داخل ہو کر اپنے اعمال کی سزا پاتی ہے۔ جو شخص چوری کرتا ہے اسے یہ سزا دی جاتی ہے کہ اگلے جنم میں وہ چوہا بن کر پیدا ہوتا ہے۔ قاتل اگلے جنم میں شیر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ تناسخِ ارواح کا عقیدہ بڑا پرانا ہے اور آریاؤں کی آمد سے پہلے ہی ہندوستان میں موجود تھا۔ مندرجہ بالا دو کتب کے علاوہ ہندوؤں کی مذہبی کتب میں سب سے اہم مہابھارت اور رامائن ہیں۔ ان کے علاوہ پران، منوسمرتی اور گیتا بھی ہندوؤں کی مقدس کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ مہابھارت میں کوروں اور پانڈوں کی جنگ کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ دنیا کی ناپائیداری اور بے ثباتی کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ رامائن میں ہندوؤں کے اوتار رام چندر جی کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ مہابھارت اور رامائن قدیم رجزیہ مثنویاں ہیں۔

ہندومت کے افکار وعقائد

ہندو مذہب میں ترکِ دنیا اور عیش و راحت سے احتراز کو روحانی

Marfat.com

ترقی کی معراج خیال کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو سادھو جنگلوں میں بسیرا اختیار کر لیتے ہیں اور وہاں عبادت و ریاضت کے ذریعہ اپنے نفس کی اصلاح کرتے ہیں۔ وہ مختلف طریقوں سے اپنے جسم کو دکھ پہنچاتے ہیں مثلاً پانی میں کھڑے رہنا، انگاروں پر چلنا اور سخت دھوپ یا سردی میں بیٹھے رہنا۔

ہندو مت میں اس بات کی گنجائش ہے کہ آدمی دنیا سے کنارہ کش نہ ہو مگر اس صورت میں وہ روحانی ترقی نہیں کر سکتا۔ ایسے شخص کی زندگی کے چار دور ہوتے ہیں۔

۱۔ طلب علم کا دور

۲۔ خانگی زندگی کا زمانہ

۳۔ غور و فکر کی منزل

۴۔ پوجا پاٹ کا زمانہ

ہندو مذہب میں لاتعداد دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی ہے مگر ان میں سے تین زیادہ مشہور ہیں۔

۱۔ برہما:۔

یہ خالق کائنات ہے مگر دنیا کو پیدا کر کے وہ بے کار ہو چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو شاذ و نادر ہی اس کی پوجا کرتے ہیں۔

۲۔ وشنو:۔

ہندوؤں کے نزدیک انسان کی زندگی و بقا اسی دیوتا سے وابستہ ہے برہما کا تعلق تو صرف پیدا کرنے کے ساتھ ہے لیکن وشنو کا تعلق دائمی ہے بعض اوقات یہ انسانی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ہندوؤں کے بڑے بڑے رہنما مثلاً رام اور کرشن وشنو ہی کا اوتار تھے یعنی وشنو ان کی صورت میں

Marfat.com

جلوہ گر ہوتا تھا۔ ہندوؤں کے یہاں وشنو کی بہت پوجا کی جاتی ہے اور اسے بھگوان اور لائق عبادت تصور کیا جاتا ہے۔

۳۔ شیوجی :۔

شیوجی کا کام انسانی زندگی کو ختم کرنا ہے۔ اس کا کام وشنو کے عین برعکس ہے۔ اس طرح عملی زندگی پر گویا وشنو اور شیوجی کی حکمرانی ہے۔ ہندو شیوجی کی بھی پوجا کرتے ہیں۔

اس وقت اچھوتوں کو شامل کر کے ہندوؤں کی تعداد ۲۷ کروڑ ہے یہ ہندوستان، پاکستان، برما، سیام، ملایا اور انڈونیشیا میں آباد ہیں

Marfat.com

بُدھ مت

سوال ۳۷ :۔ بدھ مت کی ابتداء اور ارتقاء اور اس کے افکار و عقائد پر تبصرہ کیجئے۔

جواب :۔ بدھ مت کی تحریک دراصل ہندو مذہب کی برہمنیت اور ذات پات کی تفریق کے خلاف ردّ عمل کے طور پر معرض وجود میں آئی اس مذہب میں کسی خاص طبقہ کی اجارہ داری کی نفی کی گئی تھی اس لئے یہ شروع میں بڑی تیزی سے پھیلنے لگا۔ مگر زیادہ دیر تک یہ نظریات اس میں باقی نہ رہے اور آخر کار یہ مذہب بھی ہندو مت کی طرح برہمنی تصورات سے آلودہ ہو گیا۔

گوتم بدھ :۔

بدھ مت کا آغاز چھٹی صدی عیسوی میں ہوا۔ اس کے بانی گوتم بدھ ہیں جن کا اصلی نام سا کھیا منی تھا۔ نیپال کے جنوب میں کپل وستو کے مقام پر پیدا ہوئے۔ وہ ایک شاہی خاندان کے فرد تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی ناز و نعم میں گزری۔ ان کی ولادت کے وقت ایک نجومی نے کہا تھا کہ اگر اس بچے نے دنیوی مصائب کو بچشم خود دیکھ لیا تو تارک الدنیا ہو جائے گا ورنہ عظیم بادشاہ بنے گا۔ ان کے والد نے بڑا اہتمام کیا کہ یہ نو مولود آلام روزگار سے نا آشنا رہے مگر اس کی کوشش بار آور نہ ہو سکی۔ گوتم بدھ ایک مرتبہ اپنے ملازم کے ساتھ باہر گئے اور چند ایسے واقعات دیکھے جنہوں نے ان کی زندگی یکسر بدل دی۔ انہوں نے ایک بوڑھا، ایک مریض اور

Marfat.com

ایک لاش دیکھی۔ ان غم افزا مناظر نے ان پر بہت اثر ڈالا۔ پھر ایک تارک الدنیا درویش کو دیکھا جس کے چہرہ پر سکون و اطمینان کے آثار نمایاں تھے۔

یہ دیکھ کر وہ ترکِ دنیا کے لئے تیار ہو گئے۔ آخر تیس ۳۰ سال کی عمر میں ایک رات بیوی بچوں کو چھوڑ کر جنگل کی راہ لی۔ پہلے علم حاصل کرتے رہے پھر ریاضت شروع کر دی۔ غذا کو چند دانوں تک محدود کر دیا۔ سات دن تک مسلسل ایک درخت کے نیچے محوِ عبادت رہے۔ اس کے بعد انہیں اچانک وہ کیفیت حاصل ہوئی جسے "عرفان" کہتے ہیں جس جگہ انہیں یہ عرفان حاصل ہوا تھا اسے "بدھ گیا" کہتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے باقی زندگی تبلیغ و اشاعت میں بسر کر دی۔ ۴۸۰ سنہ قبل مسیح میں ۸۰ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔

افکار و عقائد :۔

بدھ مت کی تعلیمات کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ بدھ مت میں خدا کے اثبات و انکار کے بارے میں کچھ نہیں کہا گیا

۲۔ اس میں فرشتوں کے وجود یا قیامِ قیامت کا کوئی ذکر نہیں ملتا

۳۔ گوتم بدھ کا قول ہے کہ اپنی زندگی کی بہتری کے لئے انسان کو کسی ماورائی طاقت کے سہارے کی ضرورت نہیں۔

۴۔ ہر شخص عبادت و ریاضت کر کے اپنے نفس پر قابو پا سکتا ہے اور "نروان" حاصل کر سکتا ہے۔ نروان سے مراد روحانی ترقی کا وہ درجہ ہے جہاں پہنچ کر انسان دنیوی افکار و آلام سے نجات حاصل کر لیتا ہے

۵۔ بدھ مت میں آٹھ چیزوں کی صحت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

۱۔ صحیح ارادہ ۲۔ صحیح ایمان
۳۔ صحیح گفتگو ۴۔ صحیح کردار
۵۔ صحیح معاشش ۶۔ صحیح فکر
۷۔ صحیح انکار ۸۔ صحیح مراقبہ

۶۔ بدھ مت میں پانچ چیزوں سے منع کیا گیا ہے۔

۱۔ کسی جاندار کی جان نہ لی جائے۔
۲۔ کوئی چیز دھوکے یا زبردستی سے نہ لی جائے۔
۳۔ جھوٹ نہ بولا جائے۔
۴۔ نشہ آور چیزوں سے پرہیز کیا جائے۔
۵۔ جسمانی گناہوں سے پرہیز کیا جائے۔

۷۔ گوتم بدھ کے زمانہ میں یا تو ہندو یوگی تھے جو تارک الدنیا ہو کر درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے یا امراء تھے جنہوں نے ناز و نعم کی گود میں پرورش پائی تھی۔ وہ ہر قسم کے عیش و راحت کے دلدادہ تھے گوتم بدھ نے ان دونوں کی درمیانی راہ اختیار کرنے کی تلقین کی۔

بدھ مت میں انسان کی سیاسی، سماجی، تمدنی اور معاشی زندگی کے بارے میں کوئی ہدایت نہیں ملتی۔ یہ مذہب زیادہ سے زیادہ ایک ضابطۂ اخلاق ہے جس میں روحانی تسکین و طمانیت کا سامان موجود ہے

مہایان اور ہنایان

بدھ مت کے ابتدائی دور میں بت پرستی نہ تھی۔ ابتدائی تصویروں میں مہاتما بدھ کو کسی نشان مثلاً کھڑاؤں یا خالی تخت سے ظاہر کر کے ان کی موجودگی کا تصور پیدا کیا جاتا تھا۔ بدھ مت کا یہ دور "ہنایان" کہلاتا ہے۔ اس کے معنی

کم بوجھ برداشت کرنے والے کے ہیں۔ آگے چل کر ہندومت کے زیر اثر بدھ مت میں نئے نئے عقیدے اور رسم و رواج داخل ہو گئے۔ یہ ترمیم شدہ مذہب "مہایان" کہلایا۔ اس کے معنی ہیں "زیادہ بوجھ اٹھانے والا"۔ یہ نام اس لئے دیا گیا کہ اس میں ابتدائی مذہب کی نسبت بہت سے عقیدوں اور رسموں کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیت تھی۔

بدھ مت کی نشر و اشاعت

بدھ مت چونکہ برہمنیت کے خلاف ایک صدائے احتجاج کے طور پر عالم وجود میں آیا تھا اس لئے انسانیت کے پامال نظریات سے آلودہ ہو گیا اور گوتم بدھ کی بہت سی تعلیمات خارج کر دی گئیں۔ بدھ مت کے پیرو بت پرستی کرنے لگے۔ دراصل لفظ "بدھ" کی بگڑی ہوئی شکل بت ہے۔

مہاراجہ اشوک نے بدھ مت کو بڑا فروغ دیا۔ اس نے بیرونی ممالک میں مبلغ بھیجے۔ عبادت خانے تعمیر کئے اور جگہ جگہ کتبے نصب کروا کر بدھ مت کی تعلیمات کو پھیلایا۔ یہ بات حیرت انگیز ہے کہ ارض ہند بدھ مت کی جنم بھومی ہے مگر بدھوں کی تعداد یہاں بے حد قلیل ہے۔ بدھ مت کے پیرو زیادہ تر ممالک دیگر میں بودو باش رکھتے ہیں۔ بدھ مت کے پیروؤں کی تعداد پانچ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ یہ چین، برما، سیام، نیپال، بھوٹان اور سیلون وغیرہ میں آباد ہیں۔ بدھ مت کے پیرو پاکستان میں بھی سکونت پذیر ہیں۔

Marfat.com

یہودیت

سوال ۳۸ :۔ یہودیت کی مختصر تاریخ اور اس کے خصوصی خدوخال قلمبند کیجئے۔

جواب :۔ یہود کو نسلی امتیاز سے بنی اسرائیل کہا جاتا ہے۔ اسرائیل کے معنی ہیں "خدا کا بندہ" اور یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب تھا بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ ان کو حضرت یعقوبؑ کے بیٹے یہودا کی نسبت سے یہودی کہا جاتا ہے۔ یہود کا دعویٰ ہے کہ انہیں تقرب ربانی حاصل ہے۔ اور وہ اس کے برگزیدہ بندوں میں شامل ہیں قرآن کریم کے متعدد مقامات پر بنی اسرائیل کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ ارشاد فرمایا۔

یَا بَنِیْ إِسْرَائِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْ أَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَأَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعَالَمِیْنَ ۔	اے بنی اسرائیل! میری ان نعمتوں کو یاد کرو جو میں نے تمہیں دیں۔ نیز یہ کہ میں نے تمہیں ساری دنیا پر فضیلت بخشی

اس فضیلت کی وجہ بنی اسرائیل کی نسلی برتری نہ تھی بلکہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو دعوتِ اسلام کی نشر و اشاعت کے لئے منتخب کیا تھا۔ جب بنی اسرائیل اس کے اہل ثابت نہ ہوئے تو ان کو اس فضیلت سے محروم کر دیا۔

بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانہ ہی میں مصر آگئے تھے۔ اس وقت مصر میں بنی اسرائیل کے علاوہ قبطیوں کی نسل آباد تھی۔ بنی اسرائیل

Marfat.com

جب دعوت و ارشاد سے قاصر رہے تو قبطیوں نے انہیں اپنا غلام بنالیا۔ اسی دورِ انحطاط میں موسیٰ علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تیرہ سو سال قبل ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں بنی اسرائیل نے قبطیوں کی غلامی سے نجات پائی اور مصر سے نکل کر جزیرہ نمائے سینا میں پہنچ گئے۔ کچھ عرصہ گھومتے پھرتے کے بعد بنی اسرائیل نے فلسطین میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ اس سلطنت کا رقبہ اگرچہ زیادہ نہ تھا مگر یہ ہر لحاظ سے قائم اور بہت دولتمند تھی۔

یہود کی تاریخ مسلسل عروج و زوال کی داستان ہے جب انہوں نے خدا کی نافرمانی کی انہیں زوال ہوا۔ پھر ان میں پیغمبر مبعوث اور انہوں نے ان کو ذلت سے نجات دی۔ ان میں حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام جیسے پیغمبر بھی مبعوث ہوئے جو بیک وقت بادشاہ بھی تھے اور نبی بھی۔ ان کے عہد رسالت میں بنی اسرائیل کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ جب بنی اسرائیل پھر بھی نافرمانیوں سے باز نہ آئے تو خدا نے ایسے فاتحین بھیجے جنہوں نے فلسطین کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور انہیں وہاں سے نکال دیا۔ اب موجودہ دور میں مغربی طاقتوں نے انہیں فلسطین میں دوبارہ آباد کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہود کے افکار و معتقدات :۔

تمام الہامی مذاہب توحید کے قائل ہیں۔ آگے چل کر جب انہوں نے اپنے اپنے مذہب میں ترمیم و اضافہ سے کام لیا تو توحید کا عقیدہ کمزور پڑ گیا عیسائیت میں توحید کا عقیدہ بنیادی حیثیت رکھتا تھا لیکن بعد میں تثلیث نے توحید کی جگہ لے لی۔ آجکل اسلام کے علاوہ صرف یہودیت میں توحید

Marfat.com

کی تعلیم ملتی ہے۔ تاہم یہودیت کی تعلیمات میں ایسی چیزیں مل گئی ہیں جن کی وجہ سے یہود کے یہاں بھی آجکل توحید خالص نہیں ملتی۔ جہاں تک یہودیوں کے عقائد کا تعلق ہے ایک یہودی فلسفی موسی بن میمون نے ان کی تفصیلات یوں بیان کی ہیں۔

۱۔ خدا کے وجود پر ایمان
۲۔ توحید خداوندی پر ایمان
۳۔ خدا کے ابدی و دائمی ہونے پر ایمان
۴۔ خدا کے مادہ سے پاک ہونے پر ایمان
۵۔ عبادت صرف خدا کی کرنی چاہئیے
۶۔ رسالت پر ایمان
۷۔ حضرت موسیٰ کے رسول اعظم ہونے پر ایمان
۸۔ توریت کے وحی الٰہی ہونے پر ایمان
۹۔ تورات کے ناقابل تغیر ہونے پر ایمان
۱۰۔ خدا کے علیم و خبیر ہونے پر ایمان
۱۱۔ یوم آخر اور جزاء و سزا پر ایمان
۱۲۔ مسیح کے آنے پر ایمان
۱۳۔ حشر و نشر پر ایمان

سبت کا دن

اللہ تعالیٰ نے سبت کے دن کو عبادت کے لئے مقرر کیا تھا۔ یہ یہود کا مذہبی تہوار تھا۔ سبت کا دن جمعہ کے دن غروب آفتاب سے شروع ہو کر سنیچر کے دن ستاروں کے نمودار ہونے پر ختم ہوتا ہے۔ یہود نے اس دن کی عظمت کو حیلہ جوئی کر کے توڑا اور غضب الٰہی کے مستحق ٹھہرے تھے۔ آجکل یہود سبت کے دن کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ یہود اس دن کو عبادت و دعا کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔

یہود کی کتب مقدسہ

یہودیوں کی مقدس کتاب تورات ہے۔ تورات بائبل کے شروع میں

Marfat.com

پانچ کتابوں کی صورت میں درج ہے۔ اب تورات میں ان پانچ کتابوں کے علاوہ دوسرے نبیوں کے صحیفے اور تورات کی تفسیر تالمود بھی داخل ہے۔ تورات کا اصل نسخہ کہیں دستیاب نہیں۔ موجودہ مجموعے اس کے جلائے جانے کے صدیوں بعد لکھے گئے۔ تورات کی زبان اب مردہ ہو چکی ہے۔ موجودہ تورات میں لفظی و معنوی تغیرات بکثرت ہوئے ہیں۔ خاص طور پر تورات کے وہ حصے جن میں انبیاء مثلاً حضرت نوح، لوط اور یعقوب علیہم السلام پر بدترین الزامات عائد کئے گئے ہیں۔ تورات آج سے تقریباً سوا تین ہزار سال پہلے نازل ہوئی تھی۔ اسے تختیوں پر کندہ کرایا گیا تھا۔ جس فاتح نے بھی یروشلم کو فتح کیا، ان تختیوں کو آگ لگا دی۔ یہود کوشش کے باوجود تورات کو محفوظ نہ رکھ سکے۔ چونکہ نشر و اشاعت کے ذرائع محدود تھے اور تورات صرف یہود کے پاس تھی۔ لہٰذا انھوں نے تورات میں حسبِ خواہش تبدیلیاں کر ڈالیں۔

یہودیوں کی تعداد

چونکہ یہودیت نے الہامی مذہب کی بجائے ایک نسلی مذہب کی حیثیت اختیار کر لی اس لئے ان کی تعداد تاریخ کے ہر دور میں بہت کم رہی۔ مزید برآں تاریخ کے بعض ادوار میں بنی اسرائیل کی نسل کو کرۂ ارضی سے مٹانے کا تہیہ کیا گیا اور بہت کم افراد فاتحین کی یلغار سے جانبر نہ ہو سکے۔ حضرات داؤد و سلیمان علیہما السلام کا دورِ حکومت بنی اسرائیل کی تاریخ کا زریں عہد تھا مگر اس وقت بھی ان کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ نہ تھی۔ دوسری جنگِ عظیم کے وقت ان کی تعداد ڈیڑھ کروڑ تھی لیکن جرمنی میں ان کا قتلِ عام ہوا اور اب ان کی تعداد دنیا بھر میں ایک کروڑ سے زیادہ نہیں۔ بنی اسرائیل

Marfat.com

آجکل زیادہ تر اسرائیل نامی سلطنت میں آباد ہیں۔ اسرائیل کا شجرۂ خبیثہ اہلِ مغرب کی یادگار ہے اور وہ اپنے ناپاک عزائم کے لیے اس کی آبیاری کر رہے ہیں۔

Marfat.com

عیسائیت

سوال ۳۹ :- عیسائیت کی ابتدا وارتقاء اور حضرت عیسیٰ ع کی زندگی پر مختصر تبصرہ کیجیئے؟

جواب :- عیسائیت کے پیروؤں کی تعداد تمام اہل مذاہب سے زیادہ ہے۔ دنیا میں اس وقت پچھتر کروڑ عیسائی آباد ہیں۔ یہ تعداد دنیا کی مجموعی آبادی کا تیس فیصد ہے۔ گویا کثرتِ تعداد کے اعتبار سے یہ دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے۔ یہودیت کی طرح عیسائیت بھی ابراہیمی مذہب کی ایک شاخ ہے۔ یہودیت سے بھی اس کا گہرا تعلق ہے۔ یہاں تک کہ پہلے عیسائیت کو یہودیت کی ایک شاخ تصور کیا جاتا تھا۔ لہٰذا عیسائیت کو سمجھنے کے لئے یہودیت کی تاریخ سے آگاہ ہونا ضروری ہے

حضرت عیسیٰ علیہ السلام :-

قبل ازیں بتایا جا چکا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے قبل یہودی ہر قسم کی برائیوں میں مبتلا ہو چکے تھے۔ چنانچہ سزا کے طور پر انہیں فلسطین کی حکومت سے دوبارہ محروم کر دیا گیا۔ ان میں مسلسل انبیائے کرام تشریف لاتے رہے لیکن ان کی اصلاح نہ ہو سکی۔ انہوں نے بعض انبیاء کو قتل کیا۔ بعض کو قید و بند میں رکھا اور بعض کو سنگسار کر دیا۔ معاشرہ اس قدر بگڑ چکا تھا کہ برائی کے خلاف کوئی آواز سننا بھی گوارا نہ کرتا تھا یہ اس وقت کی حالت ہے جب یہودی فلسطین کی حکومت سے محروم ہو کر اپنے وطن میں رومیوں کے غلام ہونے کی حیثیت سے زندگی کے

Marfat.com

دن کاٹ رہے تھے۔ مقام حیرت ہے کہ غلامی کی ذلت کے باوجود یہودیوں کی حالت میں ذرہ بھر فرق نہ آیا۔ ان کے فقہا و علماء چھوٹے چھوٹے مسائل میں باہم دست و گریباں رہتے تھے۔ موسوی شریعت ایک بے روح ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی جس میں یہود نے اپنے حسب مرضی تغیر و تبدل قبول کر لیا تھا۔

اندریں حالات آج سے دو ہزار سال قبل حضرت عیسیٰؑ یروشلم میں بیت المقدس کے قریب بیت اللحم نامی جگہ میں کنواری مریم علیہا السلام کے بطن سے پیدا ہوئے۔ آپ کی ابتدائی زندگی کے حالات تاریخ میں محفوظ نہیں ہیں۔ عام خیال ہے کہ آپ ۴ قبل مسیح میں پیدا ہوئے اور ۲۹ سنہ میں اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ تیس سال کی عمر میں آپ نے دعوت و ارشاد کا بیڑا اٹھایا۔ آپ نے وعظ و نصیحت کی اور معجزات بھی دکھائے۔ جن یہودی علماء نے دین موسوی کو حسب خواہش تبدیل کر لیا تھا حضرت عیسیٰؑ نے خاص طور پر ان کو ہدف ملامت بنایا۔ آپ کے ارشادات سے بہت کم لوگ متاثر ہوئے اور وہ بھی کم حیثیت کے لوگ تھے مثلاً ماہی گیر اور دہقانی وغیرہ۔ یہود کا بااثر طبقہ آپ کے خلاف تھا۔ یہودی علماء نے آپ پر بغاوت کا الزام عائد کیا اور یہودی گورنر سے سازش کر کے آپ کو گرفتار کروا لیا۔ آپ کے لئے صلیب کی سزا تجویز کی گئی۔ یہودی گورنر آپ کی بے گناہی کا معترف ہو چکا تھا اور آپ کو سزا دینے کے حق میں نہ تھا۔ اس نے یہودیوں کو مشورہ دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور "برابا" ڈاکو میں سے ایک کو قومی تہوار کے موقع پر رہا کر دیا جائے۔ برابا ڈاکو وقت کا مشہور قاتل تھا اور اسے بھی گرفتار کر کے سولی دینے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ یہودیوں نے برابا کو رہا کرنے

اور حضرت عیسٰی علیہ السلام کو مصلوب کرنے کا فیصلہ صادر کیا۔ اس ضمن میں قرآن کا بیان ہے کہ یہودی اپنے مقاصد میں ناکام رہے اور آپ کی شکل و صورت کے کسی اور شخص کو سولی پر چڑھا دیا۔ اس باب میں عیسائی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ اپنے مقدس باپ خداوند کے اکلوتے بیٹے تھے۔ جن کا حمل روحِ مقدس سے ٹھہرا تھا۔ اور جو کنواری مریم کے لطن سے پیدا ہوئے تھے۔ رومی گورنر نے آپ کو سولی پر لٹکایا اور آپ فوت ہو گئے دفن کیے تیسرے روز آپ زندہ ہوئے۔ آسمان پر چڑھے اور اب اپنے باپ خداوند کے دائیں طرف بیٹھتے ہیں۔

سوال نمبر ۴ :۔ عیسائیوں کے افکار و معتقدات ، ان کے فرقوں اور کتب مقدسہ کی تفصیلات بیان کیجئے

جواب :۔ عیسائیوں کے افکار و نظریات میں تثلیث (TRINITY) کے عقیدہ کو نمایاں حیثیت حاصل ہے تاہم دلائل کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ ابتداء میں یہ متفق علیہ عقیدہ نہ تھا۔ ہمیں بہت سے فرقوں کا حال معلوم ہے جو تثلیث کے قائل نہ تھے بلکہ حضرت مسیحؑ کو خدا کا بندہ مانتے تھے۔ ناؤسیہ کے مقام پر شاہ قسطنطین اعظم نے جو مذہباً عیسائی ہو چکا تھا۔ عیسائی فرقوں کے اختلاف کو مٹانے کے لئے تیسری صدی عیسوی میں ایک مذہبی کونسل کا انعقاد کیا۔ کثرتِ رائے سے قرار پایا کہ تثلیث اور کفارہ کے مسئلہ کو مسیحیت میں بنیادی حیثیت دی جائے مگر اختلاف کرنے والے اس سے متفق نہ ہو سکے۔ آگے چل کر تثلیث کے مسئلہ کو مسیحیت میں بنیادی حیثیت حاصل ہو گئی تثلیث کے معنی ہیں خدا کو تین ماننا۔ عیسائی عقیدہ کے مطابق خدا (باپ)

عیسٰی (بیٹا) اور روح القدس (جبرئیل فرشتہ) تین الگ اکائیاں ہیں۔ لیکن ان تینوں سے مل کر ایک وحدت بنتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خدا ایک بھی ہے تین اور تین بھی ایک ہے یعنی بیک وقت وہ ایک بھی ہے اور تین بھی۔ ان تینوں کا الگ مستقل وجود ہے۔ تینوں الگ الگ قادر مطلق اور خدا ہیں اور تینوں مل کر پھر ایک بن جاتا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ عقیدۂ تثلیث خاصا گورکھ دھندا ہے مشہور عیسائی عالم چارلس اینڈرسن اسکاٹ لکھتا ہے

"ابتدائی تین اناجیل میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کی بنا پر یہ گمان کیا جاسکے کہ ان انجیلوں کے لکھنے والے مسیح کو انسان کے علاوہ کچھ اور سمجھتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں وہ ایک ایسا انسان تھا جو خاص طور پر خدا کی روح سے فیض یافتہ تھا۔ اناجیل کی متعدد عبارتوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مسیحؑ اپنے آپ کو صرف نبی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔

کفارہ کا مسئلہ:-

عیسائیت کا دوسرا بڑا مسئلہ کفارہ (نجات) ہے۔ مسئلہ کفارہ کا حاصل یہ ہے کہ سب انسان گنہگار ہیں۔ یہاں تک کہ انبیاء کا دامن بھی اس سے پاک نہیں۔ جب سب کائنات گناہ میں مبتلا ہوگئی تو رحمت خداوندی جوش میں آئی اور خدا خود مریم کنواری کے بطن سے پیدا ہو کر ابن اللہ کہلایا اور انسانوں کے ہاتھوں دکھ اٹھا کر صلیب پر مر گیا تاکہ انسان گناہ سے نجات پائے۔ مسئلہ کفارہ کے مطابق نجات صرف اسی طریق سے ممکن ہے کہ مسیح کے خدا، ابن اللہ اور مصلوب ہونے پر ایمان لایا جائے۔ جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں وہی نجات پائیں گے۔ عیسائی عقیدہ کفارہ کے مطابق حضرت مسیح کو نجات دہندہ مانتے ہیں۔ قرآن حکیم نے عقیدۂ تثلیث اور کفارہ دونوں کا ابطال کیا ہے

عیسائیوں کے فرقے :۔

عیسائیوں کے بہت سے فرقے ہیں جن میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے ان میں دو فرقے زیادہ مشہور ہیں (۱) رومن کیتھولک (۲) پروٹسٹنٹ۔ یہ دونوں فرقے تثلیث اور کفارہ کے قائل ہیں۔ رومن کیتھولک کا مرکز روم ہے اور پوپ ان کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا ہے جو مسیح کا نمائندہ کہلاتا ہے۔ ہر ملک میں اس کے نائب مقرر ہیں۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کا بانی لوتھر تھا جو اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر عیسائی مذہب میں اصلاحات کرنا چاہتا تھا۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کے لوگ یورپ اور امریکہ میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ "مشرقی تقلید پسندوں" کا ایک اور بڑا عیسائی فرقہ بھی ہے جس کا مرکز روس ہے۔ یہ فرقہ پہلے دونوں فرقوں سے مختلف عقائد رکھتا ہے۔ کچھ عیسائی ایسے بھی ہیں جو مسیح کو خدا کا بیٹا نہیں مانتے بلکہ خدا کا بندہ اور نبی کہتے ہیں۔ مگر عام عیسائی ان کو اپنے مذہب میں شامل نہیں کرتے

عیسائیت کی نشر و اشاعت :۔

یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ ایک مسیح آئے گا جو بنی اسرائیل کی رہنمائی کریگا جب حضرت عیسیٰؑ نے مسیح ہونے کا دعویٰ کیا تو یہودیوں نے انکار کر دیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسائیت نے بہت ترقی کی۔ چوتھی صدی عیسوی کے آغاز میں روم عیسائیت کا گہوارہ بن گیا۔ اس کے بعد عیسائیت کی قوت میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ قرون وسطیٰ میں پوپ کی قوت بادشاہوں سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔

عیسائی چرچ

چرچ عبادت گاہ کو کہتے ہیں مگر اس کے مفہوم میں وسعت پیدا ہو کے

Marfat.com

مذہبی اداروں اور ان کے انتظام پر بھی چرچ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ سیاسی قوت، مذہبی اثر و رسوخ اور دولت کی ریل پیل نے چرچ کو وقت کا اہم ترین ادارہ بنا دیا تھا مگر عیسائی رہنما اس کا غلط استعمال کرنے لگے۔ انہوں نے حضرت مسیح کی سادہ زندگی کو چھوڑ کر شاہانہ ٹھاٹھ سے رہنا شروع کر دیا وہ دولت کے حصول کے لیئے ہر طرح کے ذرائع استعمال کرنے لگے۔ اس کی حد یہ ہے کہ پوپ نے جنت کا ٹھیکے دار بن کر اس کے سرٹیفکیٹ فروخت کرنے شروع کر دیئے۔

وہ کفر و الحاد کا فتویٰ لگا کر جس کو چاہتا مروا دیتا۔ ذرا سا اختلاف اس کے لیئے ناقابلِ برداشت تھا۔ اختلاف رائے رکھنے والوں کو ایک خاص عدالت میں پیش کیا جاتا تھا جسے احتسابی عدالت کہا جاتا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق ابن عبد التوں نے ۱۴۸۱ء سے ۱۸۰۸ء تک ایک خاص عدالت میں تقریباً تین لاکھ آدمیوں کو شدید سزائیں دیں۔ ان میں سے ۳۲ ہزار کو جلتی آگ میں جھونکا گیا۔ جن لوگوں کو سزائیں دی گئیں ان میں گیلیلیو جیسے ماہرین سائنس بھی شامل تھے۔ اٹلی کے مشہور سائنسدان برونو کو بھی اشاعتِ علم کے جرم میں نذرِ آتش کر دیا گیا۔ چرچ کے اس ظالمانہ رویہ نے اس خیال کو جنم دیا کہ مذہب اور سائنس ایک دوسرے کی ضد ہیں اور مذہب کا عقل و استدلال سے کوئی تعلق نہیں۔ اس سے لوگوں میں دین و دنیا کی تفریق کا نظریہ پیدا ہوا اور مذہب کے معاملہ میں اندھی تقلید کو ضروری خیال کیا جانے لگا۔ ایک عیسائی دنیوی معاملات میں لاکھ ہوشیار ہو مگر مذہب کے بارے میں وہ اندھا مقلد ثابت ہوگا۔

Marfat.com

عیسائیوں کی کتب مقدسہ

قرآن کریم کے بیان کے مطابق انجیل آسمانی کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمائی۔ آج خطۂ ارضی پر انجیل کا کہیں وجود نہیں ہے۔ بائبل کو عیسائیوں کی مقدس کتاب تسلیم کیا جاتا ہے۔ بائبل عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید پر مشتمل ہے۔ عہد نامہ قدیم میں تورات کی پانچ کتابوں کے علاوہ اور کئی نبیوں کے صحیفے اور کئی تاریخی کتابیں جمع ہیں۔ عہد نامہ جدید میں اناجیل اربعہ، حواریوں کے خطوط اور یوحنا کے مکاشفات ہیں۔ اس مجموعہ کو عیسائی مقدس کتاب مانتے ہیں۔ اناجیل اربعہ یہ ہیں۔

۱۔ متی کی انجیل ۲۔ لوقا کی انجیل ۳۔ مرقس کی انجیل ۴۔ یوحنا کی انجیل
ان کے علاوہ اور اناجیل بھی موجود ہیں مگر ان کو معتبر نہیں سمجھا جاتا۔

اناجیل اربعہ میں کثرت سے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کا شجرۂ نسب بھی یکساں نہیں ہے۔ عیسائیوں کا اعتقاد ہے کہ یہ اناجیل چار مصنفین کو علیحدہ علیحدہ القاء ہوئی تھیں۔ القاء ہونے کا زمانہ حضرت عیسیٰ سے بہت بعد کا ہے اور پھر ان کو تحریر کرنے کا زمانہ القاء سے بہت متاخر ہے۔ تیسری صدی عیسوی تک عیسائیوں میں متعدد اناجیل اشاعت پذیر ہو چکی تھیں۔ اناجیل اربعہ کے مصنفین میں سے کوئی بھی حضرت عیسیٰؑ کا حواری یا شاگرد نہیں ہے۔ اناجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے سیر و سوانح اور ان کے وعظ بھی درج ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے حواری برنباس نے جو انجیل مرتب کی تھی اس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی پیشگوئی موجود ہے مگر عیسائی اس انجیل کو تسلیم نہیں کرتے۔

Marfat.com

اِسلام

سوال ۱۴ :- دینِ اسلام کی حقیقت اور اس کی ابتداء پر نوٹ لکھیئے؟

جواب :- اسلام وہ سچا دین ہے جس کی تبلیغ و اشاعت کیلئے اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کا سلسلہ جاری کیا۔ یہ سلسلہ اولین انسان حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور سید الرسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی پر ختم ہو گیا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر دینِ اسلام کی تکمیل ہو گئی اور اب کسی نئے رسول یا نبی کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اکثر لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دینِ اسلام کا آغاز ہوا۔ اسی بنا پر وہ آپؐ کو بانیٔ اسلام کے لقب سے یاد کرتے ہیں لیکن یہ بات درست نہیں خدا نے جس قدر انبیاء بھیجے وہ سب دینِ اسلام ہی کے داعی تھے حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام سب مسلم تھے لیکن بعد میں ان کے پیروؤں نے ان کی تعلیمات کو تبدیل کر دیا۔ عیسائیت اور یہودیت بھی اسلام ہی کی تبدیل شدہ صورت ہیں۔

دینِ اسلام کی حقیقت

اسلام کے لفظی معنی ہیں "گردن نہادن" (سر نیاز خم کرنا) گویا اسلام خدا کی اطاعت کا دوسرا نام ہے۔ کائنات کی ہر چیز دانستہ یا نادانستہ خدا کے قانون کے آگے سر جھکائے ہوئے ہے اور اس اعتبار سے مسلم ہے انسان بھی بڑی حد تک خداداد فطری قانون کی اطاعت کرتا ہے۔ اس کا جسم

اس کا ذہن، اس کے جذبات و احساسات سب قوانین خداوندی کے ماتحت ہیں لیکن انسانی زندگی کا ایک حصہ ایسا ہے جس کو خدا نے انسان کے ارادے پر چھوڑ دیا ہے۔ جو لوگ اپنی اس شعوری اور ارادی زندگی میں اسلام کی تعلیمات پر کاربند ہونے کا فیصلہ کریں انہیں "مسلم" کہا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے مسلم کسی خاندان یا ذات کا نام نہیں بلکہ ایک نظریۂ حیات کا نام ہے۔

عقائد و اعمال :-

اسلامی عقائد میں تین امور کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔

۱۔ توحید ۔ ۲۔ رسالت ۔ ۳۔ تصور آخرت

توحید :- توحید سے مراد یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اور اس کے سوا کسی کو اطاعت و عبادت کے لائق نہ سمجھے۔

رسالت :- رسالت کے معنی ہیں کہ جن انبیاء نے ہم تک خدا کا پیغام پہنچایا ان کو رسولِ دینی تسلیم کیا جائے۔

آخرت :- عقیدۂ آخرت سے مراد یہ ہے کہ ایک دن ایسا آئے گا جب سب انسانوں کو زندہ کیا جائے گا اور ان کو ان کے اعمال کی جزا یا سزا دی جائے گی۔ آخروی زندگی ابدی اور پائیدار ہے۔ اس کے مقابلہ میں دنیوی زندگی فانی اور زوال پذیر ہے۔

اسلام جن اعمال کا مطالبہ کرتا ہے ان میں پانچ مطالبات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

۱۔ پانچ وقت کی نماز ۔ ۲۔ ماہ رمضان کے روزے ۔ ۳۔ عمر بھر میں ایک دفعہ حج کرنا ۔ ۴۔ سالانہ زکوٰۃ ۔ ۵۔ جہاد فی سبیل اللہ

Marfat.com

مسلمانوں کی تعداد :-

اس وقت دنیا بھر میں ۵۷ کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے عیسائیت کے بعد اسلام دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے۔ مسلمان دنیا کے ہر گوشہ میں پائے جاتے ہیں۔ اس وقت اقوامِ متحدہ کے ۱۴۰ ممبر ملکوں میں سے ۴۳ مسلم ممالک ہیں۔ بیسویں صدی میں حصولِ آزادی کیلئے سب سے زیادہ جد وجہد مسلمانوں ہی نے کی ہے۔ اسی جہد و سعی کا نتیجہ ہے کہ دورِ حاضر میں ۴۳ آزاد مسلم ممالک کرۂ ارضی پر موجود ہیں۔

ایک تقابلی مطالعہ

سوال ۴۲ :۔ اسلام اور دیگر مذاہب کی کتب مقدسہ کا مقابلہ کیجئے اور بتائیے کہ ان میں افضل کونسی کتاب ہے اور کیوں؟

جواب :۔ ہم قبل ازیں مشہور مذاہب کا تذکرہ کر چکے ہیں۔ اب یہ دیکھیں گے کہ مذکورہ مذاہب میں سے کس مذہب کی کتاب فی الواقع آسمانی ہے اور زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہی ہے۔

جہاں تک ہندوؤں کی مقدس کتاب کا تعلق ہے۔ آج تک یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکا کہ وید کس زمانہ کی تصنیف ہیں۔ اکثر تعلیم یافتہ ہندو ویدوں کو صحیح نہیں سمجھتے اور ان کو آسمانی کتاب کی بجائے انسانوں کی تصنیف قرار دیتے ہیں۔ گوتم بدھ نے کوئی کتاب یادگار نہیں چھوڑی۔ ان کی تعلیمات سینہ بسینہ چلتی رہیں اور مدت کے بعد کتابی صورت میں جمع کی گئیں۔ یہودیوں کی مقدس کتاب تورات کے بارے میں تاریخی شہادت سے ثابت ہے کہ یہ کتاب عرصۂ دراز تک ناپید کر دی گئی تھی اور صفحۂ ارض پر اس کا کوئی نشان موجود نہ تھا۔ بخت نصر نے جب بیت المقدس پر حملہ کیا تو ہیکل سلیمانی کو تہس نہس کر دیا اور تورات کا صرف ایک نسخہ جو وہاں موجود تھا جل کر راکھ ہو گیا۔ بخت نصر پوری یہودی قوم کو پکڑ کر اپنے ساتھ بابل لے گیا جہاں انہیں اپنی مذہبی رسموں کے بجالانے کی اجازت نہ تھی۔

ایران کے بادشاہ سائرس نے جب بابل فتح کر کے یہودیوں کو رہائی

Marfat.com

دلائی تو انھوں نے کہیں سے تورات کا ایک نسخہ ڈھونڈ لیا۔ اس کے بعد کم از کم تین مرتبہ تورات کے نشان کو صفحہ ہستی سے مٹایا گیا۔
اندریں حالات یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ تورات وہی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی تھی۔ تورات کے محرف ہونے کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں انبیاء کی توہین کی گئی ہے۔ تورات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تدفین و تکفین تک کے واقعات درج ہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ تورات کے مصنفین نے حضرت موسیٰؑ کے بہت بعد اسے تصنیف کیا۔ اور اس میں ان کے سیر و سوانح بھی درج کر دیئے۔

انجیل :-

انجیل کا بھی یہی حال ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نامی جو کتاب اتاری گئی تھی اس کا کہیں وجود نہیں۔ حضرت مسیح کے بعد آپ کے شاگردوں نے آپ کی سوانح عمری مرتب کرنے کی کوشش کی اور انہی کی کوششوں کا نتیجہ بائبل کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ اس زمانہ میں جو انجیلیں لکھی گئیں ان کی تعداد ۹۰ تک بیان کی جاتی ہے۔ حواریوں کے بہت سے خطوط کو بھی ان میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ۳۲۵ء میں نیقہ کے مقام پر ایک کونسل کے سامنے ان اناجیل کو پیش کیا گیا۔ انہوں نے ان میں سے مندرجہ ذیل چار انجیلوں کو صحیح قرار دیا۔
۱۔ متی کی انجیل۔ ۲۔ لوقا کی انجیل۔ ۳۔ مرقس کی انجیل۔ ۴۔ یوحنا کی انجیل۔
ان کے علاوہ باقی تمام انجیلیں بیکار سمجھی گئیں۔ یہ انجیل جو تھی یا پانچویں

Marfat.com

ندی کی جو انجیل دستیاب ہے وہ یونانی زبان میں ہے۔ حالانکہ حضرت مسیح اور
ن کے حواریوں کی زبان آرامی تھی۔ اناجیل کے مصنفین کے بارے میں عیسائی بھی
لف الخیال ہیں کہ یہ کون لوگ تھے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت مسیح کے حواریوں کے
گرد تھے۔ انہوں نے اپنے علم کی حد تک حضرت مسیح کی سوانح عمریاں مرتب کی
یں۔ عیسائیوں نے ان کو الہامی کتاب قرار دیدیا۔

قرآن کریم

دیگر مذاہب کی کتب مقدسہ کے برخلاف قرآن کریم اپنی اصلی زبان (عربی)
یں آج تک اسی طرح موجود ہے جس طرح اترا تھا۔ اس کی زبان ایک زندہ زبان
ہے جو کرۂ ارضی پر ہر جگہ بولی، سمجھی اور پڑھی جاتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
عین حیات ہی قرآن کریم مرتب ہو گیا تھا۔ خلافتِ راشدہ میں صحابۂ کرام نے
س کی نقول کروا کر مختلف علاقوں میں بھیج دی تھیں۔ چودہ صدیاں گزر گئیں
قرآن کریم میں زیر و زبر اور شوشہ و مد کا فرق بھی نہیں آیا۔ اسلام کے مخالف
قرآن کریم کے محفوظ اور غیر محرّف ہونے کے معترف ہیں۔ قدیم و جدید قرآن
ذرہ بھر فرق نہیں۔ اسی طرح کرۂ ارضی کے دُور افتادہ کونوں تک قرآن
کے جو نسخے پائے جاتے ہیں ان میں سر مو فرق نہیں آیا۔

سوال ۴۳ :۔ دنیا کے پانچ مشہور مذاہب کے پیش کردہ نظام ہائے
حیات کا تقابل کیجئے؟

جواب :۔ بعض مذاہب سرے سے کوئی نظامِ حیات پیش ہی نہیں
مثلاً بدھ مت اور عیسائیت میں نظامِ حیات کا کوئی تصور موجود نہیں

یہ دونوں مذہب ایک نظامِ اخلاق پیش کرتے ہیں اور بس۔ لہذا اس امر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان کی تعلیمات سے انسان کی زندگی میں وہ یگانگت اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے جو کسی نظامِ حیات سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ دونوں مذاہب انسان کی اجتماعی زندگی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ہندومت اور یہودیت ضابطۂ اخلاق سے آگے بڑھ کر انسانی زندگی کے بارے میں ہدایات دیتے ہیں۔ لیکن ہندومت ذات پات کی تمیز اور بنی نوع انسان کو طبقاتی کشمکش میں مبتلا کر دینے کی وجہ سے بھی ناقابلِ قبول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منوسمرتی میں بیان کردہ ہندومت کے قوانین خود ارضِ ہند میں بھی معمول بہا نہیں ہیں اور ان کی جگہ نئے قوانین بنائے اور چلائے جاتے ہیں۔ اسی طرح یہودیت صرف بنی اسرائیل کی قوم تک محدود ہے اور اس لئے اسے ایک نسلی مذہب کی حیثیت حاصل ہے۔ یہودی نہ خود تبلیغ کرتے ہیں اور نہ چاہتے ہیں کہ کوئی ان کا مذہب اختیار کرے۔ ہندومت اور یہودیت دونوں کے قوانین بہت سخت ہیں اور ان میں کوئی لچک نہیں پائی جاتی۔ یہ دونوں مذہب کوئی ایسا جامع نظریۂ حیات پیش نہیں کرتے جو آئندہ ادوار میں انسانیت کی رہنمائی کر سکے۔ مزید برآں لچک نہ ہونے کی وجہ سے یہ زمانہ کے ارتقاء کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

علاوہ ازیں ان میں سے کوئی مذہب بھی کامل ہونے کا دعویدار نہیں ہندومت اور بدھ مت کے سلسلہ میں تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں تک یہودیت اور عیسائیت کا تعلق ہے ان کی کتب مقدسہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے بعد ایک آنے والے کی بشارت دی تھی جو دین کو مکمل کرے گا۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا

"میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا۔ اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔" (استثناء: ۱۸-۱۹)

حضرت عیسےٰ نے فرمایا:۔

"لیکن وہ فارقلیط (احمد صلی اللہ علیہ وسلم) پاکیزگی کی روح ہے جسے باپ (خدا) میرے نام سے بھیجے گا۔ وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں تمہیں یاد دلائے گا۔" (یوحنا: ۱۴-۲۶)

جملہ مذاہب کے برعکس حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دین پیش کیا ہے ہر لحاظ سے کامل اور انسانیت کے لیئے خدا کا آخری پیغام ہے۔ قرآن حکیم نے آپ کے ذریعہ یہ اعلان کیا کہ

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ — آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا
وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ — اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے
لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا — اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے پسند کیا۔

دین اسلام ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ اس میں انفرادی و اجتماعی زندگی کے اصول و ضوابط بیان کیئے گئے ہیں۔ اسلام میں اخلاق و عبادت نیز سیاسی و معاشرتی اور تمدنی و اقتصادی مسائل و احکام کو یکساں حیثیت حاصل ہے۔ اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ نہ اس میں انسان کو اتنی آزادی دی گئی ہے کہ وہ بے مہار ہو جائے اور نہ ہی اسے ہر طرح محدود و مقید کیا گیا ہے۔ قرآن کے ذریعہ زندگی کے بنیادی اصول متعین کر دیئے گئے ہیں۔ ان اصولوں کی روشنی میں ہر زمانے کے حالات کے مطابق قوانین مدوّن کئے جا سکتے ہیں۔ دین اسلام میں ہر دور کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ اس ضمن میں کوئی مذہب اس کا ہم پلہ نہیں ہو سکتا۔

دَورِ حاضر کی تحریکیں اور مذاہب

سوال ۴۴ :۔ جدید تہذیب کن عناصر سے مل کر بنی اور وہ کون سے اسباب تھے جنہوں نے ان عناصر کو جنم دیا؟

جواب :۔ مغربی ممالک میں جو تہذیب آجکل تہذیب جدید کے نام سے رائج ہے وہ وہاں شروع ہی سے موجود نہ تھی۔ موجودہ تہذیب کی عمر صرف پانچسو سال ہے۔ اس سے پہلے زمانہ کو تاریک دور (DARK AGES) کہتے ہیں۔ اس دور میں یورپ پر ظلمت و جہالت چھائی ہوئی تھی اور لوگ علوم و فنون کے نام سے بھی آشنا نہ تھے۔ اب یہ امر قابلِ غور ہے کہ اس تاریک دور میں علم و ہنر کی روشنی کیونکر آئی؟ یہ نئی روشنی جس کو تہذیب جدید کہتے ہیں وہ کن عناصر کی پیداوار ہے، اور کن اسباب نے ان عناصر کو جنم دیا؟

تہذیب جدید کے عناصر

موجودہ مغربی تہذیب پانچ عناصر کی پیداوار ہے جو یہ ہیں

۱۔ فلسفۂ مادیت

۲۔ نظریۂ الحاد

۳۔ جمہور کی حاکمیت

۴۔ قوم پرستی کا جذبہ

۵۔ حیوانی ازدواج کا نظریہ

یہ پانچ عناصر ہیں جن پر جدید تہذیب کی پرشکوہ عمارت کھڑی ہے ایک یہی وہ روشنی کا مینار ہیں جن سے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنی نکلی زرق

کر تہذیب جدید کے متوالوں کے قلب و دماغ کو منور کر رہی ہے۔

تہذیبی عناصر کے اسباب

مندرجہ ذیل اسباب نے تہذیب جدید کے مذکورہ صدر عناصر کو جنم دیا:-

۱۔ یورپ کا نظام جاگیرداری :- ہر ملک چھوٹی چھوٹی جاگیروں میں منقسم تھا۔ جاگیردار اپنے علاقہ میں خود مختار سمجھا جاتا تھا۔ مزارعین کی حیثیت کسی طرح بھی غلاموں سے بہتر نہ تھی۔ کاشتکار زمین چھوڑ کر کہیں جا نہیں سکتا تھا اور اسے کاشت کاری پر مجبور کیا جا سکتا تھا۔ مزارعین ہر لحاظ سے جاگیردار کے محتاج ہوا کرتے تھے۔ اس زمانہ میں کاشت کاری کے سوا اور کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ صنعت و حرفت برائے نام تھی۔

۲۔ طبقاتی تقسیم :- معاشرہ دو طبقوں میں منقسم ہو چکا تھا۔

(۱) امراء (۲) غرباء

طبقہ امراء میں جاگیردار اور مذہبی پیشوا شامل تھے۔ یہ لوگ حد درجہ عیاش تھے اور شراب خوری اور حرامکاری ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ دوسرے طبقہ کے لوگ ضروریات کو بھی ترستے تھے۔ دونوں طبقات کی زندگی میں حد درجہ تفاوت پایا جاتا تھا۔

۳۔ جنگ و جدل :- طبقہ امراء باہم نبرد آزما رہتا تھا چونکہ باتنخواہ فوج کا رواج نہ تھا۔ اس لئے مزارعین فوجی سپاہیوں کا پارٹ ادا کرتے تھے۔ دہقان ایک تو ویسے تنگدست تھے۔ پھر آئے دن کی جنگوں نے انہیں اور خستہ کر دیا تھا۔

۴۔ مذہب سے ناجائز فائدہ :- تمام مظالم کا جواز ثابت کرنے کیلئے مذہب کا سہارا لیا جاتا تھا۔ اس دور کا تبدیل شدہ مذہب ایک ایسا طلح

Marfat.com

تھا جس کو ہر بدنما چیز پر چڑھا کر اسے خوبصورت بنایا جا سکتا تھا۔ مذہبی طبقہ امراء کا آلۂ کار تھا اور ان کے ہر فعل پر صاد کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

۵۔ مسلمانوں کی نقالی :۔ تاریکی کے اس دور میں مسلمانوں نے یورپ کے کچھ حصہ کو فتح کر لیا اور کچھ حصہ سے تجارتی مراسم قائم کر لئے۔ مسلمان علوم و فنون کے شیدائی اور صنعت و حرفت میں ماہرانہ بصیرت رکھتے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی یورپ میں بھی علمی ذوق پیدا ہوا۔ عیسائیوں نے مسلم علماء اور قدیم یونانی فلاسفہ کے نظریات کا مطالعہ کیا۔ تقریباً ایک ہزار سال کے بعد یورپ میں علمی بیداری پیدا ہوئی۔ تاریخ کی اصلاح میں اس تجدید کو نشاۃِ ثانیہ کہا جاتا ہے۔ اس مطالعہ کی بنا پر یورپ میں روشن خیالی کے آثار پیدا ہوئے۔

۶۔ علمی تحریک کی مخالفت :۔ یورپ کے مذہبی رہنما اس علمی تحریک سے گھبرا اٹھے اور اس میں حصہ لینے والوں پر کفر کا فتویٰ لگا کر ان کو سخت ترین سزائیں دینے لگے۔ کہا گیا ہے کہ تین لاکھ آدمیوں کو اس جرم میں سخت سزائیں دی گئیں۔ بتیس ہزار افراد کو زندہ جلا دیا گیا۔ طبیعیات کے مشہور عالم برونو کو صرف اس جرم میں نذرِ آتش کر دیا گیا کہ وہ اس کرۂ ارض کے علاوہ دوسری دنیاؤں اور آبادیوں کا بھی قائل تھا۔ مشہور سائنسدان گیلیلیو کو اس بنا پر قید کر دیا گیا کہ وہ زمین کے علاوہ زمین کے سورج کے گرد گھومنے کا قائل تھا۔

۷۔ چرچ سے نفرت :۔ کلیسا (چرچ) کے ان لرزہ خیز مظالم کے خلاف عوام میں نفرت و حقارت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ غرض مند لوگوں کو چھوڑ کر سب کلیسا سے نفرت کرنے لگے۔ عداوت کے اس جوش میں انہوں نے نہ صرف

غلط مذہب اور غلط قسم کے مذہبی پیشواؤں بلکہ سرے سے مذہب ہی کو مٹا دینا چاہا جو جنگ پہلے عیاش قسم کے مذہبی رہنماؤں کے خلاف لڑی جا رہی تھی۔ اب عیسائی مذہب کے خلاف اور پھر ہر مذہب کے خلاف لڑی جانے لگی۔ ان لوگوں میں اس قدر صبر و تحمل نہ تھا کہ صحیح و غلط مذہب کے مابین فرق کرتے اس لئے وہ غصہ میں آکر ہدایت خداوندی ہی کے باغی ہو گئے۔ گویا اہل کلیسا کی حماقت کی وجہ سے پندرھویں اور سولھویں صدی میں الحاد کا آغاز ہوا۔

۸۔ تاجروں اور جاگیر داروں کے مناقشات:۔ صنعت و حرفت کی ترقی سے معاشرہ میں صنعت کاروں اور تاجروں کا طبقہ ابھرا۔ اس طبقہ نے اپنا مفاد اسی میں سمجھا کہ جلد از جلد جاگیر داری کا خاتمہ کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے جاگیر داروں کے پنجے سے رہائی کی جد و جہد کا آغاز کر دیا۔ بادشاہ پہلے ہی جاگیر داروں کے خلاف تھا۔ تاجر طبقہ نے چاہا کہ جاگیر داری سسٹم کو ختم کرنے اور اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے بادشاہ کے ہاتھ مضبوط کریں۔ چنانچہ تاجروں نے بادشاہ کے ساتھ مل کر جاگیر داروں کو سیاست سے بے دخل کر دیا اور اس طرح قومی ریاست کی بنیاد پڑی۔

۹۔ پوپ کی مخالفت:۔ کلیسا کی بدنظمی اور پوپ کی بد عملی نے یورپ بھر میں افراتفری پیدا کر دی۔ ان میں دو طرح کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو مذہب کو اس بد عملی کا ذمہ دار ٹھہرا کر خود مذہب ہی سے متنفر ہو گئے تھے۔ دوسرے لوگ مذہب کے مخالف تو نہ تھے البتہ وہ یورپ کے لئے ایک پوپ کے وجود کو بد عملی کا باعث قرار دیتے تھے۔ انہوں نے پاپائے روم کی برتری کا انکار کر کے قومی چرچ کی کلی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ تاریخ میں اس کو "اصلاح مذہب" کی تحریک کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس تحریک

کے ذمہ دار دو بڑے لیڈر تھے۔ میکاولی منکرین مذہب کا قائد تھا اور کوتھر مذہبی طبقہ کی سیادت سنبھالے ہوئے تھا۔

۱۰۔ نظریۂ قومیت:۔ قومی ریاستوں کے قیام سے صنعتی پیداوار میں اضافہ ہوا اور صنعتی پیداوار کی کھپت کے لئے نئی منڈیوں کی تلاش میں کشمکش کا آغاز ہوا۔ اس بھاگ دوڑ میں مسابقت کے جذبہ کا ابھرنا ایک فطری امر تھا چنانچہ اس مسابقت نے عداوت کا رنگ اختیار کر لیا۔ اور مختلف سلطنتوں کے درمیان جنگ کی آگ بھڑک اٹھی۔ اس آڑے وقت میں جس نظریہ نے لوگوں میں لڑنے مرنے کی روح پیدا کر دی وہ قومیت کا نظریہ تھا۔ مغربی لوگ اس تازہ محسوس خدا کے سامنے سجدہ ریز ہونے لگے۔ ہر ہر فرد میں یہ احساس ابھرنے لگا کہ اس کی ساری سرگرمیوں کا محور قوم کا بت ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب کو زندگی کے تمام گوشوں سے خارج کر دیا گیا۔ فلسفہ، اخلاق، معیشت معاشرت اور سیاست سب مذہب سے بے نیاز ہو گئے۔ ہر نادیدہ چیز سے انکار کو روشن خیالی کی دلیل سمجھا جانے لگا۔ اخلاق کا معیار ذاتی نفع کو قرار دیا گیا۔ قانون سازی میں الہامی و اخلاقی پابندیوں کو نادانی پر محمول کیا گیا۔ خلاصہ یہ کہ زندگی کے تمام گوشوں سے مذہب کو دیس نکالا دے کر مکمل طور پر اسے مادی بنا دیا گیا۔ یہ اسباب و وجوہ ہیں جو تہذیب جدید کے عناصر کو بروئے کار لانے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔

سوال ۴۵:۔ تہذیب جدید کے عناصر ترکیبی کا مختصر تعارف کروائیے؟

جواب:۔ جدید تہذیب نے پانچ عناصر سے ترکیب پائی ہے۔

Marfat.com

ان کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے۔

۱۔ فلسفۂ مادیت :۔

اس فلسفہ کا انحصار دو باتوں پر تھا

۱۔ زندگی کا مادی تصوّر

اس تصور کا حاصل یہ ہے کہ یہ کائنات مادہ ہی کا کرشمہ سازی ہے مادہ کے سوا دنیا میں کوئی چیز حقیقی نہیں۔ یہاں تک کہ انسان کا شعور اور ارادہ بھی ایک مادی چیز ہے۔ اس کائنات کو سمجھنے کے لئے مادی قوانین کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

۲۔ مادیت کا اخلاقی نظریہ

اس نظریہ کے مطابق انسان کو اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ جسمانی لذت کا حصول ہے۔ اس کے سوا دنیا کی ہر چیز بے کار اور غیر ضروری ہے۔ انسان کی جہد وسعی کا حاصل صرف لذت و نفع اندوزی ہے۔ مادی طرزِ فکر اہل یورپ پر چھایا ہوا ہے۔

ایک مغربی مفکر لکھتا ہے

"یورپ کا عام اور متوسط آدمی خواہ وہ جمہوریت پر ایمان رکھتا ہو یا فاشزم پر، سرمایہ دار ہو یا اشتراکی، جسمانی محنت کرنے والا ہو یا دماغی محنت کرنے والا ہو، وہ ایک ہی مذہب رکھتا ہے اور وہ مادی ترقی کی پرستش ہے اور اس کی زندگی کا واحد مقصد یہ ہے کہ وہ زندگی کو زیادہ سے زیادہ آسان آرام و راحت سے بھرپور اور عام خیال کے مطابق فطرت سے آزاد بنا سکے"

۲۔ لادینیت :۔

Marfat.com

لادینیت فلسفہ مادیت کو تسلیم کرتے اور عملاً اس کی ہموار کردہ راہ پر گامزن ہونے کا لازمی نتیجہ ہے۔ اگر اس کائنات میں ہر طرف مادہ ہی مادہ کی عملداری ہے تو اس کے لئے نہ کسی پیدا کرنے والے کی ضرورت ہے اور نہ قائم رکھنے والے کی۔ خالق نہ ہونے کی صورت میں جزا و سزا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جب سے یورپ میں مادی نظریہ حیات کا غلبہ ہوا ہے، بہت کم لوگ خدا کے قائل رہے ہیں۔ یورپ کے اکثر لوگ آج کل مذہب سے بے نیاز ہیں لادینی افکار کے غلبہ کی وجہ سے وہ دوسرے مذاہب کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

۳۔ حاکمیتِ جمہور:۔

فلسفۂ مادیت کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ خدا کی حاکمیت کے برعکس انسان کو حاکم قرار دیا گیا۔ جب انسان کو کسی نے پیدا نہیں کیا تو کسی کو آقائی کا منصب آخر کیوں سونپا جائے؟ لہذا یہ نظریہ ایجاد ہوا کہ انسان آپ اپنا مالک ہے۔ وہ جو قانون چاہے بنائے اور جس اصول کو چاہے توڑے۔ اب یہ سوال اٹھا کہ انسان باہم مختلف الرائے ہوتے ہیں۔ آخر کس کی بات مانی جائے اور اقتدار کا منصب کس کو تفویض ہو؟۔ اس سوال کے جواب میں ایک فرضی چیز تلاش کی گئی جس کو مشہور مفکر روسو "رائے عامہ" کا نام دیتا ہے۔ بایں طور حاکمیتِ انسان کے تصور نے حاکمیتِ جمہور کی صورت اختیار کر لی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عوام اپنے جذبات و احساسات میں مکمل طور پر آزاد ہیں۔ حلال و حرام کا فیصلہ ان کی رائے پر منحصر ہے۔ مذہب و اخلاق کا فیصلہ اگر لوگوں کی رائے کے خلاف ہو تو اسے رد کر دیا جائے۔ کسی حکومت کی اصل طاقت وہاں کے عوام ہیں۔

Marfat.com

اس فلسفہ نے حاکم و محکوم کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا اور حاکم و محکوم کا فرق و امتیاز مٹ گیا۔

بظاہر یہ نظریہ بڑا پرکشش ہے کہ عوام کو جاگیرداروں کے مظالم سے رہائی نصیب ہو اور وہ اپنی بہتری کے لئے کام کر سکیں مگر حقیقت یہ ہے کہ حاکمیتِ جمہور کے باوصف انسانیت کے مصائب میں کچھ کمی واقع نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حاکمیتِ جمہور کا نظریہ ایک سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ انتخاب اور استصواب کے پس پردہ جس رائے پر عمل کیا جاتا ہے وہ یا تو کسی ڈکٹیٹر کی ہوتی ہے یا چند اصحابِ اقتدار کی۔ یہ حقیقت ہے کہ جو مظالم قدیم سلاطین ڈھایا کرتے تھے دنیا کا ہوشیار طبقہ حاکمیتِ جمہور کے نام پر انہی کا مرتکب ہو رہا ہے۔ بے شک عوام کو دوسروں کے مظالم سے نجات ملنی چاہیئے لیکن ان کی فلاح و بہبود اسی میں مضمر ہے کہ وہ ایسے اصول و احکام کو اپنائیں جن میں کسی کی خود غرضی یا کج روی کو دخل نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جمہور صرف اسلامی اصولوں کی پیروی ہی سے یہ مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔

۴۔ جذبۂ قوم پرستی :۔

جب مادی فلسفہ نے یورپ میں مذہب کی دھجیاں اڑادیں اور اہل یورپ کو متحد کرنے والی کوئی چیز باقی نہ رہی تو اس کی جگہ قوم پرستی کے جذبہ نے لے لی۔ اس جذبہ نے سیاسی تقسیم کے باوجود یورپ کی شیرازہ بندی کر دی۔ اس نظریہ کے تحت قوم کو وہی حیثیت دی گئی جو مذہب میں شارع کو حاصل ہے۔ قوم معصوم ہے اور اس سے غلطی کا صدور ممکن نہیں۔ تمام افراد پر قوم کی اطاعت فرضِ عین ہے اور اس سے انحراف کفر ہے۔ اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کی تمام اقوام نے اپنے چھوٹے چھوٹے دائرے بنا لئے۔ انہوں نے ہر

Marfat.com

اس چیز کو کفر خیال کیا جو ان کی خاکِ وطن سے تعلق نہ رکھتی تھی۔ یہ قومی تعصب اس حد تک بڑھا کہ قوموں نے دوسری اقوام کی اعلیٰ اقدار کو ماننے سے بھی انکار کر دیا۔ جرمنی کا ایک پروفیسر لکھتا ہے۔

"ہمارے بچے کیوں ایک غیر قوم کی تاریخ پڑھیں۔ انہیں کیوں ابراہیم اور اسحاق کے قصے سنائے جائیں۔ ہمارا خدا جرمنی ہونا چاہیئے"۔

نظریۂ قومیت کا نتیجہ ہولناک جنگوں کی صورت میں رونما ہوا۔ دنیا کی وہ عظیم ترین جنگیں جنہوں نے کائنات کے ہر گوشہ کو انسانی خون سے لالہ زار بنا دیا اسی نظریہ کی پیداوار تھیں۔

۵۔ حیوانی ازدواج کا نظریہ:۔

جب یورپ میں مذہب و اخلاق کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا معاشرہ شرم و حیا اور عفت و عصمت کے پاکیزہ جذبات سے محروم ہو گیا۔ ہر طرف جنسی بے راہروی اور صنفی انارکی کے مظاہر نظر آنے لگے۔ آزادانہ میل جول، بے روک ٹوک شہوت رانی اور ہر قیمت پر شہوت رانی زندگی کا مقصد قرار پائی۔ عورتوں کو زندگی کی دوڑ دھوپ میں شریک کیا جانے لگا۔ نکاح کو ایک غیر ضروری بندھن قرار دیا گیا۔ عورت کو معاشرتی پابندیوں سے آزاد کر دیا گیا۔ کلب گھر، ناچ گھر اور شراب خانے عورت کی زینت سے مزین ہونے لگے۔ اس فلسفہ کا اثر یہ ہوا کہ نکاح کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ اس کے بعد نکاح سے عام بیزاری کا رجحان پرورش پانے لگا اور خاندانی نظام کی مضبوط عمارت پیوند خاک ہو گئی۔ حیوانی ازدواج کے نظریہ سے دو بڑے نتیجے نکلے۔

ا۔ اس فلسفہ کا پہلا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ معاشرتی زندگی کی جڑیں ہل گئیں۔ حسب و نسب کو بیکار چیز سمجھا جانے لگا۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف

سے غفلت برتی جانے لگی۔ اس کا نتیجہ معاشرے کی بربادی اور خاندانی نظام کی تباہی کی صورت میں نکلا۔

۲۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ جنسی بے راہروی کے مظاہر ہر جگہ نظر آنے لگے اس فلسفہ نے لوگوں کو یہ سبق دیا کہ آزاد محبت تقاضائے فطرت ہے۔ نکاح کی پابندی غیر فطری اور غیر ضروری ہے۔ اس کے نتیجہ میں یورپ کا ہر ہوٹل ہر پارک، ہر محلہ بداخلاقی کا مرکز بن گیا۔ روس بھی اس مرض میں مبتلا ہو گیا۔ روسی رہنماؤں نے اس بات پر زور دیا کہ کوئی چیز ان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ جنسی تعلقات میں انسان کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روس میں ہر طرف جنسی انارکی کے مظاہر نظر آنے لگے۔

انہی حالات کے پیش نظر علم طبیعیات کی مشہور ماہر مسز ہڈسن شا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

"ہماری تہذیب کی عمارت کی دیواریں منہدم ہونے کو ہیں۔ اس کی بنیادوں میں ضعف آگیا ہے اور اس کے شہتیر ہل رہے ہیں۔ نہ معلوم یہ عمارت کب پیوند خاک ہو جائے۔ ہم گزشتہ کئی سال سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ اب لوگ نظم و ضبط کی پابندیوں کو اختیار کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ اس کی بقا کی صرف ایک ہی صورت باقی ہے کہ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول پر پابندی عائد کر دی جائے۔"

Marfat.com

معاشرتی ارتقاء کا تصور
اور اس کے نتائج

سوال ۱۲۲:۔ معاشرتی ارتقاء کے نظریہ سے کیا مراد ہے؟ اس کے مشہور مفکرین کے افکار و نظریات قلمبند کیجئے۔

جواب:۔ جدید تہذیب کے عناصر نے نیک خیالات اور پاکیزہ جذبات کو جس طرح نابود کیا تھا معاشرتی ارتقاء کے تصور نے اس سے بھی بڑھ چڑھ کر کام کیا۔ معاشرتی ارتقاء کے تصور نے مادہ پرستی کے پیٹ سے جنم لیا۔ نفع اندوزی کے جذبہ نے اسے پروان چڑھایا اور سائنسی ترقی نے اسے قبولِ عام بخشا۔ جونہی اس نظریہ نے ترقی پائی عدل و انصاف کی جگہ جور و استبداد نے لے لی۔ شرافت رخصت ہو گئی اور اس کی جگہ شیطنت کا عمل دخل نظر آنے لگا۔ اس پر طرہ یہ کہ اس دور میں ہر قسم کے فتنہ و فساد اور سفاکی کو اخلاقِ عالیہ کا درجہ دے دیا گیا۔ یوں تو یہ نظریہ بہت سے اصحابِ فکر کے دماغ کی اختراع ہے مگر ہیگل، مارکس اور ڈاروِن کی خدمات خاص طور پر قابلِ تحسین ہیں۔ ذیل میں ہم ان مفکرین کے افکار کا خلاصہ بیان کرتے ہیں۔

ہیگل:۔

ہیگل کے نزدیک پوری انسانی تاریخ "فلسفۂ اضداد" پر مبنی ہے۔ تاریخِ انسانی کا ہر دور ایک وحدت ہے۔ اس وحدت کے اجزاء باہم مربوط ہیں۔ تاریخِ انسانی کا یہ قافلہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ پھر کچھ مخالف افکار و نظریات

Marfat.com

پہلے نظریات میں سے پیدا ہوتے ہیں اور دونوں قسم کے نظریات میں شدید جنگ چھڑ جاتی ہے۔ یہ جنگ ایک خاص مدت تک جاری رہتی ہے پھر ان میں صلح ہو جاتی ہے۔ دونوں عناصر میں سے غیر مفید اجزا چھانٹ دیئے جاتے ہیں۔ اور صالح اجزاء باقی رہتے ہیں۔ دونوں گروہوں کے صالح اجزاء مل کر ایک وحدت کو جنم دیتے ہیں۔ یہ وحدت ایک نئے نظام فکر و عمل کو لے کر آگے بڑھتی ہے اور پھر وہی پہلا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ نظریات کا یہ تصادم ہمیشہ سے جاری ہے۔ اور جاری رہے گا۔ افکار و نظریات کا یہ تصادم عملاً اقوام کے ٹکراؤ کی صورت میں ہوتا ہے۔

ہیگل کی رائے میں ہر قوم ایک خاص تہذیب اور ایک خاص فکر کی حامل ہوتی ہے۔ لہذا افکار کا تصادم در اصل اقوام کا تصادم ہے۔ اسی لئے انسانی ترقی کے لئے اقوام کا برسرِ پیکار رہنا ہیگل کے نزدیک ضروری ہے۔

کارل مارکس

کارل مارکس نے ہیگل کے فلسفہ کو بنیادی حیثیت سے تسلیم کر لیا مگر اس میں بعض تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ اس نے مادی اسباب یا معاشی محرکات کو انسانی ترقی کی بنیاد قرار دیا۔ مارکس اگرچہ ہیگل کے جدلی فلسفہ کو درست تسلیم کرتا ہے مگر اس کی رائے میں فیصلہ کن قوت افکار نہیں بلکہ مادی ماحول ہے۔ وہ کہتا ہے کہ معاشی اسباب ہی کسی قوم کی ذہنی زندگی کو بناتے ہیں۔ اس کے نزدیک انسانی ترقی کی صورت یہ ہے کہ پہلے معاشی پیداوار کے طریقوں میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ پھر اس سے زندگی کی ساری قدریں بدل جاتی ہیں اور اس طرح ایک نیا نظام معرضِ وجود میں آتا ہے۔ اب ہیگل کے فلسفہ کے مطابق جدید و قدیم نظام کے مابین جنگ بپا ہوتی ہے۔ غیر صالح اجزا نابود

Marfat.com

ہو جاتے ہیں اور صالح اجزا باقی رہتے ہیں۔ صالح اجزاء کی ترکیب سے ایک نیا نظام وجود پذیر ہوتا ہے۔ اسی طرح انسانی ترقی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مارکس کی رائے میں اجزائے تمدن اور اخلاقی قدروں کا تصادم اقوام میں نہیں بلکہ معاشرہ کے طبقات میں ہوتا ہے۔ اس طبقاتی جنگ کو برپا کرنے والی چیز معاشی اسباب ہیں۔ مارکس کے نزدیک اصل وحدت قوم نہیں بلکہ سوسائٹی کے طبقات ہیں۔ ہیگل جس طرح انسانی ارتقاء کے لئے اقوام کی جنگ کو ضروری قرار دیتا ہے اسی طرح مارکس کے نزدیک طبقاتی کشمکش ارتقاء کے لوازم میں سے ہے۔

ڈارون

ڈارون نے معاشرتی ارتقاء کے نظریہ پر زبردست اثر ڈالا۔ ڈارون کے نظریہ کی بنیاد تنازع للبقاء (STRUGGLE FOR EXISTANCE) پر ہے۔ ڈارون کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ ہر جاندار میں پھلنے پھولنے بڑھنے اور شکل و صورت کو تبدیل کرنے کا ایک فطری میلان پایا جاتا ہے لیکن یہ خواہش کمزور تر حیوانات کی موت اور تباہی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ ڈارون کے خیال میں یہ کائنات ایک رزم گاہ ہے جس میں موت و حیات کی جنگ چھڑی ہوئی ہے اور ہر طاقتور کمزور کو ختم کر دینے کا آرزومند ہے۔ جو جاندار اس میں زیادہ طاقتور ہے وہ زندہ رہتا ہے۔ در اصل زندہ رہنا صرف طاقتور کا حق ہے اور کمزور کو نعمت حیات سے بہرہ ور ہونے کا کوئی حق نہیں۔

کمزور کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں لہٰذا اسے چاہیے کہ کائنات کو اپنے ناتواں وجود سے جلد از جلد پاک کر دے۔ دنیا میں اسی طرح ارتقاء

کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ خود انسان بھی بڑی دشوار گزار منزلوں سے گذر کر انسانیت کے مقام تک پہنچا ہے۔ زندگی کی اس تجربہ گاہ میں سے جو کامیابی کے ساتھ گذر جاتا ہے وہ صالح ہے اور اسے زندہ رہنے اور ترقی پذیر ہونے کا حق حاصل ہے۔

سوال ۴۷ :۔ معاشرتی ارتقاء کے بنیادی اصول اور نتائج بیان کیجئے؟

جواب :۔ معاشرتی ارتقاء کے ہر سہ مفکرین یعنی ہیگل کارل مارکس اور ڈارون کے افکار کو جمع کرنے سے بحیثیت مجموعی جو نتیجہ سامنے آتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشرتی ارتقاء کے بڑے بڑے اصول یہ ہیں۔

بنیادی اصول :۔

۱۔ انسانی ارتقاء کا راز صرف اقوام و افکار کی باہمی آویزش و کشمکش میں مضمر ہے۔

۲۔ دنیا میں صرف طاقتور کو جینے کا حق حاصل ہے۔ ناتوان کو جلد از جلد اس صفحہ ہستی سے نابود ہو جانا چاہیئے۔

۳۔ انسانی زندگی کا اصل مقصد کامیابی ہے خواہ وہ کسی ذریعہ سے حاصل ہو۔ اس طرز فکر پر جامع تنقید کے لئے بڑا وقت چاہیئے۔ برملا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس فلسفہ نے اشرف المخلوقات انسان کو خونخوار درندہ میں تبدیل کر دیا۔ یہ جنت ارضی جس میں انسانی زندگی کے راحت و آرام کے جملہ لوازمات موجود ہیں۔ انسان کے لئے جہنم بن گئی۔ اس فلسفہ نے انسانیت کو بحیثیت مجموعی جو کچھ دیا اس کا مختصر بیان حسب ذیل ہے۔

Marfat.com

معاشرتی ارتقاء کے نتائج :-

۱- اس فلسفہ نے انسانیت کو پہلا تاثر یہ دیا کہ مادی ترقی ہی انسانی زندگی کی معراج ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسانوں کے مختلف گروہ اور طبقات مادی اسباب کی فراہمی میں دیوانہ وار لگ گئے۔ فرد اور قوم پر مادی ترقی کا بھوت سوار ہو گیا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو صفحۂ ارضی سے مٹ جاتے قوموں کی اس مسابقت نے کمینہ عادات مثلاً خود غرضی، سنگدلی، بخل، تنگ نظری، بد عہدی، خیانت کاری اور نمود و نمائش کا تحفہ بخشا اور مذہب و اخلاق، شرافت اور شرم و حیا کا سب سرمایہ چھین لیا۔

اس طرز فکر نے انسان کے مستقبل کو تاریک کر دیا۔ اس نے انسان کو کائنات کی حدود و قیود سے آشنا کیا مگر اس کی زنجیروں سے رہائی حاصل کرنے کا کوئی طریقہ نہ سکھایا۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے مستقبل کے بارے میں روز بروز مایوس ہوتا چلا جا رہا ہے۔

۳- چونکہ اس فلسفہ کے نزدیک ارتقائے انسانی کا راز کش مکش اور آویزش ہی میں مضمر ہے اس لئے اس نظریہ نے انسان میں حسد و بغض کے جذبات پیدا کر دیئے۔ یہ فلسفہ انسان کو یہ درس دیتا ہے کہ اگر ترقی کرنا چاہتے ہو تو اپنا سب کچھ جدال و تنازع کی نذر کر دو۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے موجودہ انسان کو بے رحم اور سنگدل بنا دیا ہے۔ اس فلسفہ کی رو سے اگر کوئی شخص کسی پر مظالم توڑتا ہے تو وہ فطرت کے تقاضوں کو پورا کرتا اور اپنی صلاحیتوں سے یہ ثابت کرتا ہے کہ دنیا میں جینے کا حق صرف اسی کو حاصل ہے۔ مظلوم کا حق ہے کہ وہ دوسروں کے مظالم برداشت کرتا اور لوگوں کے پاؤں تلے پامال ہوتا رہے۔ انسان لڑنے جھگڑنے کا عادی پہلے بھی تھا مگر اسے قبیح تصور کرتا

Marfat.com

تھا۔ اس فلسفہ نے ثابت کر دیا کہ اس میں قباحت کی کوئی وجہ نہیں۔ یہ عین نیکی ہے۔ ایک فرانسیسی مصنف لکھتا ہے۔

"انسانیت کا احترام دلوں سے مٹ گیا ہے۔ زندگی اپنی حقیقی قدر و قیمت کھو بیٹھی ہے۔ آج کوئی ظالم کے ظلم کو مٹانے کی ہمت نہیں رکھتا۔ واقعہ یہ ہے کہ درندگی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔"

۴۔ اس فلسفہ کی بدولت انسانی ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ ہر فعل جو مادی اعتبار سے کامیاب ہو انسانی ترقی کا ضامن ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان قوت و شوکت کا پرستار بن گیا۔ اس نے اپنی ذہانت کو ایسے کاموں کی تلاش کے لئے وقف کر دیا جن سے اس کی قوت میں اضافہ ہو۔ اسی نقطۂ نظر نے جارحانہ ملوکیت اور ظالمانہ سامراج کو جنم دیا۔

۵۔ اس طرزِ فکر نے لوگوں کو خود غرض بنا دیا۔ اس فلسفہ نے انسان کو سکھایا کہ اس کا اصلی نصب العین قوت و اقتدار کا حصول ہے۔ یہ مقصد اگر مذہب و اخلاق سے نکلتا ہو تو ان سے کام لینے میں ہرج نہیں اور اگر مذہب و اخلاق کو ترک کر دینے سے کامیابی حاصل ہو تو انہیں ترک کر دینا چاہیئے۔ اسی نظریہ کی بدولت پچھلی چار صدیوں میں میکاولی کے خیالات کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ گوبلز نے کہا تھا۔

"ہماری قوت اور طاقت کا مقصد صرف ایک ہے کہ ہر جائز و ناجائز طریقہ سے مخالف کو شکست دی جائے۔ ہماری تحریک مذہب کی پیش کردہ اخلاقی قیود سے آزاد ہے۔"

یہ ہیں مغربی تہذیب کے عناصرِ ترکیبی اور ان کے انسانی زندگی پر اثرات۔ دنیا کی ہر مادی تحریک ہمیشہ انہی نتائج کی حامل ہوا کرتی ہے خواہ یورپ کی

Marfat.com

لادینی جمہوریت ہو یا چین و روس کی اشتمالیت یا ہٹلر اور مسولینی کی فسطائیت یہ سب تحریکیں خالص مادی ہیں۔ ان کی بنیادی روح ایک ہی ہے اس لئے ان میں کامل یگانگت پائی جاتی ہے۔

Marfat.com

اشتمالیت

سوال ۳۸ :- اشتمالیت (کمیونزم) کیا چیز ہے اور زندگی کے بنیادی مسائل کے بارے میں اس کا زاویۂ نگاہ کیا ہے؟

جواب :- سرمایہ دارانہ جمہوریت کی وجہ سے معاشرہ جن خرابیوں میں مبتلا ہو گیا تھا اشتمالیت ان کو دور کرنے کے لیے عالم وجود میں آئی تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ دونوں فلسفۂ مادیت کی پیداوار اور بڑی حد تک باہم مماثل ہیں۔ ان دونوں کی ماں مادیت ہے اور دونوں نے مادی فلسفہ کی گود میں پرورش پائی ہے۔ معاشرتی مسائل ہوں یا اخلاقی اقدار اجتماع ہو یا قانون و سیاست اور علم و فلسفہ سب کی بنیادی قدریں دونوں میں یکساں ہیں۔ اشتمالیت مادی فلسفہ کی انتہائی موثر و منظم صورت کا نام ہے اس نے مختلف شعبہ ہائے حیات کو مادیت کے سانچہ میں ڈھال کر باہم مشابہ و مماثل بنا دیا ہے۔ اشتمالیت صرف مفلس لوگوں کے پیٹ ہی کا مسئلہ حل نہیں کرتی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک مستقل نظامِ فکر ہے جو فلسفہ، اخلاق، تہذیب، تمدن اور مابعد الطبیعاتی افکار کی گتھیاں بھی سلجھاتا ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ اس کی گرفت سے آزاد نہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی انسان پورے اشتمالی فلسفہ پر ایمان لائے بغیر صرف اس کے پیش کردہ معاشی نظام کو اختیار کر سکے۔ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے تو وہ جاہل ہے یا منافق۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ آپ اشتمالی نظامِ فکر کی کچھ باتیں مان لیں اور باقی باتوں کو نظر انداز کر دیں اشتمالی فلسفہ کی کڑیاں باہم اس قدر مربوط ہیں کہ انکو ایک دوسرے سے مربوط کرنا محال ہے

اشتمالی فلسفۂ حیات :-

زندگی کے بنیادی مسائل مثلاً یہ کہ انسان کی حیثیت اس دنیا میں کیا ہے اس کی زندگی کا نصب العین کیا ہے۔ ان مسائل کے بارے میں اشتمالیت کا زاویۂ نگاہ سراسر مادی ہے۔ اس کائنات پر جو کچھ ہے وہ مادی قوانین کا پابند ہے۔ اس فلسفہ کے حامی یہ کہتے ہیں کہ خدا کا تصور نہ صرف خلافِ عقل و فطرت بلکہ انسانیت کے لئے مہلک ہے۔ اس فلسفہ کے مطابق جب انسان کائنات کے اسباب و آثار سمجھنے سے قاصر رہتا ہے تو وہ مجبور ہو کر ایک بالاتر ہستی کے تصور میں پناہ لیتا ہے۔ جب انسان مادی قوانین کی گتھیوں کو سلجھائے گا تو اس کے دل سے خدا کا تصور خود بخود اٹھ جائے گا۔ بنا بریں خدا کا تصور مادی قوانین سے جہالت کی پیداوار ہے۔ جوں جوں سائنس کے ذریعہ کائنات کے مخفی راز منظرِ عام پر آتے جائیں گے، انسان بے خدا ہوتا چلا جائے گا۔

جو فلسفہ انسان کو بے خدا بنا دے وہ اس کے ذہن میں اس تصور کو بھی پختہ کر دے گا کہ انسان ایک عارضی اور اتفاقی چیز ہے جسے فطری قوتوں نے جنم دیا اور جو ان کے ہاتھ میں ایک بے بس کھلونے سے زیادہ نہیں ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کائنات کی حقیقت مادہ سے زیادہ کچھ نہیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مادی دنیا میں قوت و شوکت ہی کو سب سے اہمیت حاصل ہے۔ اس کے پیشِ نظر آخرت کا تصور خود بخود مہمل نظر آنے لگتا ہے۔ مادی طرزِ فکر کا پہلا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان غیر ذمہ دار اور خود غرض ہو جاتا ہے۔ معاشرتی زندگی میں مسابقت اور دوسروں سے آگے نکل جانے کا جذبہ اسی فلسفہ کی پیداوار ہے۔ اس ذہنیت کی وجہ سے معاشرہ کا سکون و اطمینان غارت ہو جاتا اور شر و فساد کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔

Marfat.com

تاریخ کی مادی تعبیر

سوال ۴۹: مارکسی فلسفہ میں تاریخ کی مادی تعبیر سے کیا مراد ہے؟ اس نظریہ پر تنقید کیجئے۔

جواب: تاریخ کی مادی تعبیر مارکسی فلسفہ کا سنگِ بنیاد ہے۔ مارکس کہتا ہے کہ معاشی نظام ہی کسی عہد کی معاشرتی زندگی کی اصل و اساس ہے۔ نہ صرف مذہب، تہذیب، فلسفہ حیات اور فنونِ لطیفہ ہی اس کے تابع ہیں بلکہ تمام انسانی جذبات و احساسات پر اسی کی حکمرانی ہے۔ انسان کے سب تجربات و مشاہدات معاشی نظام کے زیر اثر ہیں۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پیٹ کے مسئلہ کے علاوہ بھی زندگی کے کچھ مسائل ہیں وہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ انسان کا اصل مسئلہ صرف روٹی کا مسئلہ ہے اور اسی کے توسط سے زندگی کی تمام قدریں جنم لیتی ہیں۔

جوں جوں علوم و فنون بڑھتے جاتے ہیں ان کے ساتھ ساتھ انسانی ضروریات کا دائرہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ یہ ضرورتیں معاشی انقلاب بپا کرتی ہیں اور اسی انقلاب کے گرد ساری کائنات کا نظام گردش کرتا ہے۔ جس نسبت سے ذرائع پیداوار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، زندگی کے تمام شعبے اسی رنگ میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ جدید ایجادات کا سلسلہ چونکہ ختم ہونے میں نہیں آتا اس لئے ہمیشہ تغیر رونما ہوتا رہتا ہے۔ اسے ہم "تاریخی انقلاب" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسی تغیر پذیری کا نتیجہ ہے کہ انسانی زندگی کو کسی منزل پر سکون و قرار نصیب نہیں ہوتا۔ زندگی کا قافلہ

جب ایک منزل پر آکر رُکتا ہے تو آگے بڑھنے کا شوق اسے پھر بے چین کر دیتا ہے۔ اس نظریہ کی بدولت اخلاق اقدار کا ایک نہایت نیا تصور سامنے آتا ہے اس نظریہ کے پیشِ نظر دنیا کی کوئی صداقت دائمی نہیں۔ ہر دور کی سیاسی، مذہبی اور اخلاقی قدریں پہلے دور کی قدروں کو بے وقعت بنا دیتی ہیں۔ اس لئے نیکی و بدی، خیر و شر یا حق و باطل کوئی چیز نہیں۔ ایسی کوئی صداقت نہیں جو ہر زمانے کے لئے یکساں طور پر صحیح اور ابدی ہونے کا دعویٰ کرے ہر دور کے اپنے مسائل اور خاص عقائد و اعمال ہوتے ہیں۔ ایک چیز ایک دور میں حق اور دوسرے میں باطل ہو سکتی ہے۔ ایک عمل ایک خاص ماحول میں نیکی تصور کیا جاتا ہے اور دوسرے ماحول میں اسے بدی قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنیادی مسئلہ صرف پیٹ کا ہے۔ اس کے علاوہ تمام انسانی رجحانات و میلانات اور احوال و واقعات اسی کے تابع ہیں۔

تاریخ کی مادی تعبیر پر تنقید:۔

۱۔ مارکس کے اس نظریہ کی زد سب سے پہلے اس کے اپنے فلسفہ پر پڑتی ہے۔ اگر کسی زمانہ کے تصورات و نظریات اس کے مخصوص معاشی نظام کی پیداوار ہوتے ہیں اور اس کے بعد بیکار ہو جاتے ہیں تو اس کے اپنے افکار و نظریات کو بھی انیسویں صدی کے مخصوص معاشی نظام نے جنم دیا ہوگا اور جب وہ گذر گیا اور فکر و نظر کے دھارے بدل گئے تو اس کا فلسفہ فرسودہ و بوسیدہ ہو کر قابل عمل نہ رہا۔ نیز اس سے کیمونزم کا بھی فرسودہ اور بیکار ہونا لازم آتا ہے۔

۲۔ اس میں شبہ نہیں کہ معاشی نظام انسانی زندگی میں بڑی اہمیت

Marfat.com

دکھاتا ہے۔ مگر ہم یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ تہذیب و تمدن کے سب لوازمات معاشی نظام ہی کے رہین منت ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ انسانی تاریخ کی تعمیر میں جس طرح معاشی نظام اہم پارٹ ادا کرتا ہے۔ اسی طرح زندگی کے دوسرے تقاضے بھی اس سے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتے۔ بے شک یہ صحیح ہے کہ جینے کے لئے انسان کو خوراک کی ضرورت ہے۔ گرمی اور سردی سے بچنے کے لئے لباس درکار ہے اور سر چھپانے کے لئے مکان کی ضرورت ہے مگر یہ ضروریات اور ان کی فراہمی کی تدابیر اس کی ذہنی اور شعوری کیفیات کی تخلیق نہیں کرتیں۔ ایک مصور تصویر بناتے میں مختلف رنگوں سے کام لیتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ مصور کے رنگ ہی اس کے آرٹ کے اصل خالق ہیں۔

۳۔ مارکس کے فلسفہ سے لازم آتا ہے کہ جو معاشرے ایک ہی قسم کا معاشی نظام رکھتے ہوں ان کا تمدن اور مذہب و اخلاق بھی یکساں ہوں حالانکہ عملی طور پر ایسا نہیں ہے۔ مارکس کی تاریخی تقسیم کے پیش نظر رومی تمدن اور آغاز اسلام کا تمدن معاشی اعتبار سے یکساں تھا۔ دونوں میں غلامی کا رواج تھا۔ معاشی طور طریقوں میں بھی چنداں فرق نہ تھا۔ مارکسی فلسفہ کے مطابق چاہیئے تھا کہ ان کے مذہب و اخلاق میں کامل یگانگت ہوتی مگر تاریخ کی شہادت اس کے برعکس ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دونوں کے تصورات میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ رومی تمدن میں غلاموں کو حیوانی کا درجہ دیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس اسلام نے غلام کو حیوانات کی سطح سے اٹھا کر انسانیت کی معراج پر پہنچا دیا۔

۴۔ بہت سی قومیں ایسی گزری ہیں جن کا معاشی نظام بالکل یکساں

Marfat.com

تھا مگر ان کا تمدن اور ان کی اخلاقی اقدار میں نمایاں فرق و امتیاز پایا جاتا ہے۔
اس سے صاف ظاہر ہے کہ اقوام کی زندگی میں معاش ہی اصل قوت نہیں بلکہ زندگی کا اصل مقصود وہ بلند و بالا مقاصد ہیں جن کے لئے انسان زندہ ہے اور زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے معاش کا محتاج ہے۔ مارکس کے فلسفہ میں خامی یہ ہے کہ وہ انسانی اور ادراک و شعور کو معاشی ذرائع پیداوار کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ بے شک انسانی ارادہ معاشی عوامل سے متاثر تو ہو سکتا ہے مگر وہ ان کی پیداوار نہیں۔ دراصل انسانی ارادہ و عمل کا محرک خود انسان ہے نہ کہ معاشی عوامل۔

۵۔ مارکس نے "قوت تاریخ" کو ذرائع پیداوار کی تبدیلی کا باعث قرار دیا ہے۔ یہاں تک کہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس کی حقیقت کیا ہے؟ مارکس اس کا کوئی جواب نہیں دیتا۔ اگر قانون و اخلاق کی تبدیلی سیاسی نظام کی تبدیلی کا نتیجہ ہے اور سیاسی تبدیلی کا باعث معاشی ذرائع پیداوار کا تغیر و تبدل ہے تو اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ذرائع پیداوار میں کمی بیشی کیونکر پیدا ہوئی۔ مارکس نے تاریخی قوت کو اس کا سبب قرار دیا ہے مگر وہ یہ نہیں بتاتا کہ تاریخی قوت کیا چیز ہے۔ مارکس کے مادی فلسفہ کے یہاں اس کا کوئی جواب نہیں۔

۶۔ مارکسی فلسفہ کی رو سے مذہبی و اخلاقی تبدیلی چونکہ معاشی حالات کی تبدیلی کا نتیجہ ہوتی ہے لہذا مذہبی انقلاب بپا ہونے سے قبل معاشی نظام کا بدلنا ضروری ہے لیکن تاریخ میں کثرت سے ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ مذہبی انقلاب پہلے آیا اور معاشی تبدیلی بعد میں ہوئی۔ جب سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے عرب میں ایک عظیم مذہبی انقلاب آیا اس سے پہلے معاشی نظام میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ معاشی تبدیلی اس وقت رونما ہوئی جب فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا اور مسلمانوں میں فارغ البالی و خوشحالی کا دور

Marfat.com

وقوعہ ہوا۔ اس سے مکمل طور پر نکھر کر یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ذہنی انقلاب کسی معاشی انقلاب کے تابع نہیں ہوتا بلکہ مذہب، اخلاق کی تبدیلی انسانی شعور و ارادہ کے زیر اثر وقوع میں آتی ہے۔

Marfat.com

طبقاتی کشمکش

سوال ۵۰ :۔ طبقاتی نزاع سے کیا مراد ہے؟ اس نظریہ پر ناقدانہ تبصرہ کیجیئے۔

جواب :۔ مارکسی فلسفہ میں طبقاتی کشمکش تاریخ کی مادی تعبیر کا لازمی نتیجہ ہے۔ مارکس کی رائے میں معاشی نظام جب ترقی کر کے ایک خاص مقام پر پہنچتا ہے تو ذرائع پیداوار کی تبدیلی سے طبقاتی کشمکش رونما ہوتی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جب ذرائع پیداوار میں تغیر واقع ہوتا ہے تو انسانیت کے جو طبقے پہلے پامال ہوتے ہیں وہ اس تبدیلی سے فائدہ اٹھا کر افراد معاشرہ کو از سر نو طبقات میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ پسماندہ طبقہ کی یہ بیداری ان لوگوں پر بہت گراں گزرتی ہے جو پر فریب طریقوں سے معاشی نظام پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ دوسری جانب مظلوم طبقہ بڑی گرمجوشی سے معاشی نظام کی تبدیلی کا استقبال کرتا ہے۔ وہ سوچتے ہیں شاید آنے والے معاشی نظام میں ان کے مقدر کا ستارہ چمک اٹھے۔ اس طرح غالب و مغلوب دونوں طبقوں میں ایک نزاع و جدل بپا ہو جاتا ہے جسے "طبقاتی نزاع" کہتے ہیں۔ یہی کشمکش تاریخ کے ہر انقلاب اور جنگ کا سبب بنتی ہے۔

طبقاتی نزاع کے نظریہ پر ایک نظر :۔

ہمارے خیال میں مارکس کا یہ خیال درست ہے کہ مظلوم طبقہ بعض اوقات ظالم کے معاشی تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لئے اس کے خلاف نبرد آزما ہو گیا۔ مگر ہم یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ انسانی معاشرے کے تمام

Marfat.com

انقلابات اور تمام جنگیں محض معاشی طبقاتی تقسیم" کی وجہ سے لڑی گئیں۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ قومی لڑائیاں طبقاتی تنازعات کی نسبت زیادہ تند و تیز زیادہ خون ریز اور انسانی مستقبل کے لئے زیادہ ضرر رساں تھیں۔ دورِ حاضر میں جبکہ مارکسی فلسفہ کے مطابق دنیا کے تمام انسان دو طبقوں میں بٹ گئے ہیں۔ جتنی لڑائیاں ہوئی ہیں ان میں قومی احساس اور ہم وطنی کے جذبات طبقاتی شعور سے زیادہ موثر ثابت ہوئے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم میں جرمنی کا مزدور طبقہ روس کے مزدور بھائیوں کے خلاف جنگ آزما ہو گیا۔ انگلستان کے سرمایہ دار طبقہ نے جرمنی کے سرمایہ داروں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا جب اسلام کا انقلاب آیا تو اس وقت عرب میں کوئی طبقاتی نزاع موجود نہ تھا۔ حضرت عثمانؓ انتہائی تونگر ہونے کے باوجود حضرت بلالؓ جیسے تہی دست کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر اپنے بھائی بندوں سے لڑے۔

انقلاب فرانس میں معاشی اسباب کے علاوہ کچھ اور اسباب بھی کارفرما تھے۔ اگر انقلاب فرانس کا واحد سبب طبقاتی تقسیم ہوتی تو فرانس سے زیادہ شدید انقلاب اس سے پہلے انگلستان میں آنا چاہیئے تھا اس لئے کہ وہاں صنعتی ترقی کی بنا پر طبقات کی جدید تقسیم نمایاں تر تھی مگر انگلستان کے انقلاب کو پُر امن ہونے کی بنا پر شاندار انقلاب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم میں کمیونسٹوں کے متفقہ فیصلے کے باوجود روس کے سوا کسی ملک کے اشتراکی لیڈروں نے اپنی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند نہ کیا جس سے عظیم لینن اور اس کے رفقاء سخت مایوس ہوئے۔ اس سے واضح ہوا کہ تاریخی جنگوں میں طبقاتی کشمکش سے زیادہ قومی تعصب یا دیگر عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔

Marfat.com

قدرِ زائد کا نظریہ

سوال ۵۱:۔ مارکسی فلسفہ میں "نظریہ قدرِ زائد" سے کیا مراد ہے؟ تفصیلاً واضح کیجئے۔

جواب:۔ مارکسی فلسفے کی پہلی کڑی "تاریخ کی مادی تعبیر" دوسری "طبقاتی کشمکش" اور تیسری "قدرِ زائد" (SURPLUS VALUE) کا نظریہ ہے۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ مارکس کے نزدیک کسی چیز کی اصلی قیمت وہ محنت ہے جو مزدور نے اس کے تیار کرنے میں انجام دی ہوتی ہے۔ چونکہ مزدور بیش قیمت مشینی آلات خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا اس لئے وہ مجبور ہے کہ کارخانہ دار کے دیئے ہوئے معاوضے کو قبول کرے۔ ایک چیز کی قیمت اصل میں مزدور کو دی جانے والی اجرت سے کہیں زیادہ ہوتی ہے اسے "قدرِ زائد" کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ مزدور کا حصہ ہے مگر کارخانہ دار اپنے سرمایہ اور قانون کی آڑ لے کر اس سے چھین لیتا ہے۔

بظاہر یہ نظریہ بڑا خوشنما نظر آتا ہے مگر حق کے ساتھ اس میں باطل کی آمیزش بھی کی گئی ہے۔

کسی چیز کی پیدائش میں صرف مزدور کی محنت ہی کام نہیں کرتی بلکہ مشینی آلات، ان آلات کو ایجاد کرنے والا دماغ، کارخانہ دار کا سرمایہ اور محنت وغیرہ سب شامل ہیں۔ بے شک مزدور کو اس کا حق پسینہ خشک ہونے سے پہلے ملنا چاہیئے مگر یہ بھی بعید از انصاف ہے کہ سب کچھ مزدور ہی کو مل جائے لہٰذا اہم بات یہ ہے کہ منافع کی تقسیم عادلانہ ہو نہ یہ کہ مزدور کو اس چیز کا

Marfat.com

مالک بنا دیا جائے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ مارکسی فلسفہ کا یہ نظریہ صرف ظاہری طور پر دلفریب اور پرکشش نظر آتا ہے مگر حقیقت میں مزدور کی بے جا حمایت اور طرفداری کی غمازی کرتا ہے۔

تصورِ ریاست

سوال ۵۲:۔ اشتمالیت کے "تصورِ ریاست" پر روشنی ڈالیئے؟

جواب :۔ مارکسی فلسفہ کی چوتھی بنیادی اینٹ اس کا "تصورِ ریاست" ہے۔ اس تصور کے اعتبار سے ریاست کی غرض صرف یہ ہے کہ وہ سرمایہ دار اور برسرِ اقتدار طبقہ کے مفادات کا تحفظ کرے اور جو مظالم وہ پسماندہ طبقہ پہ ڈھا رہے ہیں ان کی قانونی سند جواز عطا کرے۔ اس فلسفہ کی نگاہ میں ریاست کا مقصدِ وجود ہی یہ ہے کہ وہ برسرِ اقتدار طبقہ کے ہاتھ مضبوط کرتی رہے اور غریب طبقہ کے استحصال (EXPLIOTATION) کو قانونی حیثیت دے کر ان کے مفادات کو پامال کرتی رہے۔

یہ درست ہے کہ سرمایہ دار اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر سیاسی طاقت کو اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرنا چاہتا ہے اور بسا اوقات اس کی یہ آرزو بر آتی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ریاست بذاتِ خود کوئی بری چیز ہے کسی چیز کا غلط استعمال اور چیز ہے اور اس کا بذاتِ خود مذموم و معیوب ہونا چیزے دیگر۔ تاریخ عالم اس بات کی شاہدِ عادل ہے کہ دنیا میں ایسی ریاستیں بھی تھیں جن کو سرمایہ دار طبقہ اپنے مفاد کے لیے استعمال نہ کر سکا۔ اس سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ ریاست کا مقصدِ وجود تو عدل و انصاف کا قیام ہے مگر یہ انسان کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی خود غرضی کی بنا پر بعض اوقات اسے ظلم و تعدی کے لئے بھی استعمال کرتا ہے۔ اسلامی تاریخ کے اوراق اس بات کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ اسلامی ریاست برسرِ اقتدار طبقہ

Marfat.com

کے مفادات کے تحفظ کیلئے وجود پذیر نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کا اولین مقصد انسانی طبقات میں مساوات پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ خلیفۂ اوّل حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے پہلا خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا۔ "اور تم میں جو کمزور ہیں وہ میرے نزدیک طاقتور ہیں۔ یہاں تک کہ میں ان کا حق واپس دلا دوں۔ اور تم میں جو طاقتور ہیں وہ میرے نزدیک کمزور ہیں یہاں تک کہ میں ان سے دوسروں کا حق وصول نہ کر لوں۔"

خلافتِ راشدہ کا زریں دَور اشتمالی فلسفہ کے اس نظریہ کی تردید و تکذیب کیلئے کافی ہے کہ ریاست کا مقصدِ وجود ہی برسرِ اقتدار طبقہ کی حمایت اور کمزور طبقہ کے حقوق کی پامالی ہے۔

سوال ۵: اشتمالی طبقہ کی رُو سے کمیونزم کے مقاصد اور انہیں حاصل کرنے کے بنیادی ذرائع کونسے ہیں؟ یہ بھی بتائیے کہ یہ فلسفہ مقاصد کی تحصیل میں کس حد تک کامیاب ہوا ہے۔

جواب: قبل ازیں اشتمالی فلسفہ کے بنیادی تصورات بیان کئے گئے ہیں۔ ان تصورات پر اشتمالی تحریک کی جو عمارت استوار کی گئی اسکو اپنانے میں یہ دعوی کیا گیا ہے کہ دنیا کی ساری برکتیں اسی کو اپنانے سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ جو قوم بھی اسے قبول کریگی اسے دنیا میں جنت کی نعمتیں حاصل ہوں گی۔ اشتمالی تحریک کے قائدین کی نگاہ میں اسکے مقاصد حسب ذیل ہیں:-

۱۔ اس میں لوگ مختلف طبقات میں تقسیم نہیں ہونگے۔

۲۔ ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو ظلم و تعدی کا شکار نہیں بنا سکے گا۔

۳۔ معاشی عدل و انصاف کے باعث معاشرتی مساوات ختم ہو جائے گی۔

۴۔ ریاست جو ظلم و جبر کا سب سے بڑا ادارہ ہے ختم ہو جائیگا۔

اشتمالیت جن ذرائع سے ان مقاصد کو حاصل کرنا چاہتی تھی اس کے بنیادی اصول یہ ہیں:-

بنیادی ذرائع

۱۔ انفرادی ملکیت کا خاتمہ کر دیا جائے۔

۲۔ جماعت کو دولت اور ذرائع دولت پر مالکانہ حقوق حاصل ہوں گے۔

۳۔ دولت کی پیدائش اور تقسیم کا نظام جماعت کے ہاتھ میں ہو۔ اور اس

Marfat.com

کی جانب سے حکومت یہ کام انجام دے۔

تحصیلِ مقاصد میں اشتمالیت کی کامیابی یا ناکامی:- اشتمالیت نے جس جنتِ ارضی کے سہانے خواب دیکھے تھے وہ آج تک شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے نہ معاشی مساوات قائم ہو سکی اور نہ ریاست کا وجود ناپید ہو سکا۔ ہوا صرف یہ کہ ظالم سرمایہ داروں کی کرسی ظالم کمیونسٹ پارٹی نے سنبھال لی۔ جہدِ بسیار کے باوجود انفرادی ملکیت تاہنوز باقی ہے۔ طبقاتی تقسیم کو مٹانے کے لئے بے پناہ مظالم ڈھائے گئے تھے مگر عملی طور پر ایسا نہ ہو سکا۔ طبقاتی تقسیم کے مظاہر زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آتے ہیں۔ تنخواہوں میں مساوات قائم نہ ہو سکی۔ مختلف طبقات کے مشاہروں میں بہت فرق پایا جاتا ہے۔

انفرادی ملکیت کو ختم کرنے اور ذرائع پیداوار کو پارٹی کی ملکیت بنانے کے لئے جس قدر خون خرابے سے کام لیا گیا اس کا اندازہ بقول مسٹر جان ڈین ہرڈ کے یہ ہے کہ روس میں معاشرہ کے مختلف طبقوں کے لوگ مندرجہ ذیل تعداد میں قتل ہوئے۔

طبقات	مقتولوں کی تعداد
پادری	۳۱
چرچ کے خادم	۱۵۶۰
جج، وکیل اور مجسٹریٹ	۳۴۵۸۵
طالب علم اور استاد	۱۲۳۶۷
سول ڈیفنس کے افسر	۷۹۹۰۰
معززین اکرام کے لوگ	۶۵۸۹۰
فوجی افسر	۵۶۳۴۰
عام مزدور	۱۹۶۰۰۰

ملاح اور سپاہی ۳۶۰۰۰

کسان ۸۹۰۰۰

(بحوالہ ڈیلی گزٹ کراچی ۲۵ جون ۱۹۴۴ء)

ان اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ اشتمالیوں نے اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے جو مظالم روا رکھے وہ تاریخ کے انتہائی مظالم سے کہیں زیادہ سخت تھے اور چنگیز و ہلاکو کی ستم گری اس کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتی۔ اشتمالیت جن مقاصد کا دعویٰ لے کر اٹھی تھی۔ اگر وہ پورے ہو جاتے تو بھی یہ ظلم و تشدد گوارا کر لیا جاتا مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ ذرائع پیداوار کو حکومت کی تحویل میں دینا اصل مقصد نہ تھا بلکہ حصولِ نصب العین کا ایک ذریعہ تھا۔ اصل مقصد طبقاتی امتیاز کو مٹانا تھا وہ اب بھی باقی ہے۔ فرانس کا ایک اشتمالی مصنف لکھتا ہے۔

"روس میں طبقاتی تقسیم پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے۔ یہاں امراء و غرباء اور غالب و مغلوب سب موجود ہیں۔ ان کے معیار زندگی میں نمایاں فرق ہے۔ ریل کے ڈبوں، جہازوں اور ریستوران میں مختلف درجوں کا پایا جانا طبقاتی تقسیم کی بین دلیل ہے۔"

طبقاتی تقسیم کا اندازہ تنخواہوں کے اس تفاوت سے بھی ہوتا ہے جو روس میں ہر جگہ عام ہے۔ ایک عام مزدور کی زیادہ سے زیادہ تنخواہ ۴۰۰ روبل ماہانہ ہے جبکہ ایک منیجر کو ۳۰ ہزار روبل ماہانہ ملتے ہیں۔ تنخواہ میں اتنا نمایاں فرق دوسرے ممالک میں بھی نہیں ہے۔

اشتمالی لیڈر بڑے دعوے کے ساتھ روس کی قومی آمدنی میں اضافہ کے اعداد و شمار گناتے ہیں۔ مگر یہ نہیں سوچتے کہ اس اضافہ میں کتنے بے گناہوں کا خون شامل ہے۔ روس کے اکثر بڑے منصوبے جبری محنت کا نتیجہ ہیں۔ ایک مشہور کتاب "میں نے آزادی کا

Marfat.com

انتخاب کیا" کا مصنف جو پہلے اشتمالی خیالات رکھتا تھا لکھتا ہے۔

"ہماری صنعت کا سب سے بڑا سہارا قیدیوں کی ایک بہت بڑی فوج تھی جس میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سرکاری حلقوں کا بیان ہے کہ یہ فوج کروڑوں سے بھی زیادہ تھی۔"

یہ وہ لوگ تھے جن پر غداری وطن اور اشتمالیت دشمن ہونے کا شبہ تھا۔ ایسے افراد کو پکڑ کر سائبیریا بھیج دیا جاتا جہاں ان سے صبح چار بجے سے شام کے سات بجے تک کام لیا جاتا۔

اگر ان بیانات کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو قومی آمدنی میں اضافہ تو ہر جگہ ممکن ہے۔ اس کے لیے نہ اجتماعی ملکیت کی ضرورت ہے اور نہ جبر و تشدد کی۔ جاپان اور جرمنی نے اشتمالیت کے بغیر جو معاشی ترقی کی وہ اس کا بیّن ثبوت ہے۔

مغربی تہذیب کا مستقبل

سوال ۴۵ :۔ مغربی تہذیب کے محاسن و معائب قلمبند کیجیے اور بتائیے کہ اس کے مضرات سے بچنے کی کیا تدبیر ہے؟

جواب :۔ مغربی تہذیب کی برائیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر یہ تہذیب معائب و نقائص کے ساتھ ساتھ اپنے دامن میں چند خوبیاں بھی رکھتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی نظام شر محض کے بل بوتے پر نہ رائج ہو سکتا ہے نہ مقبول۔ دنیا میں خالص باطل کا تصور تو کیا جا سکتا ہے مگر اسے عملی زندگی میں نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس مادی تہذیب سے انسانیت کو حسب ذیل فوائد پہنچے ہیں۔

Marfat.com

۱- اس تہذیب نے عقل انسانی کو ایک فرسودہ اور کہن مذہب کے پنجے سے رہائی دلائی۔

۲- اس تہذیب نے انسانی عقل کو غور و فکر پر آمادہ کیا۔

۳- اس تہذیب نے دلوں سے جہالت کے پردے چاک کر کے انہیں تحصیل علم اور جہد و سعی پر ابھارا۔ اس طرح تعقّل و جمود کی جگہ حرکت و حرارت کے اصول کو انسانی زندگی کا رہبر بنایا اور قلب و نگاہ کی اس تبدیلی سے پوری زندگی کو متاثر کیا۔

جدید تہذیب کے معائب:۔

تہذیب جدید نے انسانیت کو جو فوائد پہنچائے تھے اس سے کہیں زیادہ نقصان پہنچایا۔ اہل یورپ نے عقل پر سے مذہب کی جو پابندی اٹھائی تھی اس نے عقل انسانی کو شتر بے مہار بنا دیا۔ دنیا میں آج جس قدر فکری اور عملی بے راہروی پائی جاتی ہے وہ سب عقل کی اسی بے لگامی کا نتیجہ ہے۔ انسان یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ مادی سر و سامان کی فراوانی کے باوجود انسان سکون و اطمینان کی دولت سے کیوں محروم ہے۔ غلہ کثرت سے پیدا ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود نوع انسانی بھوک کا شکار ہے۔ سائنس نے مناظر قدرت کو مسخر کر لیا ہے مگر انسان کو سکون آشنا نہیں کیا۔ انسان قتل و غارت کو پسند نہیں کرتا لیکن خود اپنے ہاتھوں تیار کردہ آلات جنگ سے کروڑوں انسانوں کو لقمۂ اجل بنا دیتا ہے عقل یہ دیکھ کر حیران ہے کہ اس کی منزل جو اسے قریب دکھائی دیتی تھی ہنوز اس سے بہت دور ہے۔ انسان آج بھی مظلوم ہے۔ عدل و انصاف کی حقیقت ایک سراب سے زیادہ نہیں۔ دھوکہ و فریب کی گرم بازاری ہے۔ لوٹ کھسوٹ اور ظلم و استبداد کی فراوانی ہے۔ یہ درست ہے کہ آج کے انسان نے مناظر فطرت کو

Marfat.com

مسخر کر لیا۔ بحر و بر پر قابو پا لیا۔ ملکوں اور شہروں کے ڈانڈے ملا دیئے۔ مگر ان چیزوں میں سے کوئی بھی بذاتِ خود مطلوب نہیں۔ یہ سب چیزیں امن و سکون اور طمانیت قلب کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ جب اس مقصد کو پورا کرنے میں ناکام رہیں تو سب بے کار ہیں۔

جدید تہذیب کے ہولناک نتائج دیکھ کر خود اہل مغرب بھی پریشان ہیں۔ مشہور ماہر عمرانیات پروفیسر سارو کن اپنی مشہور کتاب "ہمارے زمانے کا بحران" (THE CRISIS OF OUR AGE) میں لکھتے ہیں۔

"بدیہی شہادتوں کے پیش نظر مجھے اس بات کا پوری طرح اطمینان ہو گیا ہے کہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ ہماری تنظیم اور ہماری سوسائٹی ایک زبردست بحران سے گذر رہے ہیں۔ جسم کا کوئی حصہ قلب و دماغ کا کوئی ریشہ ایسا نہیں جو صحیح طور پر کام کر رہا ہو۔ ہمارے سارے بدن میں ناسور ہیں۔"

تاریخ کے مشہور عالم پروفیسر آرنلڈ جے۔ ٹائن بی تہذیب جدید پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جدید انسان کا حال جوئے کے اس کھلاڑی کا سا ہے جس نے اپنا داؤ بڑھاتے بڑھاتے یہاں تک پہنچا دیا کہ اس کی معاش اور اس کی زندگی سب بساط پر رکھے ہیں۔ بڑا خطرناک مرحلہ ہے۔ وہ بازی لگانا چاہتا ہے لیکن اسے اپنے پتوں اور اپنے ہنر پر بھروسہ نہیں جن کے بل پر اس کی کامیابی ہو۔"

وہ آگے چل کر مزید لکھتے ہیں۔

"اپنے مسائل کو خالص مادی تدابیر سے حل کرنے کی تمام مساعی ناکام ہو چکی ہیں ہمارے تمام بلند بانگ دعوے محض مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔ اپنی معاشرتی بیماریوں کو خدا کے بغیر حل کرنے کے نتائج ہمارے سامنے آ چکے ہیں۔ دور حاضر کی سب سے

بڑی ضرورت ایک فوق الطبعی ایمان کا احیاء ہے۔"

صرف دین اسلام ہی قابلِ قبول ہے:۔

تاریخ عالم کے فاضل یگانہ پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی نے فوق الطبعی ایمان کی ضرورت و اہمیت کا جو اعتراف کیا ہے یہ ان کی منفرد رائے نہیں بلکہ یہ وہ رجحان ہے جو یورپ میں تیزی سے پھیل رہا ہے۔ کوئی کتاب کسی رسالہ کے اوراق اس حقیقت کے ذکر و بیان سے خالی نہیں ہیں۔ اس دور میں انسانی مذہب کی ضرورت کو شدت سے محسوس کر رہا ہے۔ لیکن دورِ حاضر کا سائنٹیفک ذہن صرف اسی مذہب کو قبول کر سکتا ہے جو عقل انسانی کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ جو غیر فطری عبادات و اعمال کا تقاضا نہ کرتا ہو۔ جو وہم و تعصب کی پیداوار نہ ہو۔ حق یہ ہے کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اس کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔ بدھ مت کی حیثیت ایک ضابطۂ اخلاق سے زیادہ نہیں۔ ہندو مذہب مجموعۂ توہمات ہونے کے علاوہ انسان کو آواگون کے غیر عقلی چکر میں گرفتار کر دیتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ دونوں مذہب مواعظ و نصائح سے آگے بڑھ کر انسانی زندگی کا کوئی عملی نظام پیش نہیں کرتے عیسائیت نے تو خود دین و دنیا اور مذہب و سیاست کی دوئی کو قبول کر لیا ہے یہودیت ایک نسلی مذہب ہے اور بس۔

خلاصہ یہ کہ انسانیت کی فوز و فلاح صرف اسلامی نظام حیات کو اپنانے میں مضمر ہے۔ اسلام در اصل وقت کی پکار ہے۔ دورِ حاضر کے امراض کا علاج ہے۔ پریشان انسانیت کے لئے وجہ سکون ہے۔ اصلی اور ابدی مسرت کا پیغام ہے۔ اب مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنی سیرت و کردار کو اسلامی سانچہ میں ڈھالے۔ تمام شعبہ ہائے حیات کو اسلامی نظام زندگی کے تابع رکھ کر امامت اقوام کا منصب حاصل کرلے۔ مگر وہ ایسا کر سکا تو کائنات کی سب

Marfat.com

تو تیں اس کارِ خیر میں اس کی رفیق ہوں گی اور اسے پکار پکار کر کہیں گی :-

۵- اٹھ کہ خورشید کا سامانِ سفر تازہ کریں
نفسِ سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

حصہ سوم

اسلام کا نظام حیات

نوٹ:- حصہ دوم پنجاب یونیورسٹی کے مقرر کردہ نصاب برائے بی اے سے خارج ہے
نیز حصہ سوم کے صرف ابواب ۱۳، ۱۷، ۱۸ اور ۱۹ شامل نصاب ہیں۔

Marfat.com

اسلامی نظامِ حیات

تعارف

سوال ۵۵: اسلام میں فرد اور جماعت کے درمیان کس قسم کا ربط و تعلق پایا جاتا ہے؟

جواب: اسلام کا مقصد نفس انسانی کی اصلاح ہے وہ انسان کو اس کے صحیح مقام سے روشناس کرتا ہے اللہ اور رسول اور یوم آخرت پر ایمان کے ذریعہ کائنات اور اس کی حقیقتوں اور زندگی اور اس کے مقاصد سے انسان کا رشتہ صحیح بنیادوں پر استوار کرتا ہے توحید رسالت اور آخرت وہ بنیادیں ہیں جن پر اسلام کا پورا نظام قائم ہے۔ اسلامی زندگی کا ہر پہلو انہی بنیادوں سے وابستہ ہے۔

اسلام نے فرد اور جماعت دونوں کے حقوق و فرائض متعین کئے ہیں۔ ان حقوق و فرائض کو شریعت کی زبان میں حقوق العباد کہتے ہیں۔ یہ حقوق و فرائض کئی طرح کے ہیں مثلاً ایک فرد کا دوسرے فرد سے تعلق۔ فرد اور معاشرے کے باہمی روابط ان انفرادی و اجتماعی مسائل و حقوق کے لئے دین اسلام میں ایک جامع قانون موجود ہے۔ اسلام نے حقوق العباد کو خصوصی اہمیت دی ہے اور اسے حقوق اللہ سے بھی مقدم ٹھہرایا ہے دین اسلام میں حقوق العباد اور باہمی معاملات سے متعلق تفصیلی احکام ملتے ہیں۔ باہمی معاملات کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس سے دین حق نے خاموشی اختیار کی ہو یا اس کے بارے میں ناقص ہدایات دی ہوں۔

انسان اپنی خلقت کے اعتبار سے مدنی الطبع واقع ہوا ہے۔ مہد سے لحد تک اسے

Marfat.com

انسانوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہ اس دنیا میں آتا ہے تو دو انسانوں کے اجتماعی تعلق سے۔ ایک خاندان میں آنکھیں کھولتا ہے۔ اور تربیت کے مراحل طے کرکے پروان چڑھتا ہے۔ احباب میں بیٹھتا اٹھتا اور ہر طرف سیر و گردش کرتا ہے۔ ہر قدم پہ دوسرے انسانوں سے ملتا جلتا ہے۔ تعلیم ہو یا معاش ہر میدان میں اسے معاشرہ اور ریاست کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی پوری زندگی انسانوں کے ساتھ ملتے جلتے اور لین دین کرتے گذر جاتی ہے۔

اسلام انفرادی اور اجتماعی مسائل کو اخلاقی نقطۂ نگاہ سے حل کرنا چاہتا ہے۔ وہ فرد کو کامل آزادی دیتا ہے۔ لیکن جب یہ آزادی دوسروں کے حقوق پر اثر انداز ہوتی ہے یا اس سے نظم جماعت کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے تو وہ فرد پر پابندیاں عائد کرتا ہے۔ بے شک حکومت ان حدود و قیود کو نافذ کرنے میں مدد دیتی ہے لیکن اسلام حکومت کی طاقت کو استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی ایمانی و اخلاقی حس کو بھی بیدار کرتا جاتا ہے تاکہ مجبور و محکوم ہونے کے بجائے افراد بخوشی خاطر اسلامی قوانین کو خوش آمدید کہیں۔ اسلامی قوانین فرد اور جماعت دونوں کی عزت و آبرو اور امن و آسائش کے کفیل ہیں۔ اسلامی معاملات کی اصل و اساس احترام انسانیت ہے جس میں عدل و مساوات کی روح کارفرما ہے۔

دین اسلام ایک کامل نظام زندگی ہے جس میں فرد اور جماعت کے جملہ مسائل کا حل موجود ہے۔ یہ عائلی مسائل کی تفصیلات بھی بیان کرتا ہے اور معاشرتی گتھیوں کو بھی سلجھاتا ہے۔ معاشی مسائل ہوں یا سیاسی کوئی بھی اس کے دائرہ کار سے خارج نہیں۔ لیکن ان سب میں اس کا مخصوص زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ تمام معاملات خدا کی اطاعت، اخلاقی اصولوں کی برتری، احترام انسانیت اور دوسروں کے حقوق کی نگہبانی کی روشنی میں طے ہوں۔ اسلام جملہ شعبہ ہائے حیات کے لئے بنیادی اور اصولی تعلیم

دیتا اور ایسی حدود قائم کرتا ہے جن کو کسی قیمت پر بھی توڑا نہیں جاسکتا۔ بنیادی اصولوں کے تعین اور حدود کے تقرر کے بعد وہ انسان کو آزادی دیتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص حالات کے مطابق اپنی راہ متعین کرے۔ اسلام میں ارتقاء کے مواقع موجود ہیں اور خدا کی اطاعت کی حدود میں رہتے ہوئے انسان ترقی کی ہر منزل کو چھو سکتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دین اسلام جمیع شعبہ ہائے حیات کے لئے احکام و ضوابط دیتا ہے اور انفرادی یا اجتماعی زندگی کا کوئی گوشہ اس کی نگاہ سے پنہاں نہیں ہے۔ اس پر مزید یہ کہ اسلامی قوانین ترقی کی راہ میں حائل نہیں ہوتے اور ایک انسان اطاعت خداوندی کی حدود میں رہ کر دنیوی ترقی کی سب منزلیں طے کر سکتا ہے۔

سوال ۵۶: لفظ شریعت کی تشریح کیجئے نیز بتائیے کہ اسلامی شریعت کے مصادر و مآخذ کیا ہیں؟

جواب: اسلامی نظام زندگی کو پوری طرح سمجھنے کے لئے اسلامی شریعت کے مآخذ و مصادر کا جاننا ضروری ہے۔ اسلام زندگی کا جو لائحہ عمل متعین کرتا ہے وہ صرف انسانی عقل و تجربہ پر مبنی نہیں بلکہ براہ راست خدا کی کتاب اور حدیث نبوی سے ماخوذ و مستفاد ہے۔ چونکہ اسلامی نظام زندگی کی نمایاں ترین خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بنیاد وحی الٰہی پر رکھی گئی ہے اس لئے نظام زندگی کی تفصیلات بیان کرنے سے قبل اسلامی شریعت کی حقیقت کو سمجھنا اور تفصیلاً یہ جاننا ضروری ہے کہ ہدایت کے جن سرچشموں سے ہم روشنی حاصل کرتے ہیں وہ کس حد تک قابل اعتماد ہیں۔

مصادر و مآخذ

۱۔ قرآن کریم:

۲: حدیث نبوی۔

۳: اجماع امت۔

۴: اجتہاد یا قیاس۔

شریعت کا مفہوم: لفظ شریعت (شِرْعَۃً اور شَرْعٌ) کے لغوی معنی کھلے ہوئے، روشن، سیدھے اور صاف راستہ کے ہیں۔

مذہبی اصطلاح میں شریعت سے وہ قوانین و احکام مراد ہوتے ہیں جو ایک رسول، اللہ تعالیٰ کی اطاعت اُس کی بندگی اور فرماں برداری کے لئے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے۔ ان احکام و قوانین میں باہمی معاملات، لین دین، نکاح و طلاق، خرید و فروخت حلال و حرام اور لوگوں کے حقوق و فرائض سب شامل ہوتے ہیں۔ اسلام نے ہمیں بتایا کہ دین، یعنی نظام زندگی تو ہر پیغمبر کے زمانہ میں ایک ہی رہا، لیکن تغیراتِ زمانہ کے پیش نظر شریعت (قوانین و احکام) بدل جایا کرتی تھی۔ دین کے متعلق فرمایا:-

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ — دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے

شریعت کے متعلق ارشاد ہوا

لِکُلٍّ جَعَلْنَا مِنْکُمْ شِرْعَۃً وَّمِنْهَاجًا — تم میں سے ہر ایک کے لئے ہم نے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی۔

ان آیات سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ دین ایک ناقابل تغیر چیز ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں اور مختلف قوموں کے حالات کے مطابق اپنے رسولوں کے اندر مختلف شریعتیں بھیجی تھیں۔ ہر نبی اپنی اپنی قوم کو الگ الگ تہذیب و اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ ایک ہی زمانہ میں متعدد انبیاء جداگانہ علاقوں میں دعوت و ارشاد کا فریضہ ادا کرتے رہے۔ جب انبیاء کی تبلیغ سے انسانی شعور میں پختگی و بیداری کے آثار نمودار ہوئے جغرافیائی حدود کے کم ہو جانے سے کائناتِ ارضی کے ڈانڈے مل گئے اور ساری دنیا

Marfat.com

ایک آبادی بن گئی تو اللہ تعالیٰ نے خاتم الرسل والانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری دنیا کے لئے رسول بنا کر مبعوث فرمایا۔ آپ وہ نظام زندگی لائے جو تمام بنی نوع انسان کے مزاج اور حالات و ضروریات سے بالکل ہم آہنگ ہے۔ اب انہی کی اطاعت سے خدا کی رضا حاصل ممکن ہے۔

بنابریں سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام بلاشبہ اسی دین کے داعی تھے جس کی تبلیغ حضرت آدمؑ اور دیگر رسل و انبیاء نے کی تھی۔ البتہ پرانی شریعتیں مرور زمانہ سے اس قابل نہ رہیں کہ دور حاضر کے تقاضوں کے ساتھ چل سکیں اس لئے منسوخ قرار پائیں اور ان کی جگہ ایسی شریعت نے لی جس میں رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لئے عبادت کے طریقے، معاشرت کے اصول اور باہمی معاملات کے قوانین یکساں ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شریعت وہ الٰہی قانون ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ انسانوں تک پہنچا ہے۔ علمائے کرام نے شریعت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:۔

"القانون الالٰهی الثابت من النبی صلی اللہ علیہ وسلم لتقویم العقائد والاعمال وتهذیب الاخلاق وتدبیر المنزل وسیاسة المدن"	شریعت خدا کا وہ قانون ہے جو عقائد و اعمال کی درستی اخلاقی اصلاح خانگی زندگی اور ملکی سیاست کو سنوارنے کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوتا ہے

شریعت کا مقصد اور ہمہ گیری

سوال ۵۷: مسلم معاشرہ کی تشکیل کے اصول و قواعد بیان کیجئے اور بتائیے کہ اسلامی شریعت کا مقصد کیا ہے؟

جواب: مسلم معاشرہ کی تشکیل

Marfat.com

اسلام کے لفظی معنی ہیں گردن جھکانا، سرنیاز خم کر دینا۔ جو شخص اطاعت کا فعل انجام دیتا ہے وہ مسلم کہلاتا ہے۔ اسی طرح جو معاشرہ بخوشی خاطر اپنی زندگی کے تمام امور میں خداوندی احکام پر عامل ہونا اور رضائے الٰہی کو اپنی پسند و ناپسند کا معیار ٹھہراتا ہے اسے مسلم معاشرہ کہتے ہیں۔ مسلم معاشرہ کے افراد تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ کو حاکم اعلیٰ تسلیم کرتے اور زندگی کے مسائل کو اس کی دی ہوئی روشنی و ہدایت میں طے کرتے ہیں۔ اطاعت خداوندی ایسے تمام لوگوں کو ایک شیرازہ میں منسلک کر دیتی ہے اور ان کے اجتماع سے ایک مسلم معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ مسلم معاشرہ کی عظیم خصوصیت جو اسے دوسرے معاشروں سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ یہ معاشرہ اپنے ارادہ و اختیار سے احکام خداوندی کو اپناتا ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ معاشرہ ایک معاہدہ کی بنا پر معرض ظہور میں آتا ہے جو خدا اور بندوں کے درمیان وقوع پذیر ہوتا ہے۔ بندے اس معاہدہ میں یہ طے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کا حاکم مطلق ہے۔ اس کی رہنمائی ان کے لئے ایک واجب الاطاعت قانون کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کے نزدیک اچھی بات وہی ہے جسے خدا تعالیٰ اچھا کہے اور بری چیز وہ ہے جو خدا کے نزدیک بری ہو۔ صحیح و غلط اور جائز و ناجائز کی پہچان کے لئے اصل کسوٹی خدا کا قانون ہے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو دنیا کے کسی معاشرہ میں نہیں پائی جاتیں خواہ اس کے دعاوی کتنے ہی بلند کیوں نہ ہوں۔ خالق و مخلوق کے اس معاہدہ کی اساس پر جو سوسائٹی تشکیل پاتی ہے وہ اقرار کرتی ہے کہ تمام شعبہ ہائے حیات کو دین حق کے تابع کرے گی۔ اس کے لئے کتاب الٰہی اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم بنیادی قانون کی حیثیت رکھتے ہیں قرآن و حدیث کے بیان کردہ ضابطۂ حیات کو "شریعت" کہا جاتا ہے۔ مسلم معاشرہ اپنے اقرار کی بنا پر معاملات زندگی کو اس اسکیم کے مطابق چلانے کا پابند ہوتا ہے۔

اسلامی شریعت کا مقصد: ہر نبی کے زمانہ میں جو شریعت بھی تھی اس کا مقصد "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" تھا۔ بعثت محمدیہ کا مقصد وجود بھی اس کے سوا کچھ نہیں۔ قرآن پاک میں فرمایا:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ؕ

تم بہترین جماعت ہو جس کو لوگوں کے نفع کے لئے معرض وجود میں لایا گیا ہے تم نیکیوں کا حکم دیتے اور برائیوں سے روکتے ہو۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَوٰةَ وَآتَوُا الزَّكَوٰةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ ؕ

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین پر اقتدار عطا کریں تو نماز قائم کریں گے زکوٰۃ ادا کریں گے، نیکیوں کا حکم دیں گے اور برائیوں سے منع کریں گے

ان آیات سے مستفاد ہوتا ہے کہ اسلام کا مقصد نیکیوں کا پھیلانا اور برائیوں کا مٹانا ہے۔

امر بالمعروف: معروف کے معنی ہیں پہچانی ہوئی چیز یعنی وہ چیز کہ شریعت یا انسانی فطرت جس کو نیکی کی حیثیت سے جانتی پہچانتی ہے۔ معروفات سے مراد وہ نیکیاں خوبیاں اور بھلائیاں ہیں جو انسانی فطرت کو بھلی لگتی ہیں اور جن کو انسانی فطرت ہمیشہ سے بھلائی کی حیثیت سے جانتی ہے۔ شریعت انہی چیزوں کو بھلائی قرار دیتی ہے جو خدا کی بنائی ہوئی فطرت کے مطابق ہیں اور انہی چیزوں کو برائی قرار دیتی ہے جو فطرت سے موافقت نہیں رکھتیں۔

نہی عن المنکر: منکر اجنبی، بے گانہ اور بے پہچان چیز کو کہتے ہیں منکرات

سے مراد وہ امور و اشیاء ہیں جن کو انسانی فطرت اور دین اسلام نیکی ہونے کی حیثیت سے نہیں پہچانتے۔ یہ وہ برائیاں ہیں جن کو ہمیشہ سے انسانیت کا ضمیر نفرت کی نگاہ سے دیکھتا رہا ہے اور انسانی فطرت نے انہیں کبھی بنظر استحسان نہیں دیکھا۔

شریعت کا مقصد یہ ہے کہ معاشرہ کی بنیاد معروف پر قائم کی جائے اور امکانی حد تک منکرات کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام بھلائیوں کے ساتھ ساتھ ان اسباب و وسائل کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے جن سے نیکیاں پروان چڑھ سکیں اور ان امور سے باز رکھتا ہے جو بھلائیوں کے پھلنے پھولنے میں سدّ راہ ہوتے ہوں۔ اس طرح نیکیوں کے ساتھ ان کے وسائل بھی نیکیوں میں شمار ہوتے ہیں اور ان کے موانع کو منکرات کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے۔ منکرات کا بھی یہی حال ہے۔ جو چیزیں کسی منکر کو فروغ دیتی ہیں یا اس کے وقوع و ظہور یا نشوونما کا ذریعہ ہیں وہ منکرات میں داخل ہیں۔ دین اسلام یہ چاہتا ہے کہ منکر کا کلّی انسداد ہو۔ اس کی پیدائش و افزائش کے اسباب کو روکا جائے۔ اور اگر کسی چیز نے پیدا ہو جائے تو سختی کے ساتھ اس کا مکمل استیصال کر دیا جائے۔

سوال ۵۸: معروف و منکر کی اقسام بیان کیجئے۔

جواب: اسلامی شریعت میں معروف کی تین قسمیں ہیں۔

معروف کی اقسام: ۱: فرض یا واجب۔

فرض یا واجب وہ حکم ہے جس کی تعمیل مسلم معاشرہ پر لازم ہو اور اس کے متعلق شریعت میں صاف اور قطعی احکام پائے جاتے ہوں۔

۲: مندوب یا مستحب

مندوب یا مستحب اس معروف (نیک) کام کو کہتے ہیں جو شریعت میں پسندیدہ خیال کیا جاتا ہو اور شریعت اسے جاری کرنا چاہتی ہو۔ اس قسم کے بعض احکام شارع صریح الفاظ میں دیتا ہے اور بعض جگہ صرف اشارہ پر اکتفا کرتا ہے۔ اس قسم کے بعض کاموں کا عملاً انتظام کیا جاتا ہے اور بعض کی صرف ترغیب دلائی جاتی ہے تاکہ معاشرہ کے صالح لوگ ایسے کاموں کی طرف متوجہ ہوں۔ ایسے کام اگرچہ فرض یا واجب نہیں ہوتے تاہم یہ اپنے دامن میں لاتعداد مصالح اور فوائد رکھتے ہیں۔ بنابریں شریعت ان کے وقوع یا قیام کو پسند کرتی ہے۔

۳: مباح

دینی اصطلاح میں ہر وہ چیز جس سے منع نہیں کیا گیا مباح ہے۔ یعنی اس کے انجام دینے میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ صراحتہً اس کی اجازت دی گئی ہو بلکہ کسی چیز کے بارے میں مخالفت یا حرمت کا نہ ہونا ہی اس کے مباح ہونے کی دلیل ہے۔ بنابریں دنیا میں مباح چیزوں کی بڑی کثرت ہے۔ ممنوعات جو بہت قلیل ہیں ان کو چھوڑ کر سب کچھ مباح ہے۔ مباحات کے دائرہ میں شریعت نے ہمیں آزادی دی ہے کہ ہم اپنی ضروریات کے مطابق اجتہاد سے کام لے کر قوانین و ضوابط بنالیں۔

منکر کی اقسام: منکرات کی شرعاً دو قسمیں ہیں۔

۱: حرام

جس چیز سے پرہیز کرنا شرعاً ضروری ہو اسے حرام کہتے ہیں۔ یہ فرض عین کی ضد ہے۔ حرام کی قطعی مخالفت شریعت میں صراحتہً مذکور ہوتی ہے۔ ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں حرام سے کنارہ کش رہے۔ اسلام میں محرمات و ممنوعات کی فہرست زیادہ طویل نہیں ہے۔

Marfat.com

۲ : مکروہ

مکروہ وہ چیزیں ہیں جن کو شرعاً ناپسندیدہ تصور کیا جاتا ہے۔ ناپسندیدگی کا اظہار شارع کبھی صراحتہً کرتا ہے اور کبھی اشارۃً۔ مکروہ کے دو درجے ہیں۔

۱ : مکروہ تحریمی : یہ اگرچہ مکروہ ہوتا ہے مگر اس کی کراہت حرمت کی قریبی سرحد کو جا چھوتی ہے۔

۲ : مکروہ تنزیہی : یہ وہ مکروہ ہے جس کی شدت پہلی قسم سے کم ہوتی ہے۔ تاہم اس کے شرعاً ناپسندیدہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوتا اور شریعت کا مطالبہ یہی ہوتا ہے کہ اس سے اجتناب بہرحال افضل ہے۔

اسلامی احکام کی ہمہ گیری : اسلامی احکام اس قدر جامع اور ہمہ گیر ہیں کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ ان کی گرفت سے آزاد نہیں ہے۔ معروف و منکر، فرائض و محرکات اور مکروہات و مستحبات کی تقسیم زندگی کے جملہ افعال و اعمال میں جاری ہے۔ عبادات و معاملات، سیرت و کردار، اخلاق و عادات، آداب طعام و لباس، خانگی و خاندانی زندگی، معاشی حالات و معاشرتی تعلقات، حکومت و سیاست اور صلح و جنگ کے اصول غرض زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس کے متعلق شریعت نے نیکی اور بدی کے طریقے بھلائی اور برائی کے راستے اور حلال و حرام کے اختیارات ہم پر واضح نہ کر دیے ہوں۔ شریعت ہمیں صاف صاف بتاتی ہے کہ کون سی نیکیاں ایسی ہیں جن کی نشو و نما ہمارے لئے از بس ناگزیر ہے۔ اور کون سی برائیاں اس اندازہ کی ہیں کہ انکے استیصال ہی سے معاشرہ کی اصلاح ممکن ہے۔ اسلام نے زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ بحیثیت مجموعی ایک ایسی وحدت ہے جسکا کوئی جزو نہ خارج کیا جا سکتا ہے نہ باہر سے کسی نئے جزو کے گھس آنے کی گنجائش ہے

قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے۔

Marfat.com

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ط

اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے آؤ۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جمیع شعبہ ہائے حیات کو اسلامی نظام حیات کے سانچے میں ڈھالو اور یوں نہ کرو کہ اس کے کچھ گوشے تو اسلامی حدود کے اندر رہیں اور کچھ اس سے خارج رہیں۔

اسلامی شریعت کے ماخذ

سوال ۵۹: اسلامی شریعت، فقہ اور اصولِ فقہ میں کیا فرق ہے؟

جواب:

شریعت

شریعت ان احکام و اصول کو کہتے ہیں جو ایک رسول یا نبی اللہ تعالیٰ کی طرف سے لا کر بندوں کو دیتا ہے اور ان سے ان کی اطاعت کا تقاضا کرتا ہے۔ اس سے ایک رسول اور امام و مجتہد کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ بنابریں شریعت محمدی یا شریعت موسوی کہنا اس اعتبار سے ہی درست ہے کہ اس شریعت کے لانے والے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔

فقہ: لفظ فقہ عربی زبان میں فَقِہَ یَفْقَہُ کا مصدر ہے۔ اس کے معنی سمجھ سوچ اور فہم و شعور کے ہیں۔ فقہ کی اصطلاحی تعریف یہ ہے۔ "حِکْمَۃٌ شَرْعِیَّۃٌ عَمَلِیَّۃٌ" یعنی فقہ اس علم کا نام ہے جس کا تعلق شرعی احکام سے ہوتا ہے۔ یہ احکام فروعی یعنی اصولی احکام کی فروع یعنی شاخ سے ماخوذ و متفرع ہوتے ہیں۔ یہ سب احکام عملی ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علم فقہ کا عقائد سے کوئی تعلق نہیں۔ اس میں صرف وہی احکام بیان کئے جاتے ہیں۔ جو عمل سے وابستہ ہوتے ہیں۔

Marfat.com

اس سے شریعت اور فقہ کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ علم فقہ میں جن احکام سے بحث ہوتی ہے وہ خود شارع کے صادر کردہ اور شریعت سے ماخوذ ہوتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ فقہ کے دائرہ میں صرف وہ امور آتے ہیں جو فرعی و عملی ہوتے ہیں بخلاف ازیں شریعت کا دامن عقائد و اعمال دونوں کے لئے کھلا ہے لہذا اس میں عقائد و اعمال دونوں شامل ہوتے ہیں۔

فقہ اور شریعت کا یہ فرق اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب ان کو ایک دوسرے کے مقابلہ میں استعمال کیا جائے اس فرق کو نظر انداز کر کے بعض اوقات مجازاً دونوں کو ایک ہی معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً جب ہم کہتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ کے مآخذ چار ہیں۔ تو شریعت سے مراد یہاں فقہ ہے اور اسکا مطلب یہ ہے کہ فقہ اسلامی کے مآخذ چار ہیں۔ عام گفتگو میں یہ فرق و امتیاز کم ہی ملحوظ رکھا جاتا ہے اس لئے شریعت کا لفظ بول کر فقہ اسلامی مراد لی جاتی ہے اور فقہ کا لفظ شریعت کی جگہ استعمال کیا جاتا ہے اصل استعمال کے لحاظ سے شریعت فقہ اور اصول فقہ کے الفاظ جداگانہ مفہوم رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے مترادف نہیں ہیں۔

اصول فقہ: اصول فقہ کی اصطلاحی تعریف حسب ذیل ہے۔

"عِلْمٌ بِقَوَاعِدَ يُتَوَسَّلُ بِهَا إِلَى كَيْفِيَّةِ اسْتِنْبَاطِ الْمَسَائِلِ عَنْ دَلَائِلِهَا التَّفْصِيلِيَّةِ"

یعنی اصول فقہ سے ان قواعد و ضوابط کا علم مراد ہے جن کے ذریعہ مسائل کو ان کے تفصیلی دلائل سے نکالا جاتا ہے۔"

مندرجہ بالا تعریف سے فقہ اور اصول فقہ کا فرق و امتیاز بھی نکھر کر سامنے آجاتا ہے علم فقہ گویا فرعی و عملی احکام کا مجموعہ ہوتا ہے۔ یہ احکام اصول شریعت سے ماخوذ و متفرع ہوتے ہیں۔ علم اصول فقہ میں وہ قواعد بیان کئے جاتے ہیں جن کی رو سے فقہی

Marfat.com

احکام کو شرعی اصولوں سے بذریعہ قیاس و اجتہاد استنباط (نکالا جاتا) کیا جاتا ہے اس اعتبار سے علم فقہ شرعی احکام کا جامع ہے اور اصول فقہ قواعد استنباط کو شامل ہے

ماخذ اول ــــــ الکتاب

سوال نمبر ۶ : اسلامی قانون میں قرآن کریم کو کیا مقام حاصل ہے ؟ دلائل کی روشنی میں بیان کیجئے

جواب : قرآن کریم اسلامی قانون کا اولین سرچشمہ اور ماخذ اساسی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے اور اس میں مندرج احکام و فرامین بندوں کے لئے لازم التعمیل ہیں۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات پر اس حقیقت کو بار بار بیان کیا گیا ہے کہ یہ خدا کی نازل کردہ کتاب ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کتاب کا آسمانی ہونا ہی اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کے مندرجات حق و صداقت کے آئینہ دار ہیں اور اس میں کوئی ایسی بات شامل نہیں ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش ہو۔

قرآن کریم اور دیگر کتب میں بنیادی فرق یہی ہے کہ ان کتب کے معتقدین ان کے آسمانی و الہامی ہونے کے دعویدار ہیں مگر یہ کتاب ناطق آگے بڑھ کر خود یہ دعویٰ کرتی ہے کہ

تَنْزِيْلُ الْكِتَابِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعَالَمِيْنَ" — بلاشبہ یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے ۔

(السجدہ ـ ۲)

ارشاد ہوتا ہے۔

كِتَابٌ اَنْزَلْنَاهُ اِلَيْكَ مُبَارَكٌ — یہ بابرکت کتاب ہے جسے ہم نے آپ

لِيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ (ص — ۳)
کی طرف اتارا تاکہ اس کی آیات میں غور و فکر کریں۔

نیز فرمایا:

تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى (طٰہٰ — ۴)
یہ کتاب زمین و آسمان کے خالق کی نازل کردہ ہے۔

قرآن کریم اسلامی قانون کا مصدر اول ہے۔ اس میں شریعت کے بنیادی اصول و عقائد بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب کرہ ارضی پر بسنے والے تمام افراد کے لئے پیغام ہدایت ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ (الاعراف — ۲۴)
آپ فرما دیں کہ میں تو اسی چیز کی پیروی کرتا ہوں جو میرے رب کی طرف سے مجھ پر نازل کی گئی ہے۔ یہ تمہارے رب کی طرف سے ہدایات ہیں اور اس میں ایمانداروں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ (الزخرف — ۴۴)
اور بے شک یہ قرآن تیرے اور تیری قوم کے لئے نصیحت ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (النساء — ۱۰۵)
بے شک ہم نے آپ پر یہ کتاب حق کے ساتھ اتاری تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس طرح فیصلہ کریں جیسے اللہ آپ کو دکھلائے

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ
بے شک یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل

Marfat.com

اَقْوَمُ (بنی اسرائیل - ۹)
سیدھی ہے۔

"فَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ" (الاعراف - ۵۲)

بے شک ہم ان کے پاس ایک ایسی کتاب لائے ہیں جس کو ہم نے علم و بصیرت کی بنا پر ایماندار لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت بنا کر بھیجا ہے اور تفصیلاً بیان کیا ہے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ (النحل - ۶۴)

اور ہم نے آپ پر یہ کتاب اس لئے اتاری ہے تاکہ آپ ان کے لئے وہ چیز واضح کر دیں جس میں انہوں نے اختلاف کیا ہے

اسلامی قانون کے اعتبار سے قرآن کریم چونکہ ایک بنیادی دستور کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے یہ جزئیات و تفاصیل کا حامل نہیں ہے۔ اگر قرآن کریم جزئیات و فروعات کو بیان کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیتا تو اس کا حجم اتنا بڑھ جاتا کہ اس کے نقل و حمل میں بڑی دشواری پیش آتی۔ مگر اندریں صورت اس کی اصولی و اساسی حیثیت باقی نہ رہتی۔ بلکہ قرآن ایک فقہ کی کتاب بن جاتا جو تفصیلی احکام و مسائل کو سموئے ہوئے ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم اصول اور کلیات کی جامع کتاب ہے اور اس کا مقصد بنیادی اصول و قواعد کو بوضاحت بیان کرنا ہے۔ قرآن کا یہ کام نہیں کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ کے بارے میں تفصیلی قواعد و ضوابط وضع کرے بلکہ اس کے پیش نظر صرف یہ امر ہے کہ انسانی شعبہ ہائے حیات کی تشکیل و تعمیر کس طرز و انداز میں ہونی چاہیئے ان ہدایات کی روشنی میں اسلامی زندگی کے خد و خال کا تعین کرنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کام تھا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اولین مقصد یہ تھا کہ دنیا کو اس عدیم المثال سیرت و کردار اور اس مثالی معاشرے اور حکومت کا عملی نمونہ پیش کریں

Marfat.com

جس کا تصور قرآن حکیم نے دیا ہے۔ کتاب اللہ کا کام انسانی زندگی کی حدود کا تعین تھا اس کے بعد انسانی زندگی کے نقشے کی تزئین و آرائش آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کی گئی۔ آپ نے صحابہ کرامؓ جیسے جان نثار اور مخلص مسلمان پیدا کرکے دنیا پر یہ حقیقت واضح کر دی کہ اسلام اپنے پیروؤں سے اس قسم کی اسلامی زندگی کا تقاضا کرتا ہے۔

قرآن کا موضوع۔ مقصد اور طرز خطاب

سوال ۱۶: قرآن کریم کے انداز خطاب پر روشنی ڈالیے۔

جواب: طرز خطاب

جس طرح ہر کتاب ایک خاص موضوع پر مشتمل ہوتی ہے اور اس موضوع سے متعلقہ معلومات کو اس میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ جمع کر دیا جاتا ہے قرآن کریم ایسی کتاب نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب قاری پہلی مرتبہ قرآن کریم کا مطالعہ اس اعتبار سے کرنے بیٹھتا ہے کہ یہ بھی عام کتابوں کی طرح ایک کتاب ہے اور اس میں بھی پہلے موضوع کا تعین ہوگا پھر اصل مضمون کو ایک منطقی ترتیب سے کے مطابق ابواب میں تقسیم کرکے ایک ایک مسئلہ پر تفصیلی بحث کی جائے گی تو اسے سخت مایوسی کا سامنا ہوتا ہے۔

قاری یہ دیکھ کر محو حیرت رہ جاتا ہے کہ قرآن کریم میں عقائد و اخلاق، شرعی احکام، دعوت و ارشاد، عبرت و موعظت، بشارت و انذار، دلائل و شواہد، تاریخی واقعات اور مظاہر قدرت کا ذکر و بیان بار بار آرہا ہے۔ ایک ہی مضمون کو مختلف الفاظ میں دہرایا جارہا ہے۔ ایک مضمون شروع ہوتا ہے کہ یکایک ایک بے تعلق مسئلہ چھڑ جاتا ہے۔ مخاطب اور متکلم بار بار بدلتے ہیں اور انداز تخاطب مختلف سمتوں میں گھومتا پھرتا رہتا ہے۔ ابواب اور فصول کی کوئی تقسیم نظر نہیں آتی۔

Marfat.com

تاریخی واقعات کو تاریخی انداز میں بیان نہیں کیا جاتا۔ مابعد الطبیعیاتی مسائل کو منطق و فلسفہ کی زبان میں ذکر نہیں کیا جاتا۔ تمدن و معاشرت اور سیاست و معیشت کے مسائل کو عمرانی نقطۂ نگاہ کے مطابق بیان نہیں کیا جاتا۔ قانونی احکام کا ذکر قانون دانوں کی طرح نہیں کیا جاتا۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس کتاب کا انوکھا انداز بیان اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی تہذیب و ترتیب اس کا رنگ ڈھنگ اور اس کا موضوع و مضمون باقی سب کتابوں سے نرالا ہے۔

اس طرز بیان کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن انسان کے شعور کلی سے خطاب کرتا ہے اس کے کسی شعبہ یا جزو سے نہیں۔ وہ بیک وقت وجدان و عقل پر اثر انداز ہوتا ہے۔ عام مصنفین کا یہ حال نہیں ہے۔ ایک مصنف اپنی تصنیف کے موضوع کو ایک منطقی ترتیب کے ساتھ ابواب میں تقسیم کرتا ہے۔ پھر ہر قسم کے خیالات کو ادا کرنے کے لئے ایک جداگانہ طرز بیان اختیار کرتا ہے۔ وجدان و کیفیات کا بیان ایک خاص انداز تحریر کا متقاضی ہے اور اس کی ایک خاص ترتیب ہے۔ تاریخ نویسی کے وقت واقعات کی ترتیب و تسلسل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقیات کے موضوع پر جو کتاب لکھی جائے اس کو ابواب و فصول میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

مگر قرآن کریم کا معاملہ دوسرا ہے۔ یہ اس قسم کی تقسیم کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اسلئے کہ جو کتاب بیک وقت انسان کی شعوری و لاشعوری قوتوں سے مخاطب ہو وہ ایسی تقسیم کی روادار نہیں ہو سکتی۔ اس چیز نے قرآن کریم کو اپنی ترتیب اور طرز ادا کے اعتبار سے اپنے انداز کی واحد کتاب بنا دیا ہے۔ یہ ایسی کتاب ہے کہ قاری پڑھتے وقت جب تک اپنے قلب و ذہن اور ضمیر و وجدان سب کو بیک وقت حاضر اور متوجہ نہ رکھے وہ اس سے کامل استفادہ نہیں کر سکتا۔ جداگانہ طرز خطاب اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرآن کو اتارنے کا ایک مقصد یہ تھا کہ لوگ اسے اپنے سینہ

Marfat.com

میں جگہ دیں، اسے ورد زبان بنائیں، اس سے سکون قلب کی دولت پائیں، نمازوں میں اس کی تلاوت کریں، دعاؤں میں اس کے کلمات کو دہرائیں۔ اس میں غور و فکر کریں اور اس کے احکام کو اپنا معمول بنائیں۔ اگر قرآن کی ترتیب اور طرز ادا ایک عام کتاب جیسی ہوتی تو یہ مقاصد اس سے حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔

قرآن کریم کا یہ انوکھا انداز خطاب ہی تھا جس نے عرب کے فصحاء و بلغاء اور ادباء و شعراء کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا اور وہ پکار اٹھے تھے کہ "مَا هٰذَا كَلَامُ الْبَشَرِ" (یہ انسانی کلام نہیں) حالانکہ وہ خود صاحب زبان و بیان اور ادیب و خطیب تھے۔ اگر قرآن کا طرز خطاب ایک عام تصنیف جیسا ہوتا تو ان کی حیرانی کی کوئی وجہ نہ تھی بعرب میں ایسے لوگوں کی تعداد اچھی خاصی ہے جو قرآن کریم کے طرز بیان سے متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

سوال ۶۲: قرآن کریم کا موضوع و مقصد کیا ہے؟ تفصیلاً بیان کیجئے۔

جواب: قرآن کا موضوع

قرآن کریم کا موضوع متعین کرنے سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ انسان کی حیثیت اس دنیا میں کیا ہے؟ وہ کس لئے دنیا میں آیا ہے۔ اسکا مقصد حیات کیا ہے؟ قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ انسان اس دنیا پر خدا کا خلیفہ اور نائب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے عقل و دانش اور فہم و فراست سے نوازا تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم کرے اور اپنی زندگی کے تمام شعبوں میں اس کی اطاعت بجالائے۔ انسانی زندگی کا مقصد اخروی فلاح و نجات حاصل کرنا ہے۔ اس کے سوا تمام مقاصد بیکار ہیں۔

Marfat.com

قرآن کریم نے ہمیں بتایا کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی بھی ہے۔ وہ زندگی جسطرح خود ابدی ودائمی ہے اسطرح اس میں جو آرام وراحت یا الم ورنج ملے گا وہ بھی دائمی ہے۔ اخروی رنج وراحت کا انحصار موجودہ زندگی کے افعال واعمال پر ہے۔ اگر انسان اس زندگی میں خدا کی اطاعت کرے گا اور اپنے تمام شعبہ ہائے حیات کو اسلامی قانون کے تابع کر دے گا تو وہ آئندہ زندگی میں ہر طرح کی راحت وآرام پائے گا ورنہ بصورت دیگر اخروی زندگی میں الم ورنج کا سامنا کرنا ہوگا اور وہ زندگی سخت ناکامی کی زندگی ہوگی۔

انسانی فلاح ونجات کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام کو بھیجا۔ حضرات انبیاءؑ کے سلسلہ کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا جو اس خطۂ ارضی پر اولین انسان ہونے کے ساتھ ساتھ پہلے پیغمبر بھی تھے۔ انبیاءؑ مختلف اوقات میں مبعوث ہو کر بنی نوع انسان کو دعوت حق دیتے رہے۔ دنیا میں جب بھی ظلمت وجہالت چھا جاتی اور سابق نبی ورسول کی تعلیمات کو مسخ کر دیا جاتا تو اللہ تعالیٰ کسی اور رسول کو مبعوث کر کے کفر والحاد کا ازالہ کرتے اور حق کی اصلی راہ لوگوں کو دکھاتے رہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد مرور زمانہ سے حق مغلوب ہو گیا اور ان کے پیروؤں نے اصلی تعلیمات کو بگاڑ دیا۔ موسوی شریعت پہلے ہی تحریف واختلاط کا شکار ہو چکی تھی۔ اب اللہ تعالیٰ نے سالار رسل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء والرسل بنا کر بھیجا اور آپؐ پر خاتم الکتب (قرآن کریم) ایک آخری ہدایت نامہ کی حیثیت سے نازل کی۔ پچھلے انبیاءؑ کی بگڑی ہوئی امتیں سب آپؐ کی مخاطب تھیں۔ سب کو حق دعوت دینا۔ سب کو خدا کا بھولا ہوا سبق یاد دلانا اور جو لوگ آپؐ کی دعوت پر لبیک کہیں، ایک امت مسلمہ کی صورت میں ان کی شیرازہ بندی کرنا آپؐ کا نصب العین تھا۔ آپؐ کا مشن ایک ایسی امت کا قیام تھا جو اپنی زندگی میں اسلامی قانون کی پیروی کرے اور دوسری جانب لوگوں کی اصلاح

وفلاح کا بیڑا اٹھائے گئے۔ قرآن پاک بس اسی دعوت و ہدایت کا کفیل ہے۔ قرآن مجید جو ابدی صداقتیں لایا ہے مرورِ ایام سے وہ مٹ سکتی ہیں اور نہ انہیں مسخ کیا جا سکتا ہے۔

قرآن کریم کا مقصد

مذکورہ صدر بیان اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ قرآن پاک کا موضوع "انسان" ہے۔ قرآن پاک یہ بتانا چاہتا ہے کہ انسان کا نفع اور نقصان کس چیز میں ہے۔ نیز یہ کہ انسان نے نفسانی جذبات و خواہشات کے زیر اثر خدا اور نظام کائنات، اپنی ہستی اور دنیوی زندگی کے بارے میں جو نظریات قائم کئے ہیں اور ان کی بنا پر جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے وہ خود انسان ہی کے لئے تباہ کن ہے۔ صحیح طرزِ عمل یہی ہے کہ انسان خلیفۂ خداوندی ہونے کے اعتبار سے اپنی زندگی کو اسلامی قانون کے تابع کرے اور خدا کی بتائی ہوئی راہ پر گامزن رہے جسے "صراطِ مستقیم" کہا جاتا ہے۔

یہ امر قابل غور ہے کہ قرآن پاک ایسی کتاب نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ نے لکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بہ یک وقت عطا کر دی۔ اسے عام تصنیفات کی طرح ابواب و فصول میں منقسم بھی نہیں کیا گیا۔ بخلاف ازیں قرآن کریم اپنی طرز کی واحد کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تیئیس ۲۳ سال کے عرصہ میں نازل کی۔ آغازِ نبوت میں جن ہدایات کی ضرورت تھی پہلے وہ نازل کیں۔ آغازِ نبوت کی ہدایات تین مضامین پر مشتمل ہیں:۔

۱: پہلی قسم کی وہ ہدایات ہیں جن میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عظیم بارِ امانت کو اٹھانے کے لئے تیار کیا گیا ہے۔

۲: اسلام کے بارے میں ابتدائی و تمہیدی معلومات اور غلط فہمیوں کا ازالہ۔

۳: صحیح طریق کار کی طرف دعوت اور ہدایت کے بنیادی اصول۔

آغازِ نبوت میں جو تعلیمات نازل ہوئیں وہ چھوٹے چھوٹے فقروں پر مشتمل ہیں جو فصاحت و بلاغت، شستہ و شیریں اور پر تاثیر ہونے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ

Marfat.com

ادب و بلاغت کا نادر نمونہ ہیں۔ اور تیر و نشتر کی طرح سخن فہموں کے قلب و ذہن میں پیوست ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جب نبوت کا ابتدائی دور گذر گیا تو اللہ تعالیٰ نے پرجوش خطبوں کی صورت میں اپنا پیغام بھیجنا شروع کیا ان میں دریا کی روانی، سیلاب کی سی تندی و تیزی اور آگ کی سی حرارت تاثیر تھی۔ ان خطبوں میں ایک طرف اہل ایمان کو ان کے فرائض بتائے گئے۔ ان کے اندر جماعتی شعور پیدا کیا گیا۔ انہیں تقویٰ، فضیلت، اخلاق اور پاکیزگی سیرت کی تعلیم دی گئی۔ ان کو دعوت دین کے طریقوں سے آشنا کیا گیا۔ کامیابی کے وعدے کئے گئے اور جنت کی بشارت دی گئی۔ صبر و ثبات اور بلند حوصلگی کی تعلیم دیتے ہوئے راہ خدا میں سعی و جہد پر آمادہ کیا گیا۔ دوسری طرف مخالفین اور راہ راست سے منہ موڑنے والوں اور غفلت کی نیند سونے والے لوگوں کو پچھلی قوموں کے انجام سے آگاہ کیا گیا جن کی تاریخ سے وہ خود واقف تھے۔

ہجرت کے بعد حالات کا نقشہ بدل گیا تھا۔ امت مسلمہ ایک باقاعدہ ریاست کی بنا ڈالنے میں کامیاب ہو گئی۔ پچھلے انبیاءؑ کی امتوں سے سابقہ پڑا۔ پرانی جاہلیت کے علمبرداروں سے جنگ کی نوبت آئی۔ امت مسلمہ کے اندرونی نظام میں مختلف قسم کے منافق گھس آئے کئی سال کی شدید کشمکش سے گذر کر آخر کار یہ امت کامیابی کی اس منزل پر پہنچی کہ سارا عرب اس کے زیر نگین ہو گیا۔ اور عالمگیر دعوت و اصلاح کے دروازے اس کے سامنے کھل گئے۔ ان ادوار کی خاص ضرورتوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کے پیغامات مختلف صورتوں میں آتے رہے۔ یہ پیغامات کبھی جوش خطابت سے لبریز ہوتے۔ کبھی شاہانہ فرامین و احکام کا انداز اختیار کیا جاتا۔ بعض اوقات یہ معلمانہ درس و تدریس اور مصلحانہ افہام و تفہیم کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ ان آیات میں نبی کو جدید اسلامی ریاست کی تشکیل، انسانی زندگی کے اصول و قواعد، کفار و منافقین اور اہل کتاب سے برتاؤ۔ اور دیگر ہدایات دی جاتی تھیں۔

Marfat.com

غرض یہ کہ ضروریات زمانہ کے مطابق قرآن کریم کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے اور تئیس ۲۳ سال کی مجموعی مدت میں اس کی تکمیل ہوئی۔

سوال ۶۳: نزول قرآن کے بارے میں آپ جو کچھ جانتے ہیں تحریر کیجئے۔

جواب: جس طرح امام رسل صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ابدی و دائمی ہے اور کسی زمان و مکان کی حد بندی میں محدود و مقید نہیں اسی طرح جو کتاب ہدایت آپ پر نازل کی گئی تمام بنی نوع آدم کے لئے تا قیامت پیام رشد و ہدایت ہے۔ قرآن کریم اس آخری مجموعے کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول پر آخرت تک کے لئے نازل فرمایا۔

نزول قرآن

قرآن کریم سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ہی دفعہ نازل نہیں ہوا تھا۔ بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوتا رہا۔ حسب ضرورت کبھی کم کبھی زیادہ کبھی ایک آیت کبھی دو آیتیں کبھی ایک سورت اور کبھی ایک ہی دن میں مختلف سورتوں کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے۔ کفار مکہ نے اعتراض کیا تھا کہ قرآن کریم ایک ہی مرتبہ نازل کیوں نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اس اعتراض کو نقل کر کے اسکا جواب دیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ	انہوں (کفار) نے کہا کہ اس پر قرآن ایک ہی دفعہ کیوں نہیں نازل کیا گیا۔ یہ اس لئے کیا تاکہ تیرے دل کو مضبوط کریں اور ہم

Marfat.com

ترتیلاً (سورۃ فرقان) نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھا ہے۔

نزول قرآن کا مکی دور

نزول قرآن کا زمانہ دو الگ الگ حصوں میں تقسیم ہے جو باہم ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔

پہلا حصہ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جس میں آپ کا قیام مکہ معظمہ میں تھا۔ یہ کل ۱۲ سال ۵ ماہ اور ۱۳ دن کا عرصہ ہے۔ نزول قرآن کا آغاز ۱۷ رمضان ۴۱ سن ولادت نبوی سے ہوا۔ سورہ انفال کے مطالعے سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ جنگ بدر اور آغاز نزول قرآن کا دن ایک ہی تھا۔ غزوہ بدر بھی ۱۷ رمضان المبارک کو وقوع پذیر ہوا تھا۔ اس کا اختتام یکم ربیع الاول ۵۴ سن ولادت پر ہوتا ہے جب آپ مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اس مدت میں قرآن پاک کا جو حصہ نازل ہوا ہے اس کو مکی کہتے ہیں۔ بنا بریں مکی سورتوں سے فقط وہ سورتیں مراد نہیں جو مکہ میں نازل ہوئیں بلکہ وہ سب سورتیں ہیں جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئیں۔ خواہ مکہ میں نازل ہوئی ہوں یا کسی اور جگہ۔ جو سورتیں ہجرت کے بعد نازل ہوئیں انہیں مدنی سورتیں کہتے ہیں خواہ وہ مدینہ میں نازل ہوئی ہوں یا کسی اور جگہ۔

نزول قرآن کا مدنی دور

نزول قرآن کا دوسرا دور ہجرت کے بعد شروع ہوا یہ کل ۹ سال ۹ ماہ اور ۹ دن کا عرصہ ہے۔ اس کا آغاز یکم ربیع الاول ۵۴ سن ولادت نبوی سے ہوا اور ۹ ذوالحجہ ۶۳ سن ولادت نبوی بمطابق ۱۰ ہجری پر ختم ہو گیا۔ اس مدت میں جو آیتیں اور سورتیں نازل ہوئیں ان کو مدنی کہتے ہیں۔ مندرجہ صدر بیان کے مطابق نزول قرآن کی کل مدت ۲۲ سال ۲ ماہ اور ۲۲ دن بنتی ہے۔

Marfat.com

مکی و مدنی سورتوں کی خصوصیات

مکی سورتوں میں اسلام کے بنیادی عقائد مثلاً توحید رسالت اور آخرت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مکی سورتیں عموماً مختصر اور مقفّی (ہم وزن) عبارت میں ہیں۔ ان سورتوں میں مشرکین کے غلط عقائد کی تردید، اسلامی عقائد کی تشریح اور ان کی صداقت کے دلائل بیان کئے گئے ہیں۔ مکی سورتوں میں معاندین کے اعتراضات، اہل کتاب کے شکوک و شبہات، انبیائے سابقین کے واقعات، اہل ایمان کی کامیابی اور اعلیٰ اخلاقی ہدایات، صدقہ و خیرات کے فضائل اور ذکر و دعا کی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ مکی سورتیں اختصار کے باوجود ادب و بلاغت کا بہترین نمونہ ہیں۔ یہ سورتیں اپنی روانی، غنت تاثیر، زور بیان اور جوش خطابت میں لاثانی ہیں۔

ہجرت کے بعد جب آنحضورؐ کی مدنی زندگی کا آغاز ہوا تو اسلام مظلوم و محکوم ہونے کی بجائے ایک طاقت بن گیا۔ اب مدینہ میں ایک جدید اسلامی حکومت کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ اس دور کے تقاضے مختلف تھے۔ اس لئے اب عائلی قوانین جہاد فی سبیل اللہ کے احکام معاشی و اخلاقی احکام اور حلال و حرام کے متعلق مسائل نازل ہونا شروع ہوئے۔ عبادات و معاملات کی تفصیلات بیان ہوئیں۔ اہل کتاب کے رویہ پر تنقید کی گئی۔ منافقین کی بے ایمانی کا راز طشت از بام کیا گیا صلح و جنگ کے احکام اترے اور اسلامی احکام کی حکمت و مصلحت بیان کی گئی۔

آغاز وحی

قرآن مجید وحی الٰہی ہے۔ وحی کے لغوی معنی "چھپا کر اطلاع دینا" ہیں۔ شرعی اصطلاح میں وحی سے مراد وہ خاص غیبی طریقہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنی بنی تک کوئی بات پہنچاتا ہے۔ اس میں کسی شخص کے غور و فکر اور تجربہ و استدلال کو قطعاً کوئی دخل نہیں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے نکاح کرنے کے بعد آپؐ غار حرا میں تشریف

Marfat.com

سے جاکر محو عبادت رہا کرتے تھے۔ جب کھانے پینے کا سامان ختم ہو جاتا تو گھر سے لے جاتے اسی حالت میں ایک دن حضرت جبریلؑ آئے اور آپؐ سے کہا اِقْرَاْ (پڑھیے) آپؐ نے فرمایا "میں پڑھا ہوا نہیں ہوں" فرشتے نے آپ کو زور سے دبایا۔ پھر چھوڑ کر کہا "پڑھو" آپؐ نے پھر وہی جواب دیا۔ تین مرتبہ ایسا ہوا۔ فرشتے نے تیسری مرتبہ پکڑ کر دبایا اور چھوڑنے کے بعد کہا۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (سورۃ العلق)

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا جس نے انسان کو جمے ہوئے خون سے پیدا کیا۔

یہ پہلی وحی تھی جو آپؐ پر نازل ہوئی۔ اس وقت آپؐ کی عمر چالیس برس تھی۔ زندگی کے اس نئے تجربہ سے آپؐ ڈر گئے۔ گھر واپس لوٹے اور حضرت خدیجہؓ سے ماجرا کہہ سنایا۔ حضرت خدیجہؓ نے آپؐ کو تسلی دی اور کہا خدا تعالیٰ آپؐ کو ہرگز رسوا نہ کرے گا۔ پھر حضرت خدیجہؓ آپؐ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ بن نوفل مذہباً عیسائی اور تورات و انجیل کا ماہر تھا۔ اس نے سارا ماجرا سن کر کہا یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا کرتا تھا۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ چند دنوں تک رک گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس عرصہ میں بہت افسردہ رہا کرتے تھے۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

قرآن پاک کی جمع و تدوین اور حفاظت

سوال ۲: حفاظت قرآن پاک پر ایک جامع نوٹ لکھئے اور ثابت کیجئے کہ قرآن پاک اپنی اصلی صورت میں محفوظ ہے۔

Marfat.com

جواب: قرآن کریم کی عظیم خصوصیت یہ ہے کہ چودہ صدیاں گذرنے کے باوجود یہ اسی طرح محفوظ ہے جیسے عہد رسالت ﷺ میں تھا۔ حالانکہ سابقہ آسمانی کتب کی شکل و صورت اور اصلیت بالکل بدل گئی ہے۔ اس کے محفوظ ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک تنہا ایک ایسی کتاب ہے جو اپنے محفوظ ہونے کا دعوی کرتی اور ببانگ دہل اس بات کا اعلان کرتی ہے کہ اس کے نازل کرنے والے نے اس کی حفاظت کی ضمانت لی ہے۔ دوسری کوئی کتاب اس خصوصیت میں قرآن کریم کی سہیم و شریک نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالی فرماتا ہے۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر-۹)	بیشک ہم نے ہی اس قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔
اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (القیامہ)	بیشک اس قرآن کو جمع کرنا اسے پڑھوانا اور پھر اس کی تشریح و توضیح بھی ہمارے ذمہ ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالی نے حفاظت اور جمع قرآن کے ساتھ ساتھ پیغمبر سے اس کے مجمل و مبہم حصوں کی تشریح و تفسیر بیان کروانا بھی اپنے ذمہ لیا ہے لہذا قرآن پاک کے اجمالی حصوں کی سب سے معتبر تفسیر وہی ہو گی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو۔ حفاظت کا وعدہ اس قدر مستحکم بنیادوں پر کیا کہ باطل کی دخل اندازی کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہا۔

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (حم السجدۃ-۴۲)	قرآن میں نہ سامنے سے باطل کے گھسنے کی گنجائش ہے نہ پیچھے سے۔

اللہ تعالی نے یہ بھی فرمایا کہ آپ ﷺ پر جو قرآن اتارا گیا ہے یہ بالکل وہی ہے جو اس کی سماع محفوظ میں ہے۔

Marfat.com

بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ (البروج - ۲۲) بلکہ وہ تو بلند پایہ قرآن لوحِ محفوظ میں ہے۔

قرآن کریم کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ اس کی جمع و ترتیب اور حفاظت و کتابت کا سلسلہ اس کے نزول کے ساتھ شروع ہوا اور آخری مرحلہ تک جاری رہا۔ قرآن کریم کے عین برخلاف سابقہ آسمانی کتب عرصہ دراز تک زبانی یادداشتوں گیتوں اور قصوں کی شکل میں رہیں اور صدیوں بعد قلمبند ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم سورہ بقرہ کے شروع میں اعلان کرتا ہے کہ

ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ یہ ایک ایسی تحریر ہے جس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

قرآن کریم کے محفوظ ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ آج طویل و عریض کائنات ارضی پہ قرآن کریم کا صرف ایک ہی نسخہ پایا جاتا ہے جس میں زیر و زبر اور تشدد و مد تک کا فرق موجود نہیں جس زبان میں قرآن پاک اترا وہ ایک زندہ زبان ہے اور کروڑوں انسان اس کو بولتے لکھتے اور سمجھتے ہیں۔ دنیا میں قرآن پاک کے لاکھوں حافظ موجود ہیں۔ اگر کوئی دشمن اسلام قرآن پاک کے سب نسخے تلف کرنے کی حماقت کا مرتکب ہو تو حفاظ قرآن کے سینہ میں جو کتاب محفوظ ہے اس کو مٹانے پہ قادر نہ ہوگا۔ مسلمان اس کو حرز جان بنا کر لکھنے اور اس کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھانے کو عین سعادت تصور کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے قرآن پاک واحد کتاب ہے جو زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہی ہے اور جس پر گردش ایام کا کچھ اثر بھی ظاہر نہیں۔ اقوام عالم اپنی کتابوں کو لاکھ آسمانی کہیں اور ان کی تعریفوں کے پل باندھیں مگر وہ یہ دعویٰ کرنے سے قاصر ہیں کہ ان کی آسمانی کتب تغییر و تبدل سے محفوظ ہیں۔

سوال ۶۹: قرآن کریم کی جمع و تدوین اور ترتیب کے بارے میں آپ جو کچھ جانتے ہوں تحریر کیجئے؟

جواب: عہد رسالت میں حفاظت و جمع قرآن

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب قرآن کریم کا کچھ حصہ نازل ہوتا تو آپؐ صحابہؓ کو سنا دیا کرتے تھے۔ صحابہؓ آپؐ سے سن کر اسے یاد کر لیتے تھے۔ عہد رسالتؐ میں بہت سے صحابہؓ ایسے تھے جنہیں پورا قرآن پاک زبانی یاد تھا۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی تو آپ فوراً اسے لکھوانے کا اہتمام کرتے تھے۔ اس غرض سے آپ نے بہت سے کاتب مقرر کئے تھے۔ جن کے نام عام طور سے معروف ہیں۔ بعض علماء نے ان کی تعداد ۲۶ بتائی ہے۔ علامہ حلبی نے سیرت العراقی کے حوالے سے ان کی تعداد ۴۲ لکھی ہے۔ خلفائے اربعہ کے اسمائے گرامی کاتبین وحی میں شامل ہیں۔ کاتبوں کی اتنی بڑی تعداد مقرر کرنے کی وجہ یہی تھی کہ وقت پر ایک نہ ملے تو دوسرے سے کام لے لیا جائے۔ ایک صحابی حنظلہؓ بن ربیع تمام کاتبوں کے افسر تھے۔ ان کو یہ حکم تھا کہ کوئی رہے یا نہ رہے وہ ضرور حاضر رہیں۔ تاکہ کتابت وحی میں رکاوٹ نہ ہو۔ اسی انتظام کا نتیجہ تھا کہ نزول کے ساتھ ہی ہر قرآنی آیت قلمبند ہو جاتی تھی۔ دوشنبہ ربیع الاول سنہ نبوی کو آیت یٰٓاَیُّہَا الْمُدَّثِّرُ نازل ہوئی۔ یہ دوسری وحی تھی۔ پنج شنبہ کو خالدؓ بن سعید اسلام لائے۔ ان سے آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یہ آیت لکھوائی۔ ان کی بیٹی کا بیان ہے کہ سب سے پہلے بسم اللہ میرے باپ نے لکھی۔ اس طرح نزول وحی سے چوتھے دن کتابت شروع ہوئی جو نزول قرآن کے اختتام تک برابر جاری رہی۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ جبریل علیہ السلام آنحضورؐ کو قرآن پاک پڑھاتے تھے۔ آپؐ کاتبوں سے لکھواتے۔ جب کاتب لکھ لیتا تو آپؐ پڑھوا کر سنتے۔ اگر کوئی حرف یا لفظ لکھنے سے چھوٹ جاتا تو اس کو آپؐ درست کراتے۔ جب یہ سب کام پورا ہو جاتا

Marfat.com

تب آپؐ اس کی عام اشاعت کرتے۔ پھر جو صحابہؓ لکھنا جانتے تھے لکھ لیا کرتے تھے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی تو حضورؐ مجھ کو بلایا کرتے تھے۔ میں تختی اور دوات لے کر حاضر خدمت ہوتا۔ آپؐ لکھاتے۔ لکھا کر پھر سنتے اگر غلطی ہو جاتی تو صحیح کرا دیتے تھے۔

اس زمانہ میں سامان کتابت کا فقدان تھا۔ لکھنے کے لئے کھجور کے چوڑے پتے۔ شانے کی ہڈی۔ ہرن کی جھلی وغیرہ استعمال ہوتی تھی۔ پھر آپؐ اس تحریر کو مسلمانوں میں پھیلاتے وہ اس سے نقل کر کے اپنے پاس رکھتے تھے۔ جن چیزوں پر کلام الٰہی تحریر ہوتا تھا۔ صحابہؓ دنیا کی ہر قیمتی چیز سے ان کو بیش قیمت خیال کرتے اور انہیں حرز جان بنا کر رکھتے تھے مخصوص کاتبان وحی کے علاوہ بہت سے صحابہؓ نے اپنے طور پر قرآن مجید لکھا ہوا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عہد نبویؐ میں سارا قرآن مجید جمع کیا تھا اور رات بھر پڑھتا رہتا تھا۔ یہ سن کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ماہ میں ختم کرنے کا حکم دیا۔ (مسند احمد و نسائی)

جب آپؐ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی تو مسجد نبویؐ میں ایک صندوق رکھوا دیا جس میں قرآن پاک کا ہر نیا نازل شدہ حصہ لکھوا کر رکھ دیا جاتا تھا۔ تمام مسلمان اس سے اپنے لئے نقل کرتے رہتے تھے۔ اس طرح آپؐ کی وفات ۱۱ھ تک قرآن پاک کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جو تحریری صورت میں مسلمانوں کے پاس موجود نہ ہو۔ البتہ یہ ایک کتاب کی صورت میں مرتب نہ تھا بلکہ اس کے اجزا منتشر تھے۔

ترتیب سُوَر و آیات

مذکورہ صدر احتیاط و انتظام کے ساتھ قرآن کریم اپنی پوری مدت نزول میں بصورت تحریر جمع ہوتا رہا۔ آیات و سُوَر کی جمع و ترتیب کا کام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بحکم خداوندی اپنی نگرانی میں مکمل کرایا چنانچہ پورا قرآن پاک موجودہ ترتیب کے ساتھ عہد

Marfat.com

رسالتؐ میں جمع ہوگیا۔ اسی ترتیب سے آپؐ رمضان میں جبریل علیہ السلام کے ساتھ قرآن پاک کا دور کیا کرتے تھے۔ زندگی کے آخری سال یہ دور دو مرتبہ کیا۔ آپؐ نماز میں اسی ترتیب سے پڑھا کرتے تھے اور ہزاروں صحابہ سنا کرتے تھے۔ اس بات پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جمع کردہ قرآن میں ایک نقطہ اور ایک شوشہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی۔

چنانچہ مولانا بحر العلوم شرح مسلم الثبوت میں رقمطراز ہیں۔

قرآن پاک کی موجودہ ترتیب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور اس کی صحت پر تمام امت کا اتفاق ہے۔

شیعہ عالم کی شہادت

مشہور شیعہ عالم سید محمد اپنی کتاب "تنزیہ الفرقان" میں شیعہ مجتہد علامہ سید مرتضیٰ سے نقل کرتے ہیں۔

"قرآن جس ترتیب پر آج ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی وہ اسی طرح مرتب تھا اور اس وقت بھی اسی طرح پڑھا جاتا تھا۔ قرآن اسی طرح سے یاد کیا گیا اور رسولِ خداؐ کو اسی طرح سے سنایا جاتا اور آپؐ کے سامنے پڑھا جاتا تھا صحابہؓ کی ایک بڑی جماعت نے متعدد مرتبہ حضورؐ کو پورا قرآن اسی طرح سنایا۔ جس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ قرآن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مرتب تھا۔"

مستشرقین کا اعتراف

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سرکاری نسخہ قرآن کے علاوہ بہت سے صحابہؓ کے پاس پورا قرآن پاک مکتوبہ صورت میں موجود تھا۔ بہت سے صحابہؓ کے پاس قرآن پاک کے تحریری اجزا تھے۔ یہ ایسی تاریخی حقیقت ہے کہ مستشرقین تک اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ چنانچہ سر ولیم میور نے لکھا ہے۔

Marfat.com

"یہ ایک مسلمہ صداقت ہے کہ رسولؐ کی زندگی میں متفرق طور پر قرآن کے لکھے ہوئے نسخے صحابہؓ کے پاس موجود تھے اور ان میں پورا قرآن یا تقریباً پورا قرآن لکھا ہوا تھا۔"

ڈاکٹر ہرٹ ڈ ویل لکھتا ہے :۔

"قرآن کے لکھے ہوئے نسخے عہد رسولؐ میں عام طور پر زیر استعمال تھے"

حفاظ قرآن صحابہ رضؓ

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ متعدد صحابہ کے پاس قرآنی آیات پر مشتمل نوشتے موجود تھے۔ عہد رسالتؐ میں آیتوں اور سورتوں کی ترتیب و تہذیب کا کام مکمل ہو چکا تھا اس لئے برملا یہ کہا جاتا تھا کہ فلاں سورت اتنی آیات پر مشتمل ہے اور فلاں آیت کا یہ نمبر ہے۔ یہ ترتیب حفاظِ قرآن کے سینوں میں محفوظ تھی۔ عہد رسالتؐ میں متعدد صحابہؓ ایسے تھے جن کو پورا قرآن کریم یاد تھا مثلاً

حضرت معاذ بن جبل۔ حضرت اُبیؓ بن کعب۔ حضرت عبداللہ بن مسعود۔ حضرت سالم بن معقل۔ حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہم ان کے علاوہ بہت سے صحابہؓ کو قرآن پاک کے اکثر حصے یاد تھے۔

امام ابن حزم کا بیان

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد قرآن کریم کی نشر و اشاعت میں جو وسعت ہوئی وہ امام ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کے بیان کے مطابق مختصراً حسب ذیل ہے۔ امام مذکور نے اپنی کتاب "اَلْفِصَل بَیْنَ الْمِلَلِ وَالنِّحَل" میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت تمام جزیرہ عرب مسلمان ہو گیا تھا۔ جزیرہ عرب مغرب میں بحر قلزم سے لے کر سواحل یمن سے گذرتا ہوا مشرق میں بحر فارس پر ختم ہوتا ہے اور بحر فارس سے دریائے فرات پر سے گذرتا ہوا شام کے کنارے بحر قلزم تک پہنچتا ہے۔ اس جزیرہ میں بے شمار بلاد و قصبات ہیں جو سب مشرف با سلام ہو

Marfat.com

گئے تھے۔ عرب بھر میں کوئی آبادی ایسی نہ تھی جہاں مسجد نہ ہو۔ ان مساجد میں پانچوں وقت نماز میں قرآن پاک پڑھا جاتا تھا۔ مسلمان اپنے بچوں اور اپنے متعلقین کو قرآن پاک پڑھاتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اڑھائی سالہ عہد خلافت میں فارس و روم اور یمامہ فتح ہوئے اور اب قرآن پاک کو پڑھنے والے اور زیادہ ہو گئے کوئی شہر ایسا نہ تھا جہاں قرآن پاک کے متعدد نسخے موجود نہ ہوں۔ فاروق اعظمؓ کی خلافت میں فتوحات کا دائرہ اور وسیع ہوا اور تمام بلاد اسلامیہ میں مسجدیں بنائی گئیں ہر ہر قریہ میں قرآن پاک کے نسخے موجود تھے ہر بستی میں اصحاب علم قرآن پڑھاتے تھے۔ تدریس قرآن پاک کے لئے ہزاروں مدرسے بنائے گئے۔ اسطرح لاتعداد قرآن پاک لکھے گئے۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں دس سال اور چند مہینوں تک یہی عالم رہا۔ خلافت فاروقی میں مصر و عراق اور شام و یمن میں کم از کم قرآن کے ایک لاکھ نسخے موجود تھے۔ جب عثمانی دور خلافت آیا تو فتوحات کا دائرہ اور بڑھا اور اس کے ساتھ ساتھ مساجد میں بھی اضافہ ہوا۔ اس دور میں قرآن پاک کے جس قدر نسخے موجود تھے ان کا شمار انسانی استطاعت سے باہر ہے۔"

(الفصل بین الملل والنحل لابن حزم)

ماخذ دوم ــــ سُنّت

سوال ۲۶: سنّت کا لغوی و اصطلاحی مفہوم بیان کیجئے اور بتائیے کہ اس کو دین میں کیا مقام حاصل ہے؟

جواب:

سُنّت کا مفہوم

لغت میں سنت طریقہ، راستہ اور راہ عمل کو کہتے ہیں، خواہ وہ راستہ اچھا ہو یا برا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے کوئی اچھی سنت قائم کی اسے خود اپنے عمل کا بھی اجر ملے گا اور ان لوگوں کے عمل کا بھی جو قیامت تک اس سنت کی راہ پہ گامزن

Marfat.com

ہوں گے"۔ دینی اصطلاح میں سنت سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ثابت شدہ طریقہ ہے جس پر آپ نے بار بار عمل کیا اور اس کے پابند رہے۔

حدیث کا مفہوم

حدیث عربی زبان میں خبر، بات یا گفتگو کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا

"فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ" وہ اس کے بعد کس چیز پر ایمان لائیں گے

حدیث کے معنی نئی چیز یا نئی بات بھی ہے۔ اس معنی کی رو سے یہ لفظ قدیم کی ضد ہے۔ حادثہ کا لفظ بھی اسی سے نکلا ہے۔ اصطلاح میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل یا تقریر کو حدیث کہتے ہیں۔ حدیث کی تین قسمیں ہیں۔

۱ : **قولی حدیث** : جس حدیث میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول بیان کیا گیا ہو اسے قولی حدیث کہتے ہیں۔

۲ : **فعلی حدیث** : جس حدیث میں آپؐ کے کسی فعل کا ذکر کیا گیا ہو اسے فعلی حدیث کہتے ہیں۔

۳ : **تقریری حدیث** : کوئی کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں کیا گیا ہو اور آپؐ نے اس سے منع نہ فرمایا ہو۔ تو اسے تقریری حدیث کہتے ہیں۔

حدیث وسنّت کا فرق : بعض علماء حدیث و سنت کے مابین یہ فرق قرار دیتے ہیں کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کے طریق روایت کو حدیث کہتے ہیں بخلاف ازیں سنت آپ کے اس معمول کا نام ہے جس پر آپؐ نے مداومت کی ہو اور عمر میں اسے متعدد مرتبہ انجام دیا ہو۔ محدثین کے یہاں حدیث و سنت کے الفاظ مترادف ہیں۔ البتہ اگر فرق کے لئے کسی جگہ کوئی قرینہ موجود ہو تو دونوں میں فرق کر سکتے ہیں۔ علماء کے یہ اقوال ملاحظہ ہوں۔

۱ : سنت کا لفظ آنحضور کے اقوال و افعال اور طریق رسولؐ و صحابہؓ سب کو شامل ہے
(کشف الاسرار علامہ عبدالعزیز حنفی ص ۳۵۹)

۲ : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وعمل اور تقریر کو سنت کہتے ہیں (قواعد الاصول صفی الدین حنبلی ص ۱۹)

۳ : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کا نام سنّت ہے (منہاج للبیضاوی ص ۱۱۶)

۴ : نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور تقریر کو سنت کہتے ہیں۔ علماء کے نزدیک حدیث و سنت کے الفاظ ہم معنی ہیں (توجیہ النظر للجزائری ص ۳)

حُجیّت و اہمیت حدیث

قرآن کریم کے بعد حدیث اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ ہے۔ جو مضامین قرآن کریم میں مجمل بیان ہوئے ہیں حدیث ان کی توضیح و تشریح کرتی ہے۔ اگرچہ حدیث نبوی کا مرتبہ قرآن پاک کے بعد ہے تاہم حدیث قرآن پاک کی طرح ایک مستقل ماخذ قانون ہے اس لئے کہ حدیث میں ایسے احکام بھی بیان کئے گئے ہیں، جو قرآن پاک میں مذکور نہیں ہیں۔ البتہ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ مستقل مصدر شریعت ہونے کے باوجود حدیث قرآن کے تابع ہے۔

حدیث نبویؐ دین میں حجت اور سند کا درجہ رکھتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر قول و عمل جو آپؐ کی جانب منسوب ہو اور اصول روایت و درایت اور قرآنی معیار سے خلاف نہ ہو تو وہ جمہور امت کے نزدیک واجب العمل ہے۔ یہ بدیہی بات ہے کہ خدا پر ایمان لانے کا مطلب اس کی اطاعت کرنا ہے۔ عقل اس بات کو جائز نہیں سمجھتی کہ اطاعت کے بغیر بھی ایمان کا کچھ مطلب ہو سکتا ہے۔ اسی طرح رسولؐ کو رسولؐ تسلیم کرنے کے بعد اس کی اطاعت کو موجب رضائے خداوندی تصور کرنا ضروری ہے۔ اس لئے کہ رسولؐ پر ایمان لانا اپنے اندر رسولؐ کی اطاعت کا مطالبہ بھی رکھتا ہے [حدیث نبویؐ کے حجت اور سند ہونے کے دلائل کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

Marfat.com

۱: قرآنی دلائل۔
۲: صحابہ کرامؓ اور جمہور علمائے امت کے افکار و نظریات۔
۳: عقلی براہین و دلائل۔

اب ہم تینوں قسم کے دلائل پر تفصیلی گفتگو کرتے ہیں۔

حدیث نبویؐ کی حجیت میں قرآنی دلائل۔

قرآن کریم کی متعدد آیات میں اطاعت رسولؐ کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (آل عمران۔۱۶۴)

بیشک اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان پر بڑا احسان کیا کہ انہی میں سے ایک رسولؐ ان میں بھیجا جو اس کی آیات ان پر تلاوت کرتا ہے۔ ان کے اخلاق کو پاک و صاف کرتا ہے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

مذکورہ صدر آیت سے روشن ہوتا ہے کہ رسولؐ کا مشن صرف آیات کا پہنچانا ہی نہیں بلکہ آیات کا سکھلانا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ آیات کے سنا دینے کو تعلیم نہیں کہتے تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ مشکل الفاظ کی تشریح کی جائے اور مجمل مطالب کو کھول کر بیان کیا جائے۔ تعلیم کے کئی طریقے ہیں۔ معلم کبھی زبان سے سکھاتا ہے اور کبھی عمل سے۔ بعض اوقات زبان و عمل دونوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس آیت میں تعلیم کتاب و حکمت سے احادیث و سنن مراد ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قرآن حکیم کے ترجمان و مفسّر بھی تھے۔ بنا بریں قرآن پاک کی وہ تفسیر جو مفسّر کتاب کی تعلیمات کو نظر انداز کر کے اپنی عقل و فکر کے بل بوتے پر بیان کی جائے ضروری نہیں کہ قرآن کو اتارنے

Marfat.com

والے کے مقصد کے مطابق ہو۔ آیت میں آپؐ کی بعثت کے چار مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔

۱ : تلاوت کتاب۔

۲ : تعلیم کتاب۔

۳ : تزکیۂ نفوس۔

۴ : تعلیم حکمت۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (النساء - ۱۰۵)

بے شک ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ آپؐ کی طرف نازل کی ہے تاکہ آپؐ خدا کی رہنمائی میں لوگوں کے درمیان فیصلے کریں۔

اس آیت میں "بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ" کا جملہ قابل غور ہے "اِرَاءَۃِ الٰهِی" (اللہ کے دکھانے) میں کتاب و حکمت کی وہ تعلیم شامل ہے جسکا دوسرا نام حدیث و سنت ہے۔ اِرَاءَت (دکھانا) اور تَنْزِیْل (اتارنا) معنی و مفہوم کے لحاظ سے دو مختلف چیزیں ہیں تنزیل اس وحی کو کہتے ہیں جو الفاظ کے ساتھ نازل ہو۔ اِرَاءَت میں وہ الہام و القاء داخل ہے جو بذریعہ الفاظ نہ ہو۔ وحی کا لفظ لغوی اعتبار سے تنزیل اور اراءت دونوں کو شامل ہے۔ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ کو محدثین اور ائمہ مجتہدین اپنی اصطلاح میں "وَحِیْ خَفِی" یا "وَحِیْ غیر متلو" کہتے ہیں۔ یعنی اللہ کی وہ اِرَاءَت (دکھانا) جس کا اظہار دربیان نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث و سنت کے ذریعہ سے کیا وحی میں داخل ہے اگرچہ اس کے الفاظ کی تلاوت نہیں کی جاتی۔ اس سے واضح ہوا کہ آنحضورؐ کے اقوال اور آپکے فیصلے ایک بشر کے فیصلے نہیں بلکہ اللہ کی "اِرَاءَت" کا نتیجہ اور فراست نبویہ کا وہ نتیجہ ہے جس میں کوئی دوسرا شخص رسولؐ کا شریک و سہیم نہیں ہو سکتا۔

Marfat.com

اس آیت سے صراحتًا واضح ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک تو تنزیل ہوئی اور اس کا مصداق قرآن ہے۔ دوسری چیز آپ کو "اِرَاءَتِ الٰہِی" (بِمَا اَرَاکَ اللّٰہ) عطا ہوئی جو تنزیل سے ایک الگ چیز ہے۔ لہٰذا اس اِرَاءَتِ الٰہِی (وحی خفی یا وحی غیر متلو) کا بھی کوئی مصداق ہونا چاہیئے اور وہ حدیث و سنت ہے۔ وحی خفی کی شہادت قرآن پاک میں بکثرت ملتی ہے۔ مثال کے طور پر دو آیتیں درج ہیں۔

"اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ" (اَلْقِیَامَة)

اس قرآن کا جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے۔ پھر اس کی وضاحت کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے تین باتوں کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ وہ تین باتیں یہ ہیں۔

(۱) جمع قرآن (۲) قرأت قرآن (۳) بیان قرآن۔

۱: جمع قرآن: اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی جمع و تالیف کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے رسول پاک کو کسی آیت میں یہ حکم نہیں دیا کہ فلاں ترتیب کے مطابق جمع کرو یا فلاں آیت کو فلاں سورت میں رکھو۔ ظاہر ہے کہ قرآن پاک کی جمع و تالیف کا کام آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیا تھا۔ اس آیت سے واشگاف ہوتا ہے کہ رسول کا وہ کام نجی حیثیت کا نہ تھا بلکہ آپ نے وہ کام رسول ہونے کی حیثیت میں اور اللہ تعالیٰ کی نگرانی و رہنمائی میں انجام دیا تھا۔

۲: بیانِ قرآن: اسی طرح بیان قرآن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب منسوب کیا ہے۔ بیان کے معنی ہیں تشریح و توضیح اور مجمل احکام کی تفصیل و تبیین ہے۔ "ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ" سے معلوم ہوتا ہے کہ مجمل الفاظ و مطالب کی توضیح اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ حالانکہ قرآن پاک میں ایسی تشریح کہیں مذکور نہیں۔ ایسی تشریحات صرف حدیث نبوی

میں ملتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تشریحات آنحضورؐ نے بحکم خداوندی (بذریعہ وحی خفی) انجام دیں لہٰذا یہ بھی وحی میں داخل ہیں اور اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو رسولؐ کی بجائے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

۳: قرأت قرآن پاک رسولؐ کا فعل ہے اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب منسوب کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ کی قرأت بحکم خداوندی تھی۔ حدیث کا تفسیر قرآن ہونا دوسری آیتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً

"وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ"
(النحل - ۴۴)

ہم نے آپ کی طرف قرآن نازل کیا تاکہ لوگوں کے سامنے آپؐ اس چیز کی وضاحت کر دیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے۔

نیز فرمایا۔

"وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوا فِيْهِ"
(النحل - ۶۴)

ہم نے آپؐ پر قرآن کو اسی لئے نازل کیا ہے تاکہ آپؐ اس چیز کو واضح کر دیں جس میں انہوں نے اختلاف کیا ہے۔

مذکورہ صدر آیات سے واشگاف ہوتا ہے کہ پیغمبرؐ قرآن کا ترجمان و مفسر بھی ہے یہ تفسیر نبویؐ حدیث میں مذکور ہے۔ کتب حدیث میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات قرآن تفصیلاً مذکور ہیں۔

یہود بنی نضیر کو جب جلاوطن کیا گیا تو ان کے کھجوروں کے درختوں میں سے کچھ کاٹ دیئے گئے اور کچھ چھوڑ دیئے گئے۔ اس ضمن میں ارشاد فرمایا۔

"مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَائِمَةً عَلٰى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ"
(الحشر - ۵)

کھجور کے جو درخت آپؐ نے کاٹ دیئے یا اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا وہ خدا کی اجازت سے تھا۔

Marfat.com

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کھجور کے درختوں کو کاٹنے کا حکم دیا تھا وہ بحکم خداوندی تھا۔ مگر قرآن کی کسی آیت میں اس اذنِ خداوندی کا ذکر نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ حکم بذریعہ تنزیل نہ تھا بلکہ وحی خفی کے ذریعے تھا۔

مذکورہ ذیل آیت میں صحابہ کرامؓ کو اہل کتاب کی شرارتوں سے ہوشیار رہنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا

وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيَاتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ (آل عمران — ۱۰۱)

اور تم کو کیونکر کفر کرنا چاہیئے حالانکہ تم کو اللہ کی آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسولؐ موجود ہے۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ کفر سے محفوظ رکھنے والی دو چیزیں ہیں (۱) اللہ کی آیات (۲) رسولؐ کا وجود۔ موجودہ زمانہ میں جب قرآن تو موجود ہے مگر رسول کا جسمانی وجود ہمارے درمیان نہیں تو ہدایت کا دوسرا سرچشمہ حدیث و سنت کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ پس جب قرآنی دلائل سے حدیث کا مقام و مرتبہ متعین ہو گیا تو اس سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ حدیث نبویؐ صرف تاریخی اہمیت ہی کی حامل نہیں بلکہ دین میں حجت اور سند کا درجہ رکھتی ہے۔

اس امر کے ثابت ہو جانے کے بعد کہ حدیث دین میں سند کا مرتبہ رکھتی ہے یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ آیا حدیث واجب التعمیل بھی ہے یا نہیں؟ تاہم چند قرآنی آیات سے اس پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

قرآن کریم نے اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے کہ انبیاءؑ کی بعثت کا مقصد ہی یہ ہے کہ ان کے مقدس اعمال و احکام کی روشنی میں امت اپنی منزل تک پہنچ سکے اور اپنے دامن کو فلاح و نجات کے گوہر مقصود سے مالا مال کر سکے

قرآن میں فرمایا

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ
(النساء ۔ ۶۴)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے صرف اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کا مطاع ہونا ضروری ہے۔ اور کسی رسول کی رسالت کی تصدیق کرنا ہی اسے واجب الاطاعت تسلیم کرنا ہے۔ اس آیت سے یہ بھی مستفاد ہوا کہ جس طرح ہر آسمانی کتاب واجب الاطاعت ہوتی ہے اسی طرح ہر رسول کی اطاعت بھی ایک لازمی چیز ہے۔ پھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ انبیاؑ تو کتابوں کے بغیر بھی ہیں مگر کوئی کتاب نبی کے بغیر نہیں اتری۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی بلا کتاب بھی بالاستقلال واجب الاطاعت ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں اطاعت خداوندی کے ساتھ ساتھ اطاعت رسولؐ کا بھی حکم دیا گیا ہے۔

— "اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ" اللہ کی اطاعت کیجئے اور رسولؐ کی اطاعت بجا لائیے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اطاعت خداوندی کا جو درجہ ہے وہی اطاعت رسولؐ کا بھی درجہ ہے۔ آنحضورؐ کی زندگی میں تو آپؐ کی اطاعت کی صورت واضح ہے۔ آپؐ کی وفات کے بعد اطاعت کے یہ معنی ہیں کہ آپؐ کے اقوال وارشادات اور آپؐ کے بیان کردہ اوامر ونواہی کو واجب الاطاعت قرار دیا جائے اور ان کو عملی صورت میں اپنایا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان سب کا مجموعہ حدیث نبویؐ کی صورت میں ہمارے پاس بتمام وکمال محفوظ ہے۔ حدیث نبویؐ کا تحفظ و بقاء جہاں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم خصوصیت ہے جو آپؐ کو دیگر انبیاء

درسل میں ایک امتیازی مقام عطا کرتی ہے وہاں یہ اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ اہل اسلام نے اپنے پیغمبرؐ کے اقوال و افعال اور سیر و سوانح کے حفظ و ضبط میں کس قدر محنت شاقہ برداشت کی ہے۔ دنیا کی کسی قوم نے اپنے ہادی و مصلح کے احوال و اقوال اس احتیاط کے ساتھ جمع نہیں کئے قرآن پاک میں فرمایا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ (الاحزاب ۳۶)

اور کسی مومن مرد و عورت کو زیب نہیں دیتا کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو ان کو اپنے معاملہ میں کوئی اختیار باقی رہتا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رسولؐ کا اطلاق کیا کیا جاتا رہے گا اس وقت تک آپؐ کا ہر فیصلہ واجب التسلیم ہو گا ظاہر ہے کہ آپؐ کے فیصلہ جات ہی کا نام حدیث و سنت ہے۔

قرآن پاک میں رسول پاک کی صرف اطاعت کا ہی حکم نہیں دیا گیا بلکہ آپؐ کی اتباع کو بھی لازم ٹھہرایا گیا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب - ۲۱)

مسلمانو! تمہارے لئے رسولؐ کی ذات میں بہترین نمونہ ہے۔

قرآن میں فرمایا

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ (آل عمران — ۳۱)

آپؐ فرما دیں کہ اگر خدا سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اتباع نبوی حب خداوندی کا ذریعہ ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا مطلب یہی ہے کہ آپ کے اقوال و اعمال اور سیرت طیبہ کی پیروی کی جائے انہی کو حدیث کہتے ہیں۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ منکر حدیث حب خداوندی کے دعویٰ میں جھوٹا ہے۔ علاوہ ازیں آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ حدیث نبوی کی پیروی باعث مغفرت ہے

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ (الاعراف ــ ۱۵۸)	اللہ اور اس کے رسول نبی امی پر ایمان لاؤ جو خدا اور اس کے کلام پر ایمان رکھتا ہے اور اس کی پیروی کرو۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا حکم دے کر اتباع رسول کا حکم دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان باللہ کے بعد خود بخود اطاعت الٰہی لازم ٹھہرتی ہے اور اطاعت الٰہی کی واحد صورت یہ ہے کہ رسول کی پیروی کی جائے۔ اس لئے کہ خدا کے احکام ہمیں رسول کے ذریعہ سے ملتے ہیں۔ لہذا اطاعت رسول کے بغیر اطاعت خداوندی ممکن ہی نہیں۔

قرآن پاک نے جس طرح خدا کی نافرمانی کو ضلالت قرار دیا اور اس کے مرتکب کو وعید کا مستحق قرار دیا ہے اسی طرح رسول کی نافرمانی کو بھی ضلالت ٹھہرایا اور اس کا ارتکاب کرنے والوں کو وعید کا مستوجب قرار دیا ہے۔

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (الاحزاب ــ ۳۶)	اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔
وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا (الجن ــ ۲۳)	اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا تو اس کے لئے جہنم کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

Marfat.com

يَوْمَئِذٍ يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَعَصَوُا الرَّسُولَ لَوْ تُسَوَّىٰ بِهِمُ الْأَرْضُ (النساء — ۴۲) ۱

جو لوگ رسولؐ سے سرکشی کرتے ہوئے اس کی نافرمانی کرتے ہیں وہ تمنا کریں گے کہ کاش زمین پھٹ جاتی اور وہ اس میں سما جاتیں۔

قرآن کریم میں اطاعتِ رسولؐ کی اسقدر تاکید کی گئی اور اس ضمن میں اس کثرت سے آیات وارد ہوئی ہیں کہ ان کے بیان کے لئے ایک دفتر چاہیئے۔ مذکورہ صدر آیات مشتے نمونہ از خروارے کی مصداق ہیں۔

؎ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم
چناں کہ حرفِ عصا گفت موسیٰ اندر طور

سوال ۶۷: حدیث کے بارے میں صحابہ کرامؓ اور دیگر اکابر کا نقطۂ نظر کیا تھا؟ نیز عقلی دلائل و براہین سے حدیث کی اہمیت واضح کیجئے۔

جواب: حجیتِ حدیث پر علمائے امت کا اجماع

حدیث کی حجیت و اہمیت کے بارے میں دوسری قسم کے دلائل تاریخی ہیں۔ تاریخ اسلام اس بات کی زندہ گواہ ہے کہ عہدِ رسالتؐ سے لے کر دورِ حاضر تک مسلمانانِ عالم حدیثِ نبویؐ کو دین میں حجت اور سند تصور کرتے آئے ہیں۔ اس امت میں صحابہ کرامؓ کی جماعت مسلمانوں کی نگاہ میں بے حد اکرام و احترام کی حامل ہے اسی جماعت کو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے "خیر القرون" کے الفاظ سے تعبیر کیا اور قرآن نے "كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ" کا مدحیہ سرٹیفکٹ عطا کیا۔ ایسی پاکیزہ جماعت میں یہ مسئلہ کبھی زیرِ بحث نہیں آیا تھا کہ آیا حدیث نبویؐ واجب التعمیل ہے یا نہیں؟

صحابہؓ کی اتباعِ رسولؐ کا یہ عالم تھا کہ آنحضورؐ نے خطبۂ جمعہ کے دوران لوگوں سے کہا اَيُّهَا النَّاسُ اِجْلِسُوْا (اے لوگو بیٹھ جاؤ) حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ذرا دیر سے جمعہ پڑھنے آئے۔ ابھی مسجد میں اسی جگہ پہنچے تھے جہاں جوتے اتارے جاتے ہیں کہ آپؐ کے یہ الفاظ سنے اسی جگہ بیٹھ گئے اور آگے جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ یہاں تک کہ آنحضورؐ کو کہنا پڑا "تَعَالَ يَا ابْنَ مَسْعُوْدٍ" (ابن مسعود آگے آجایئے) یہ صحابہؓ کے جذبۂ اطاعتِ رسولؐ کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ تابعین اور تبع تابعین کے دور میں بھی انکارِ حدیث کا یہ فتنہ پیدا نہ ہوا۔ عہدِ رسالتؐ سے لے کر دورِ حاضر تک ہزاروں محدثین مجددین۔ علماء۔ فقہا۔ صلحاء تمام حدیثِ نبویؐ کو دین میں سند کی حیثیت دیتے چلے آئے ہیں۔ اصولِ فقہ کے علماء قرآن کریم کے بعد حدیثِ نبویؐ کو اسلامی قانون کا دوسرا مصدر و ماخذ تسلیم کرتے آئے ہیں

حدیث کے بارے میں آئمہ اربعہ کی آراء

آئمہ اربعہ رحمہم اللہ تعالیٰ حدیثِ نبویؐ کے حد درجہ قدر دان تھے اور اس کو قرآن کے بعد شریعت کا دوسرا سرچشمہ تسلیم کرتے تھے۔

امام ابو حنیفہؒ: امام بیہقی المدخل میں بسندِ صحیح حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فرماتے سنا "اِذَا جَاءَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَعَلَى الرَّاسِ وَالْعَيْنِ" (جو بات آنحضورؐ سے منقول ہو وہ بسر و چشم تسلیم ہے)

روضۃ العلماء میں امام ابو حنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا گیا ہے۔

اُتْرُكُوْا قَوْلِيْ بِخَبَرِ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَوْلِ الصَّحَابَةِ۔ میرے قول کو حدیثِ نبویؐ اور صحابہؓ کے قول کی موجودگی میں ترک کر دو۔

Marfat.com

امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے

اِذَا صَحَّ الحَدِیثُ فَھُوَمَذْھَبِیْ جب صحیح حدیث موجود ہو تو میرا مذہب وہی ہے۔

(اقوالِ ثلاثہ کے لئے دیکھئے تفسیر مظہری جلد ثانی ص۱۵۹)

خلیفہ منصور عباسی نے امام ابوحنیفہؒ کو لکھا۔ "مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ قیاس کو حدیث کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں" امام صاحبؒ نے جواب میں لکھا امیر المومنین! بات یوں نہیں جیسے آپ کو پہنچی۔ میں تو پہلے کتاب اللہ پر عمل کرتا ہوں اور پھر حدیث رسولؐ پر، پھر خلفائے اربعہؓ کے فیصلہ جات پر، پھر دیگر صحابہؓ کے فتاوی پر۔ جب صحابہؓ میں اختلاف موجود ہو تو میں قیاس کرتا ہوں۔

(المیزان للشعرانی جلد ۱ ص۶۲ طبع مصر)

امام مالکؒ: مسجد نبویؐ کے محدث اور خطیب امام مالک رحمۃ اللہ علیہ روضۂ نبویؐ کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کرتے تھے

"ہر شخص کی بات تسلیم کی جاسکتی ہے (اگر صحیح ہو) اور اسے رد بھی کیا جاسکتا ہے (جب کہ درست نہ ہو) مگر اس قبر والے کی ہر بات واجب التسلیم ہوتی ہے"

(حیات امام مالکؒ ابوزہرہ)

امام شافعیؒ: رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

مجھے کسی ایسے شخص کا پتہ نہیں چلا جس نے حدیث و سنت کا انکار کیا ہو۔

امام احمد بن حنبلؒ: امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو حدیث نبویؐ سے والہانہ محبت تھی۔ مسند احمد بڑی محنت سے تالیف کی اور اس میں چالیس ہزار احادیث درج کیں۔ کسی معاملہ میں جب ان کو حدیث مل جاتی تو اس پر فوراً عمل کرتے۔ صحابہؓ کے اجماع کو حجت قرار دیتے تھے۔ آپ قیاس کے مقابلہ میں مرسل یا ضعیف حدیث

Marfat.com

کو بھی ترجیح دیتے تھے۔ قیاس پر اسوقت عمل کرتے جب کتاب و سنت یا اقوال صحابہؓ میں سے کوئی دلیل بھی موجود نہ ہوتی۔ (اعلام الموقّعین)

قرآن کریم میں فرمایا

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا

جو شخص ہدایت کے واضح ہو جانے کے بعد رسولؐ کی مخالفت کرے اور اہل ایمان کی راہ کے علاوہ کسی اور راستہ کی پیروی کرے تو ہم اسے ادھر ہی پھیر دیں گے جدھر وہ پھر گیا اور اسے جہنم میں ڈال دیں گے۔

چونکہ آجتک تمام اکابر علماء حدیث و سنت کو حجت اور سند مانتے آئے ہیں اس لئے حدیث کو واجب التعمیل قرار دینا بھی ایک "سبیل المومنین" قرار پاتا ہے۔ لہذا حدیث کے دین میں حجت ہونے سے انکار کرنا "مومنین کی راہ" سے گویا روگردانی کرنا ہے۔ لہذا ایسا شخص خدا و رسولؐ کی کھلم کھلا مخالفت کرتا ہے اور اپنے لئے ایک نئی راہ تلاش کرتا ہے۔

حجیّت حدیث کے عقلی دلائل

حدیث کے حق میں تیسری قسم کے دلائل وہ ہیں جو عقل انسانی سے تعلق رکھتے ہیں عقل انسانی سے بلاشبہ حدیث نبویؐ کا حجت ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس ضمن میں چند امور غور طلب ہیں۔

۱: عقل انسانی سب سے پہلے اس بات پر غور کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانی کتابیں کو رسل و انبیاء کے ذریعہ کس لئے بھیجا؟ اس میں کیا مصلحت مضمر تھی؟ اللہ تعالیٰ کے لئے آسان ترین بات یہ تھی کہ آسمانی کتابوں کو مطبوعہ حالت میں زمین

Marfat.com

پر بھیج کر ہر فردِ بشر کے پاس کتاب کا ایک نسخہ پہنچا دیتا۔ یہ اشاعتِ کتب کا موزوں ترین طریقہ تھا۔

قرآن کریم اس عقلی سوال کا جواب یہ دیتا ہے کہ انبیاء کی بعثت کا مقصد یہ ہے کہ وہ خدا کے احکام کو بندوں تک پہنچائیں اور لوگ ان کے احکام کی اطاعت کریں۔ انبیاء خداوندی قوانین کے مطابق زندگی بسر کریں اور لوگ ان کو دیکھ کر اپنی زندگی کو اسی سانچہ میں ڈھالیں۔ قرآن میں فرمایا

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (النساء — ۹)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا صرف اس لئے بھیجا کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی اپنے عمل کے ساتھ آیاتِ الٰہی کی تفسیر کرتا ہے اور اس کی عملی زندگی احکامِ الٰہی کا زندہ پیکر ہوتی ہے۔

۲: اگر آسمان سے صرف کتاب بھیج دی جاتی اور کوئی رسول نہ آتا تو لوگ کتاب کے فہم و ادراک میں ٹھوکریں کھاتے اور اس کی من مانی تفسیر کرتے۔ ہر شخص اپنی تفسیر کو صحیح قرار دیتا اور ان کے درمیان کوئی ایسی مرکزی شخصیت نہ ہوتی جس کی طرف اختلافی امور میں رجوع کیا جاتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محض کتاب کافی نہیں بلکہ کتاب کے ساتھ رسالت کا رشتہ ناقابلِ انقطاع ہے۔ نیز یہ کہ جس طرح کتاب کی اطاعت ضروری ہے اسی طرح رسولؐ کا اتباع فرضِ عین ہے۔

۳: جو شخص آسمانی کتاب کو کافی سمجھتا اور اسوۂ رسولؐ کو غیر ضروری قرار دیتا ہے وہ دراصل اس واسطے اور ذریعے کو کاٹنا چاہتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں اور اپنی کتاب کے درمیان ایک لازمی واسطہ کے طور پر قائم فرمایا ہے وہ گویا یوں کہتا ہے کہ خدا کی کتاب اس کے بندوں کے لئے کافی تھی خدا نے یونہی

Marfat.com

بلا ضرورت رسولؐ بھیجنے کا تکلف کیا (نعوذ باللہ من ذالک)

۴: کتاب خداوندی اور رسولؐ کا باہمی تعلق ثابت ہو جانے کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اسوۂ رسولؐ کی پیروی ان کی حیاتِ جسمانی تک تھی؟ اگر یہ صحیح ہے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ آنحضورؐ کی رسالت صرف اسی عہد تک محدود تھی جب آپ بقید حیات تھے اور آپؐ کے رحلت فرماتے ہی آپؐ کی رسالتؐ کا تعلق عملاً دنیا سے ٹوٹ گیا۔ اس صورت میں رسالتؐ کا منصب بے معنی ہو جاتا ہے۔ اگر رسولؐ کا کام ایک پوسٹ مین کی طرح صرف کتاب کا پہنچا دینا تھا اور اس سے بڑھ کر کسی چیز کی ضرورت نہ تھی تو اس صورت میں رسولؐ کی ضرورت نہ تھی۔ یہ کام تو کوئی فرشتہ بھی کر سکتا تھا بلکہ اللہ تعالیٰ لوگوں تک براہ راست بھی کتاب پہنچا سکتا ہے۔

۵: اگر بنی نوع انسان کی ہدایت کے لئے قرآن کریم کے علاوہ سیرت نبویؐ کے عملی نمونے کی بھی ضرورت تھی تو پھر ۲۳ یا ۲۴ برس کی قلیل مدت کے لئے رسالتؐ کا اتنا بڑا منصب قائم کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ خصوصاً جب کہ رسالت کا یہ عظیم سلسلہ آنحضورؐ کی وفات کے فوراً بعد ختم ہونے والا تھا۔ ایسے غیر ضروری اور ناپائیدار سلسلہ کو اس قدر شد و مد کے ساتھ جاری کرنا علیم و خبیر خداوند تعالیٰ کی شان سے بعید معلوم ہوتا ہے۔

۶: اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ابدی اور دائمی ہے تو وہ احکام بھی دائمی ہیں جن میں آپؐ کی اطاعت کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ آپؐ کو اسوۂ حسنہ فرمایا گیا ہے۔ آپؐ کی پیروی کو رضائے خداوندی کے حصول کا ذریعہ بنایا گیا اور ہدایت کا دامن آپؐ کی پیروی کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ رضائے الٰہی اور ہدایت کے حصول کی ضرورت جس طرح عہد رسالتؐ کے

Marfat.com

لوگوں کو تھی اسی طرح دورِ حاضر کے لوگوں کو بھی ہے اور قیامت تک یہ ضرورت باقی رہے گی۔ اس سے روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ اطاعتِ رسول ؐ اب بھی ضروری ہے۔

۷۔ اگر حدیث و سنت کو دین میں کوئی مقام حاصل نہیں اور رسول ؐ کی بات کسی قدر و قیمت کی حامل نہیں تو پھر رسول ؐ کی یہ بات بھی ناقابل اعتماد ہے کہ قرآن پاک کلام الٰہی ہے۔ اگر قرآن کے بارے میں نبی ؐ کا یہ قول حجت ہے تو اس کے دیگر اقوال بھی یقیناً حجت ہوں گے۔ ورنہ اس کے سب اقوال کو ناقابل تسلیم تصور کرنا ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ قرآن کے بارے میں رسول ؐ کی بات صحیح ہو اور باقی سب باتیں ناقابل یقین ہوں۔

مندرجہ صدر عقلی دلائل سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ رسول کی سنت جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ضروری تھی آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ آپ نے فرمایا تھا۔

میں تم میں دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں جب تک تم ان کو تھامے رہو گے کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ کتاب اللہ[1] اور میری سنت[2]

حضرت عبداللہ بن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

جب تمہارے سامنے کتاب اللہ سے کوئی بات پیش کی جائے تو وہ واجب التعمیل ہے اس کو ترک کرنا جائز نہیں۔ اگر نبی ؐ کی سنت میں سے کوئی چیز پیش کی جائے تو وہ بھی اسی طرح واجب العمل ہے۔

ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز سے فارغ ہوئے تو آپ ؐ نے فرمایا

Marfat.com

"جو میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت زیادہ اختلافات دیکھے گا پس تم میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء کے طریقے پر جمے رہو اور خبردار محدثات اور بدعات سے بچنا کیونکہ ہر بدعت گمراہی ہے۔"

پس یہ حقیقت کسی شبہ سے بالا ہے کہ اسوۂ رسولؐ اور حدیث و سنت ہر لحاظ سے محفوظ ہے اور اس کی پیروی تاقیامت ہر فرد بشر کے لئے لازم ہے۔

حدیث کی کتابت اور جمع و تدوین

سوال نمبر ۶۸: عام تاریخ نویسی اور کتابت حدیث کے مابین کیا فرق ہے؟ دونوں کا تقابل کر کے بتائیے کہ ان میں کونسا طریقہ زیادہ قابل اعتماد ہے اور کیوں؟

جواب: حدیث نبویؐ کی جمع و تدوین اور عام تاریخی واقعات میں جو فرق پایا جاتا ہے۔ وہ درج ذیل ہے۔

تاریخ نویسی اور کتابت حدیث

ا: تاریخی واقعات کا تعلق کسی حکومت، کسی بڑی جنگ، کسی قوم کے کوائف و احوال وغیرہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ بخلاف ازیں حدیث کا تعلق مسلمانوں کی محبوب ترین شخصیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال کے ساتھ ہے۔ ایک شخص کے احوال یاد رکھنا ــــ خصوصاً جب کہ اس کی شخصیت آنحضورؐ کی طرح مکرم و معظم ہو ــــ اس کی نسبت کہیں آسان تر ہے کہ مختلف لوگوں کے حالات یاد رکھے جائیں اور ان کو روایت کیا جائے۔ یہ یادداشت اور بھی آسان ہو جاتی ہے جب کہ واقعات کو بیان کرنے والے صحابہ کرامؓ جیسے لوگ ہوں جو آنحضورؐ کی ذات گرامی کے ساتھ والہانہ شغف رکھتے تھے اور ایک لمحہ بھی آپؐ سے جدا نہیں

Marfat.com

ہونا چاہتے تھے۔

۲: یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مورخین یعنی صحابہؓ کرام کا باہمی تعلق ایک چشم دید گواہ کا تھا جس کی بنیادیں عشق و سرمستی۔ والہانہ محبت اور عظمت و اطاعت کے جذبات پر قائم تھیں اور جو ہر چیز سے دست بردار ہو کر صرف آپؐ کی ذات میں گم ہونے کا آخری اور حتمی فیصلہ کر چکے تھے۔ فریقین کے درمیاں کسی قسم کا حجاب حائل نہ تھا۔ نبیؐ اور صحابہؓ مسجد میں، بازار میں، گھر میں، سفر میں، حضر میں ہر جگہ ملتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے آپؐ کی زندگی کے ہر ہر واقعہ اور ہر ہر جز کو پوری طرح محفوظ رکھا تھا۔ اور اس کو دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری بھی وہ قبول کر چکے تھے۔ کیونکہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منیٰ کے میدان میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا۔

"اللہ تعالیٰ اس بندے کو تر و تازہ رکھے جس نے میری بات سنی پھر اسے یاد رکھا اور جس نے نہیں سنا ہے اس تک پہنچا دیا۔ تم میں سے جو حاضر ہے وہ غائب کو پہنچا دے ان باتوں کو یاد رکھو اور جو تمہارے پیچھے ہیں انہیں اس سے مطلع کرتے رہو کیونکہ تم مجھ سے سن رہے ہو۔ تم سے بھی سنا جائے گا۔ جن لوگوں نے تم سے سنا ہے ان سے بھی لوگ سنیں گے"۔ (صحاح ستہ)

۳: آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کو جن دینی حقائق کی اشاعت کا ذمہ دار بنایا تھا وہ اس کے چھپانے کو شرعی جرم خیال کرتے تھے اس لئے کہ صحابہؓ کو آنحضورؐ کی یہ حدیث یاد تھی۔ آپؐ نے فرمایا

"جس سے علم کی کوئی بات پوچھی جائے اور وہ اسے چھپائے تو قیامت کے دن اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی"۔

آنحضورؐ کی اسی تعلیم کا اثر تھا کہ بعض صحابہؓ سے ایسی روایات نقل کی گئی ہیں

Marfat.com

جو انہوں نے عالم نزع میں اس خوف کی وجہ سے بیان کر دیں کہ ان پر علم کو چھپانے کا الزام نہ آجائے۔

۴ : آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ "جو شخص مجھ پر قصداً جھوٹ باندھے گا اس کا ٹھکانا آگ میں ہوگا" عقل انسانی یہ باور کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں کہ صحابہ جس درجہ کے مخلص مومن تھے ایسا شخص آنحضور پر والسنۃ جھوٹ باندھنے کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ صحابہ ایسے سیرت وکردار کے آدمی سے اس بات کی توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی۔ خصوصاً جب کہ قرآن نے بھی خدا پر جھوٹ باندھنے والے کو سب سے بڑا ظالم قرار دیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے کثیر الروایت صحابی حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی احتیاط روایت کا یہ عالم تھا کہ جب بھی حدیث بیان کرنے لگتے تو کہتے "صادق و مصدوق ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "جس نے مجھ پر قصداً جھوٹ باندھا چاہیئے کہ اپنا ٹھکانا آگ میں تیار کرے"

اس کے بعد جو حدیث بیان کرنا چاہتے بیان کرتے۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ صحابہ رضی آپ کا یہ ارشاد سن کر بھی آپ پر جھوٹ باندھنے کی جسارت کرتے۔

۵ : اصحاب رض رسول کو خداوند تعالیٰ کی جانب سے آنحضور کی زندگی کا محافظ و مبلغ قرار دیا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ صحابہ جیسے مورخین کو اپنی تاریخ سے کس حد تک وابستگی تھی اور انہوں نے اس تاریخ کی کتابت و حفاظت میں کس حد تک جانفشانی و عرق ریزی سے کام لیا ہوگا جن کے نزدیک آنحضور کا ایک ایک بال دنیا و مافیہا سے عزیز تر تھا ان کے نزدیک آپ کے ملفوظات گرامی کس قدر بیش قیمت ہوں گے۔

۶ : حدیث نبوی کے مذکورہ صدر قابل اعتماد مآخذ و مصادر کے مقابلہ میں

Marfat.com

تاریخی واقعات نہایت غیر اہم اور بے وقعت نظر آتے ہیں۔ تاریخی واقعات کی کل کائنات قبروں کے کتبے، چند پرانے سکے، کھنڈرات اور خود نوشت سوانح ہیں جن کی کوئی مستند سرے سے موجود ہی نہیں۔ عین ممکن ہے کہ قبر پہ تختی کسی نے بعد میں لگا دی ہو۔ یہ واقعات ایک شخصی روایت کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا کوئی چشم دید گواہ موجود نہیں۔

۷۔ تاریخی واقعات کے عین برعکس مسلمانوں کا یہ تاریخی سرمایہ جسے حدیث کہتے ہیں ایک امتیازی شان کا حامل ہے اس تاریخی سرمایہ کے محافظ و مورخ ایک لاکھ سے بھی زیادہ ہیں جن میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی شریک ہیں۔ یہ تمام مورخ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے عینی شاہد ہیں جنہوں نے اپنی آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔ آنحضور کی زندگی کا کوئی پہلو ان گواہوں سے پوشیدہ نہ تھا۔ یہاں ایسی کسی تقسیم کا امکان نہ تھا کہ زندگی کا کچھ حصہ پبلک کے سامنے ہو اور باقی زندگی پر تاریکی کے پردے پڑے رہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ کی خانگی زندگی کی تفصیلات تک منظر عام پہ آگئیں۔ اس لئے کہ آپ کی پوری زندگی مسلمانوں کے لئے اسوۂ حسنہ ہے۔

سوال ۷۹: حدیث کی جمع و تدوین پہ ایک مختصر مقالہ لکھیے۔

جواب: کتابت حدیث کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ پائی جاتی ہے کہ اس کا آغاز ہجرت کے دو ڈھائی سو سال بعد اس وقت ہوا جب صحاح ستہ کے مولفین پیدا ہوئے اور انہوں نے حدیث کی یہ چھ مشہور کتب تالیف کیں۔ یا اس سے ذرا آگے بڑھ کر یہ کہہ دیا کہ بنو امیہ کے عہد خلافت میں ابن شہاب زُہری نے کتابتِ حدیث کا بیڑا اٹھایا۔ یہ بات جس قدر مشہور ہے اسی قدر بے بنیاد بھی ہے۔

کتابت حدیث عہد رسالتؐ میں

یہ حقیقت ہے کہ کتابتِ حدیث کی داغ بیل عہدِ رسالتؐ میں پڑ گئی تھی۔ صحابہؓ حدیث کی زندہ کتاب تھے اور کتابت حدیث کا آغاز بھی انہی سے ہوا۔ یہ درست ہے کہ حدیث کی باقاعدہ تدوین آگے چل کر ہوئی۔ مگر صحابہؓ نے اس ضمن میں جو خدمت انجام دی تھی اگر اس پر اکتفا کیا جاتا تو حدیث کا وہ ذخیرہ بھی کچھ کم نہ تھا۔ ذیل میں کتابتِ حدیث سے متعلق صحابہ کے چند واقعات مذکور ہیں:۔

۱ : جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو ایک "تحریری دستورِ مملکت" لکھوا کر ریاستِ مدینہ میں نافذ کیا۔ یہ کتابتِ حدیث کا پہلا ثبوت ہے۔ اس تحریر میں آپؐ نے مہاجرین، انصار مدینہ اور یہود کے حقوق و فرائض متعین فرمائے۔

۲ : مدینہ تشریف لاتے ہی آپؐ نے مردم شماری کرائی اور فرمایا "مجھے ان لوگوں کے نام لکھوا دو جو حلقہ بگوش اسلام ہوئے ہیں"۔

۳ : سرکاری دستاویزات اور معاہدوں کا سلسلہ ہجرت سے پہلے ہو جاری ہو چکا تھا۔ چنانچہ آپؐ نے تمیم داری کو فلسطین کا شہر "حبرون" جاگیر میں دیا تھا۔ نیز سراقہ بن مالک کو پروانۂ امن لکھا گیا۔

۴ : سنہ ۱ھ میں قبیلہ جہینہ کو حلیف بنا کر ان سے تحریری معاہدہ کیا۔ اسی طرح بنی ضمرہ سے جو تحریری معاہدہ کیا تھا اس کا مسودہ اب تک موجود ہے۔

۵ : سنہ ۵ھ میں آپ نے بنو فزارہ اور غطفان سے معاہدہ کر کے ایک دستاویز لکھوائی جسے بعد میں ضائع کر دیا گیا۔

۶ : سنہ ۶ھ میں حدیبیہ کا مشہور صلح نامہ تحریر کیا گیا جس کے الفاظ پر کافی ستدبہ قدح ہوئی۔

Marfat.com

۷ : سنہ ۹ ھ میں آل اکیدر دومۃ الجندل سے تحریری معاہدہ کیا اور قیصر و کسریٰ مقوقس اور نجاشی وغیرہ شاہان عالم کو تبلیغی خطوط لکھے۔

۸ : انتظامی ضرورتوں کے پیش نظر آپؐ نے مختلف حکام کو جزیرہ نمائے عرب کے اطراف و اکناف میں جو ہدایت نامے بھیجے وہ تاریخ میں محفوظ ہیں۔

غرض یہ کہ اس قسم کی سیاسی دستاویزیں تحریر کرنے کا کام عہد رسالت میں شروع ہو گیا تھا۔

کتابت حدیث میں صحابہؓ کا کردار

مندرجہ بالا بیان اس امر کی آئینہ داری کرتا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم احادیث کی نشر و اشاعت کا بڑا اہتمام فرماتے تھے۔ تاہم آغاز اسلام میں آپؐ نے احادیث لکھنے سے اس لئے روک دیا تھا کہ قرآن و غیر قرآن دونوں مخلوط نہ ہو جائیں۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا

"قرآن کے سوا مجھ سے کچھ نہ لکھا کرو جس نے کچھ لکھا ہے وہ مٹا دے"۔

(صحیح مسلم)

جب صحابہ میں قرآن اور غیر قرآن کا شعور پیدا ہو گیا تو آپؐ نے کتابت حدیث کی اجازت مرحمت فرمادی۔ بعض محدثین مثلاً امام بخاری نے حضرت ابو سعید خدری کی روایت کو موقوف یعنی انہی کا قول قرار دیا ہے۔ اس صورت میں یہ حدیث مرفوع نہ ہوگی۔ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی بحوالہ فتح الباری)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے کتابت حدیث کی اجازت ملنے پر صحابہؓ کرام نے عہد رسالت میں کتابت حدیث کا بیڑا اٹھایا۔ تاہم وہ زیادہ تر حافظہ پر اعتماد کرتے رہے۔ عربوں کی قوت حافظہ ضرب المثل کی حد تک مشہور رہی ہے۔ اور صحابہؓ نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ عہد رسالتؐ کے واقعات سے معلوم

ہوتا ہے کہ اس دور میں کتابت حدیث کی داغ بیل پڑ گئی تھی۔ عہد صحابہ رضی اللہ عنہ میں حدیث نویسی کے چند واقعات ملاحظہ ہوں۔

۱: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے سوا کسی صحابی کو مجھ سے زیادہ حدیثیں یاد نہ تھیں۔ اسکی وجہ تھی کہ عبداللہ رضی اللہ عنہ آپ سے جو کچھ سنتے وہ لکھ لیا کرتے تھے اور میں نہ لکھتا تھا (بخاری شریف جلد اول)

بعض لوگوں نے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کبھی خوش ہوتے ہیں کبھی ناخوش اور تم سب لکھتے چلے جاتے ہو۔ چنانچہ آپ نے لکھنا چھوڑ دیا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلا تو فرمایا تم لکھ لیا کرو اس زبان سے جو کچھ نکلتا ہے حق نکلتا ہے۔

(ابوداؤد جلد دوم ص)

۲: بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قبیلہ خزاعہ کے لوگوں نے فتح مکہ والے سال بنو لیث کے ایک شخص کو قتل کر دیا۔ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پتہ چلا تو آپ نے اونٹنی پر سوار ہو کر مکہ کی حرمت و عزت کے بارے میں خطبہ دیا۔ ایک یمنی شخص ابو شاہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ یہ باتیں مجھے لکھوا دیجئے! چنانچہ اس کیلئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ خطبہ لکھنے کی ہدایت فرمائی۔ (بخاری و مسلم)

۳: آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم زکوٰۃ کے احکام و مسائل لکھوا کر زکوٰۃ فراہم کرنے والے عمال کو بھیجتے تھے۔ یہ احکام حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کے پاس تحریری شکل میں موجود تھے۔

(دار قطنی کتاب الزکوٰۃ ص ۲۰۹)

۴: حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس متعدد احادیث لکھی ہوئی موجود تھیں۔ جن کو آپ اپنی تلوار کے غلاف میں رکھتے تھے۔ ایک بار لوگوں کی درخواست پر آپ نے دکھایا تھا۔ (بخاری شریف)

۵: آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کی شرائط لکھوائیں [illegible] اور ایک

Marfat.com

نقل اپنے پاس رکھی تھی۔ (طبقات ابن سعد [illegible])

۶: عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو جب آپ نے یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو صدقات، دیات اور فرائض سے متعلق احکام لکھوا کر ان کو دئے۔ (کنز العمال جلد ۳ صفحہ ۱۸۶)

۷: عبد اللہ بن الحکم رضی اللہ عنہ کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خط تھا جس میں مردہ جانوروں سے متعلق احکام تحریر تھے۔ (معجم صغیر)

۸: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک تحریر تھی جس میں زکوٰۃ سے متعلق شرعی احکام درج تھے۔ (دار قطنی [illegible])

خلاصہ یہ کہ اس قسم کی متعدد روایات سے ثابت ہے کہ حدیث کا بڑا سرمایہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جمع ہو چکا تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے اس میں اور اضافہ کیا۔ جب تابعین کا دور آیا تو انہوں نے اس کام کو اور وسعت دی۔ آخر صحاح ستہ کے مؤلفین نے کتابت حدیث کے نا تمام کام کی تکمیل کر دی۔ چنانچہ احادیث کا آج یہ عالم ہے کہ قرآن کریم کے بعد ذخیرۂ علم میں جو چیز سب سے زیادہ قابل اعتماد اور صحیح ترین شکل میں محفوظ ہے وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہیں۔

ماخذ سوم — اجتہاد

سوال [illegible]: اجتہاد سے کیا مراد ہے اور اسلامی شریعت میں اس کو کیا مقام حاصل ہے؟

جواب: بعض فقہاء نے کتاب و سنت کے بعد اجتہاد کو اسلامی قانون کا تیسرا ماخذ قرار دیا ہے۔ اصول فقہ کے اکثر علماء کے نزدیک کتاب و سنت

Marfat.com

سے بعد اجماع امت قانون کا تیسرا ماخذ اور قیاس یا اجتہاد چوتھا ماخذ ہے۔ اسی طرح اسلامی قانون کے مصادر چار ہوں گے۔

اجتہاد کی تعریف

اجتہاد کے لغوی معنی پوری پوری کوشش صرف کرنے کے ہیں۔ اصطلاحاً اجتہاد اس کوشش کو کہتے ہیں جو شرعی دلائل سے احکام حاصل کرنے کیلئے کی جائے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس مسئلہ کے بارے میں کوئی شرعی دلیل موجود نہ ہو اور اس پر علماء کا اجماع بھی منعقد نہ ہوا ہو اگر مجتہد کوئی دوسرا مسئلہ تلاش کرے اتحاد وصف کی بنا پر دونوں پر ایک حکم لگانا کو اجتہاد یا قیاس کہتے ہیں چونکہ شرعی احکام کسی نہ کسی غرض و مقصد پر مبنی ہوتے ہیں اور یہی مقصد ان میں حلت و حرمت کا فیصلہ صادر کرنے کیلئے معیار و مدار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لئے فقہاء کسی مسئلہ کی علت معلوم کر کے جب کسی دوسرے مسئلہ میں بھی علت دیکھتے ہیں تو اشتراک علت کی بنا پر دونوں کو ایک حکم میں شریک کر دیتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اجتہاد سے کام لیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میرے والد پر حج فرض ہے اور وہ بوڑھا ہونے کی بنا پر سواری کے قابل نہیں۔ کیا میں اس کی جانب سے حج کر سکتا ہوں؟ آپ نے دریافت کیا کیا تم اپنے بھائی بہنوں میں سب سے بڑے ہو؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ فرمایا اگر تمہارے والد پر قرض ہوتا اور تم ادا کر دیتے تو کیا یہ کافی تصور کیا جاتا یا نہیں؟ اس نے عرض کیا ہاں۔ فرمایا تو اپنے والد کی طرف سے حج ادا کرو۔ (اعلام الموقعین جلد ۱ ص ۲۳۹)

علامہ آمدی اپنی کتاب "الاحکام فی اصول الاحکام" میں اجتہاد کی تعریف

Marfat.com

اس طرح کرتے ہیں۔

علمائے اصول کے نزدیک اجتہاد اس انتہائی کوشش کو کہتے ہیں جو کسی شرعی مسئلہ کے بارے میں یہ معلوم کرنے کے لئے عمل میں لائی جاتی کہ یہ مسئلہ شریعت کے موافق ہے۔ (الاحکام جلد ۴ صفحہ ۲۱۸)

امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب "الموافقات" میں اجتہاد کی یہ تعریف کرتے ہیں

"شرعی احکام معلوم کرنے اور ان کو حالات پر تطبیق دینے کے لئے انتہائی کوشش کا نام اجتہاد ہے" (الموافقات جلد ۴ صفحہ ۸۹)

مندرجہ بالا بیان سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ اجتہاد کی صورت میں کسی مسئلہ کا حکم براہ راست کتاب و سنت سے اخذ نہیں کیا جاتا بلکہ کتاب و سنت کے اشارے سے ایک حکم معلوم کرنے کی کوشش (اجتہاد) کی جاتی ہے۔ اس لئے اس کو کتاب و سنت کی جانب منسوب کرنے کی بجائے اجتہاد کہا جاتا ہے۔

اجتہاد کی شرائط

چونکہ اصطلاحاً اجتہاد اس کوشش کا نام ہے جو کتاب و سنت کے اشارات سے کوئی حکم نکالنے کے لئے عمل میں لائی جاتی ہے۔ اس سے صاف سمجھ میں آتا ہے کہ اجتہاد کے لئے مخلصانہ جہد و سعی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ناتمام سعی اس لئے بے کار ہے۔ جب تک طلب و تحقیق کے سب ذرائع استعمال نہ کئے جائیں اجتہاد کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اجتہاد کے لئے انتہائی جہد و سعی کا ضروری ہونا مشہور حدیث معاذ رضی اللہ علیہ سے بھی معلوم ہوتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو دریافت کیا کہ پیش آمدہ مسائل میں فیصلہ کیوں کر صادر

Marfat.com

کروگے؟ انہوں نے عرض کیا کہ کتاب اللہ سے حکم معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر کتاب اللہ میں وہ حکم نہ ملے تو پھر؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کی پھر آپ کی سنت میں اسکا حل تلاش کروں گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر سنت میں بھی نہ ملے تو پھر کیا کروگے؟ حضرت معاذ رضی اللہ تعالےٰ نے عرض کیا "ثُمَّ اَجْتَهِدُ رَأْیِیْ" پھر میں اپنی صحیح رائے نکالنے کی کوشش کروں گا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی تصدیق فرمائی اور اس پر خدا کا شکر ادا کیا۔

اس حدیث میں اجتہاد کو کتاب وسنت کے بعد احکام کے نکالنے میں تیسرا درجہ دیا گیا ہے۔ امام شعبی رحمۃ اللہ عنہ قاضی شریح رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ایک خط میں انہیں لکھا تھا۔

"جب کوئی واقعہ پیش آئے تو کتاب اللہ کی روشنی میں اسکا فیصلہ صادر کیجئے اگر ایسا حادثہ رونما ہو جو کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود نہ ہو تو لوگوں کے اجماع کے مطابق فیصلہ کیجئے اگر ایسی صورت حال پیش آئے جو کتاب وسنت میں مذکور نہ ہو اور اس پر اجماع بھی منعقد نہ ہوا ہو تو اندریں صورت، اگر چاہیں اپنے اجتہاد کے مطابق فیصلہ کریں اور اگر چاہیں اسے ملتوی کر دیں التوا میرے خیال میں بہتر ہی ہو گا۔"

(الملل والنحل شہرستانی جلد ا صفحہ ۱۵۷)

مذکورہ خط میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے مخاطب قاضی شریح رحمۃ اللہ علیہ تھے جو عظیم قاضی اور مفتی تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو اجتہاد کی اجازت دی تھی۔ مندرجہ صدر بیانات سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ اجتہاد کے لیئے جہد کامل شرط ہے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کا ارشاد "اَجْتَهِدُ بِرَأْیِیْ" اس امر کا بین ثبوت ہے کہ اجتہاد میں سہل نگاری اور

تغافل شعاری کی اجازت نہیں۔

اجتہاد کوئی کھیل نہیں کہ ہر کس و ناکس اس میں حصہ لینے لگے۔ اس کیلئے کتاب و سنت کا گہرا علم اور ان حالات سے پوری پوری واقفیت ضروری ہے جن کے بارے میں شریعت کا حکم مطلوب ہے۔ اس لئے جب تک کوئی شخص علم دین میں ماہرانہ بصیرت نہ رکھتا ہو وہ قانون کی معمولی چیزیں بھی سمجھنے پر قادر نہیں اجتہاد تو ایک مشکل کام ہے۔ اجتہاد کا صرف یہی مطلب نہیں کہ قانون کی موٹی موٹی دفعات سمجھ لی جائیں بلکہ کتاب و سنت کے اشارات و مضمرات شریعت کے لوازمات و مقتضیات کی روشنی میں نئے پیش آمدہ مسائل کا شرعی حکم متعین کیا جائے۔ اس کام کے لئے اعلیٰ فنی قابلیت بلکہ ذوق سلیم کی ضرورت ہے۔

شرعی علوم میں بصیرت تامہ حاصل کئے بغیر کوئی شخص اجتہاد کا اہل نہیں ہو سکتا۔ یہ بات درست ہے کہ اسلام میں اجتہاد کسی مخصوص شخص کی میراث نہیں مگر یہ غلط ہے کہ ہر جاہل اور علوم اسلامیہ و عربیہ سے نابلد شخص اجتہاد کی مسند پر فائز ہو سکتا ہے۔ جس کام کے لئے صلاحیت و استعداد شرط اولین ہو اس کا مجاز ہر شخص کیسے ہو سکتا ہے۔ اس قابلیت کے ساتھ ساتھ اجتہاد میں غور طلب ذمہ داری کا بھی سوال ہے۔ جو شخص اجتہاد کرتا ہے وہ صرف لوگوں کے دنیوی معاملات ہی میں دخل نہیں دیتا بلکہ ان کے دین اور ان کی آخرت کے معاملے میں بھی ذمہ دار ٹھہرتا ہے۔ بنا بریں نااہل ہونے کے باوجود اگر وہ اجتہاد کرنے بیٹھتا ہے تو صرف اپنی ہی آخرت برباد نہیں کرتا بلکہ دوسرے بہت سے لوگوں کی آخرت بھی خطرے میں ڈالتا ہے۔ اصول فقہ کی کتابوں میں اجتہاد کی تین شرطیں بیان کی گئی ہیں ۔۔

۱: اجتہاد وہ شخص کرسکتا ہے جو کتاب و سنت میں ماہرانہ بصیرت رکھتا ہو
۲: وہ شخص حالات و معاملات پر گہری نگاہ رکھنے والا اور ان کے متعلقات و لوازمات سے پوری طرح آگاہ ہو۔
۳: وہ اعلیٰ سیرت و کردار کا آدمی ہو تاکہ لوگ دینی معاملات میں اس پر اعتماد کرسکیں۔

اجتہاد کی ضرورت

جس طرح مادی زندگی کے لئے مادی وسائل و ذرائع مثلاً ہوا پانی اور غذا کی ضرورت ہے اسی طرح روحانی و ایمانی زندگی کے قیام و بقا کے لئے اجتہاد کی ضرورت ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی میں تازہ بتازہ اور نو بہ نو مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہ نو پید مسائل عہد ماضی میں نہ تھے یہی وجہ ہے کہ کتاب و سنت میں ان کا کوئی حل موجود نہیں ہے۔ ایک کامل نظام زندگی ہونے کی حیثیت سے اسلام نے ہر قسم کے پیش آنے والے حالات میں غیر معلوم احکام کو شریعت کی روشنی میں طے کرنے کا انتظام کیا ہے اور ہر زمانے کے ماہرین شریعت کا فریضہ ٹھہرایا ہے اجتہاد کرکے دین کو نئے حالات پر منطبق کریں اور جدید مسائل کا حل تلاش کریں۔ اگر ان مسائل کو شریعت کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش نہ کی جائے تو ہماری زندگی کا ربط شریعت سے ٹوٹ جائے گا۔ حالانکہ کوئی مسلمان یہ نہیں چاہتا کہ اس کی عملی زندگی کا تعلق اسلام سے ٹوٹ جائے۔

ہم جن جدید مسائل سے دوچار ہوتے رہتے ہیں اگر ان کے بارے اسلامی احکام معلوم کرنے کے درپے نہ ہوں اور یوں ہی ان پر عامل رہیں تو اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوگا کہ ان مسائل کی حد تک ہماری زندگی

Marfat.com

غیر اسلامی ہو جائے گی بلکہ یہ خطرہ دامنگیر ہے کہ ہم دیگر امور حیات میں بھی رفتہ رفتہ اسلام کی شاہراہ سے ہٹتے جائیں گے اور ہمارے دل سے اسلامی احکام کو معلوم کرنے کا احساس مٹ جائے گا۔ حالانکہ مسلمان کا کوئی قدم بھی اسلامی شاہراہ کے بغیر نہیں اٹھنا چاہیئے، انسانی زندگی ترقی و تغیر کی جن منزلوں سے گذرتی ہے ان میں کوئی مرحلہ بھی ایسا نہیں آتا جہاں مسلمان کو اسلام سے فتویٰ نہ پوچھنا پڑے لہذا کسی مسلمان کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ اجتہاد کے بغیر اپنی مذہبی زندگی کو برقرار رکھ سکے۔

Marfat.com

اسلام کے معاشی اصول

سوال ۱: معاشی مسئلہ کی اہمیت و ضرورت پر ایک مختصر نوٹ قلمبند کیجئے۔

جواب: معاشیات کی اہمیت ہمیشہ سے تسلیم کی جاتی رہی ہے مگر دورِ حاضر کے گوناگوں مسائل نے اس کی اہمیت میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے کیونکہ آج کے مشینی دور میں سائنس کی بے پناہ ترقی اور حیرت انگیز ایجادات اور زرعی، صنعتی اور تجارتی میدانوں میں ارتقاء کے باوجود انسانوں کی اکثریت پہلے کی طرح ضروریاتِ زندگی سے محروم ہے بلکہ عزبت و افلاس، بے روزگاری و بیکاری اور معاشی و معاشرتی ظلم و ستم کا شکار ہے۔

دراصل ذرائع پیداوار میں اضافے کے ساتھ ساتھ انسانی آبادی کی کثرت، انسانوں کی خود غرضی و لالچ، مادہ پرستانہ زینت اور عیش و عشرت کے رجحانات بھی بڑھتے چلے گئے ہیں۔ یہ تمام برائیاں اور خرابیاں مغربی سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار ہیں۔ آخر ان کے ردعمل میں انتہا پسند مادی نظریہ اشتراکیت نے جنم لیا مگر معاشی مسئلہ اس سے بھی حل نہ ہو سکا۔ غریب طبقہ پھر بھی غریب ہی رہا۔ اور ان تمام کوششوں اور ترقی کے باوجود انسان مجموعی خوشحالی سے محروم رہا ہے۔

چنانچہ اس دور میں معاشی مسئلہ ایک انفرادی مسئلہ نہیں رہا بلکہ یہ مسئلہ اب ملکی و قومی حیثیت سے درپیش ہے اور اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو پوری دنیا کو اس کا سامنا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں معاشی مسئلہ سیاسی معاملات

Marfat.com

پر اس حد تک اثر انداز ہو رہا ہے کہ معاشی استحکام کے بغیر کسی قوم و ملک کو سیاسی استحکام بھی حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ ہی معاشی آزادی کے بغیر کوئی قوم و ملک سیاسی طور پر آزادی کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ بالخصوص پسماندہ ممالک جن میں اکثریت مسلم ممالک کی ہے اس مسئلہ سے بُری طرح دوچار ہیں۔

لہٰذا نہ صرف بحیثیت ایک آزاد مملکت کے فرد ہونے کے بلکہ بحیثیت مسلمان بھی ہمیں معاشی مسئلہ پر غور و فکر اور جدید مسائل کے پیش نظر اس کا صحیح حل تلاش کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ مختصر یہ کہ معاشی مسئلہ وقت کا ایک اہم مسئلہ ہے اور اس کا معقول حل وقت کی اہم ضرورت ہے۔

سوال ۲۲: معاشی خوشحالی سے کیا مراد ہے؟ تفصیلاً بحث کیجئے۔

جواب: معاشی خوشحالی و فارغ البالی سے مراد یہ ہے کہ ایک ایسا معاشرہ وجود میں لایا جائے جو ہر اعتبار سے معتدل، متوازن، خوشحالی و بہتر ہو اور جس کی بنیاد باہمی عدل و انصاف، اخوت، و مساوات اور ہمدردی و خیر خواہی پر ہو۔

معاشی خوشحالی کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ محض پیداوار بڑھائی جائے یا صنعتی ترقی میں اضافہ کر لیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے بھی معاشی خوشحالی کا حصول ممکن نہیں یہ عین ممکن ہے کہ ایسا ہونے پر تمام پیداوار اور اس کے وسائل و ذرائع پر چند خود غرض افراد قابض ہو جائیں اور انجام کار معاشرے میں خوشحالی کی بجائے بدحالی کا دور دورہ ہو اور بغض و حسد اور طبقاتی نفرت کے جذبات ابھر آئیں۔ لہٰذا معاشی خوشحالی کا اصل مفہوم ایک بہتر و ترقی یافتہ معاشرے کی تشکیل و تعمیر ہے۔ چنانچہ پروفیسر وی ڈیمنٹ (V. DEMENT) اپنی کتاب ریلیجن اینڈ دی ڈیکلائن آف کیپٹلزم میں لکھتا ہے:-

Marfat.com

"صنعتی ترقی اس معاشرے کی خوشحالی کا باعث بن سکتی ہے جس کی زرعی بنیادیں مستحکم ہوں۔ بنیادی اور گھریلو حرفت مضبوط ہو اور جس میں روحانی قوت بھی پائی جاتی ہو"

گویا معاشی خوشحالی کیلئے تین چیزیں درکار ہیں ایک زرعی بنیادوں کا استحکام دوسرے بنیادی اور گھریلو صنعت و حرفت کی مضبوطی اور تیسرے روحانی قوت کی موجودگی لیکن ان اسباب کی موجودگی کے باوجود بھی معاشی خوشحالی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ بلکہ اس مرحلے پر پہنچ کر افراد کے فطری تعلقات کمزور ہونے لگتے ہیں اور زندگی کا معیار بھی بڑھنے کی بجائے گھٹنے لگتا ہے۔ چنانچہ ایک بہتر معاشی نظام کا یہ اسلوب ہے کہ وہ افراد معاشرہ کی انفرادی و اجتماعی سرگرمیوں کو مناسب حد تک بڑھائے اور انہیں مثبت اور تعمیری روش پر رکھے۔ ان سرگرمیوں کا مقصد صنعتی ترقی اور پیداوار میں اضافہ کی بجائے۔ زندگی کے بلند مقاصد اور اعلیٰ اقدار کا حصول ہونا چاہیئے۔ کیونکہ در حقیقت معاشی خوشحالی کا مقصد بھی پورے نظام زندگی کی اصلاح و ترقی ہے اس لئے محض چند جزوی و ضمنی تبدیلیاں مفید نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ پورے معاشی نظام میں ایسی ہمہ گیر انقلابی تبدیلی ضروری ہے۔ جو تعمیری و تخلیقی پہلو لئے ہوئے ہو۔ چنانچہ مشہور ماہر معاشیات فرینکل کا کہنا ہے۔

"حقیقی معاشی ترقی ایک ایسا ہمہ پہلو انفرادی اور سماجی عمل ہے جس کے تحت افراد کے رویے اور اعتقادات اس طور پر نئے سانچوں میں ڈھالے جاتے ہیں کہ وہ اپنی روزمرہ زندگی کی کثیر تعداد سرگرمیوں میں بھی ایک نئی آزادی محسوس کرنے لگتے ہیں۔"

دراصل بقول ماہر معاشیات ڈومر "معاشی ترقی کا انحصار معاشرے کی روح پر ہوتا ہے"۔ معاشرے کا فطری و طبعی ماحول سیاسی خدوخال، تعلیمی و قانونی نظام وغیرہ معاشی ترقی پر یکساں طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی طرح سائنسی ترقی معاشرتی تبدیلیاں اور دیگر نظریات بھی معاشی ترقی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ لہٰذا ہمارے سامنے محض پیداوار میں اضافہ یا صنعتی ترقی نہ ہونا چاہیئے بلکہ ایسی معاشی خوشحالی و ترقی کو حاصل کرنا چاہیئے جس کے بنیادی اوصاف حسب ذیل ہوں :-

(ا)- ترقی درست سمت میں ہو (ب) ترقی تیز رفتار ہو۔ (ج) ترقی صحیح طریقوں سے حاصل کی جائے اور اس ترقی کے نتائج بھی صحیح نکلیں۔

لیکن اس مقصد کے حصول کیلئے پورے نظام زندگی میں بنیادی تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے معاشی، معاشرتی، تعلیمی اور سیاسی نظاموں میں ایسی تبدیلیوں کی ضرورت ہے جو معاشرے کی صحتمند و صالح قدروں پر استوار کریں۔ بالخصوص معاشی نظام کو انسانی قدروں کی بنیاد پر استوار کرنا ضروری ہے تاکہ سرمایہ دار و مزدور اور زمیندار و کاشتکار کے مابین خوشگوار تعلقات بحال ہوں۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے۔

(ا) معاشی خوشحالی صرف بہتر معاشی نظام سے حاصل ہو سکتی ہے۔

(ب) پسماندہ ممالک کا موجودہ نظام ناقص ہے اور معاشی ترقی کے حصول کے لئے اسے تبدیل کرنا اشد ضروری ہے۔

(ج) اس نظام کی جگہ ایسا نظام قائم کرنے کی ضرورت ہے جو ہماری دینی و سیاسی اور تہذیبی و ثقافتی ضروریات کو پورا کر سکے۔ یہی اصل مسئلہ ہے۔

Marfat.com

(۵) وہ نظام جس میں یہ خوبیاں پائی جائیں صرف "اسلامی نظام" ہی ہے۔ لہٰذا معاشی خوشحالی کا حصول صرف "اسلام نظام" ہی میں ممکن ہے۔

اسلام کے معاشی اصول

سوال ۳: اسلام کا معاشی نظام کن اصولوں پر قائم ہوتا ہے؟ وضاحت کیجئے۔

جواب: اسلامی معاشی نظام کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں:۔

(۱) اسلامی معاشی نظام کی سب سے اولین بنیاد یہ ہے کہ اسلام میں معاشی سرگرمیاں مذہب و اخلاق سے الگ نہیں بلکہ معاشی زندگی میں بھی حدود اللہ کی پابندی اور اخلاقی ضابطوں کا احترام سکھاتا ہے۔ اور یہ تقاضا کرتا ہے کہ مسلمان معاشی تگ و دو کے ساتھ ساتھ خدا کے ذکر میں مصروف رہے اور اس کی اطاعت و رضا جوئی حاصل کرتا رہے۔

(۲) اسلام کے معاشی نظام کا دوسرا اصول یہ ہے کہ اس کی معاشی جدوجہد اس کا بنیادی جز ہے۔ اسلام پوری کائنات کو انسان کے لئے میدان عمل قرار دیتے ہوئے اسے ترغیب دیتا ہے کہ وہ حصول معاش کے لئے زیادہ سے زیادہ تگ و دو کرے۔ بے عملی، بے روزگاری اور گداگری کو اسلام سخت ناپسند کرتا ہے۔ اور مثبت طور پر رزق کی تلاش ہر مسلمان پر فرض قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اسلام کے احکام صرف عقائد و عبادات تک ہی محدود نہیں بلکہ معاملات یعنی تجارت و صنعت اور زراعت و ملازمت وغیرہ بھی اس کے دائرہ عمل میں ہیں۔ اور قرآن و سنت میں بھی ان کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔

(۳) اسلامی نظام معیشت کا ایک بنیادی اصول یہ بھی ہے کہ اسلام پیداوار

Marfat.com

پیداوار اور معاشی فروغ کے ساتھ ساتھ حلال و حرام کی تمیز کو بھی لازم ٹھہراتا ہے۔ اسلام ذرائع آمد پر اس بات کی کڑی شرط عائد کرتا ہے کہ اسے جائز ذرائع سے حاصل کیا جائے اور ہر وہ نفع جو حرام ذرائع سے حاصل ہو اسے وہ دوزخ کی آگ قرار دیتا ہے۔ اسی لئے اسلام نے غصب، ڈاکہ، چوری، دھوکہ دہی، قمار بازی، سود خوری، سٹہ وغیرہ جیسے ذرائع آمدن کو ناجائز قرار دیا ہے قرآن و احادیث میں رزق حلال کی جتنی اہمیت بیان کی گئی ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام صرف جائز اور حلال رزق کی کوششوں کو فروغ دیکر ایک فلاحی معیشت وجود میں لانا چاہتا ہے۔

(۴) اسلام کے بنیادی معاشی اصولوں میں ایک حرمت سود بھی ہے۔ اسلام سود کی حرمت پر بہت زور دیتا ہے اور اسے ہر شکل میں حرام قرار دیتا ہے۔ سود کی ممانعت محض اخلاقی بنیادوں پر ہی نہیں بلکہ اس کے معاشی، معاشرتی اور سیاسی نتائج بھی بے حد خطرناک ہیں۔ سود کی بنیاد استحصال زر اور ظلم و تعدی پر ہے اور اس کی وجہ سے ملکی دولت صرف چند سرمایہ داروں کے پاس مرتکز ہو جاتی ہے اور اس طرح پورا معاشرہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔

(۵) اسلامی معاشی نظام کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اس نے لین دین، خرید و فروخت اور تجارت کے لئے ایک ضابطہ اخلاق پیش کیا ہے۔ اسلامی نظام معیشت کی بنیاد خوف خدا اور امانت و دیانت رکھی گئی ہے تجارت باہمی رضامندی سے اور صرف جائز و مباح اشیاء میں ہونی چاہیئے۔ ذخیرہ اندوزی، جوا اور سٹہ کی اسلام نے سختی سے ممانعت کی ہے۔ اسلام یہ بھی مطالبہ کرتا ہے کہ تاجر کو خوش خلق، خدا ترس، سچا، دیانتدار

Marfat.com

اور اعلیٰ اخلاقی کردار کا حامل ہونا چاہیئے۔

(۶) اسلامی نظام معیشت کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اسلام طلب معاش کے حلال ہونے کے ساتھ ساتھ مصارف دولت کے جائز ہونے کا بھی تقاضا کرتا ہے۔ نیز اسراف و فضول خرچی سے بھی سختی سے روکتا ہے کیونکہ یہی چیز بالعموم دولت کے ضیاع، بے انصافی اور ظلم کا باعث بنتی ہے۔

(۷) اسلامی معاشی نظام کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ اسلام ارتکاز دولت کی سختی سے مخالفت کرتا ہے۔ اسلام دولت کے ایک یا چند ہاتھوں میں جمع ہونے کو پسند نہیں کرتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ دولت پورے معاشرے میں گردش کرے اور اس کی تقسیم زیادہ سے زیادہ منصفانہ ہو۔ چنانچہ اسلام نے ارتکاز دولت کو روکنے کے لئے زکوٰۃ، صدقہ و خیرات، انفاق فی سبیل اللہ اور وراثت کے قوانین دیئے ہیں اور اس بات کی ترغیب دی ہے کہ ضرورت سے زائد مال معاشرے پر خرچ کر دیا جائے۔

(۸) اسلامی نظام معیشت کا یہ بھی اصول ہے کہ اسلام تمام زمین اور وسائل فطرت کو خدا کی ملکیت قرار دے کر اس کے تحت انسان کو انفرادی تصرف و ملکیت کا حق دیتا ہے۔ اس طرح اسلام انفرادی ملکیت کو ایک امانت کی شکل دیتا ہے اور اس میں تصرف کے حق کو بہت سی اخلاقی و قانونی پابندیوں سے محدود کرتا ہے تاکہ ظلم و تشدد کی صورت پیدا نہ ہو۔

(۹) اسلام کے معاشی نظام کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ اسلام اس سے فلاحی ریاست قائم کرتا ہے۔ اسلام یہ تقاضا کرتا ہے کہ تمام شہریوں کو

بنیادی ضروریات زندگی فراہم کرنا ریاست کا فریضہ ہے۔ ناداروں، اپاہجوں محتاجوں اور ایسے افراد جن کا کوئی ولی نہ ہو ان کی ذمہ داری بھی حکومت پر عائد کرتا ہے اور اس طرح وہ عدل اجتماعی کو قائم کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ اسلامی نظام معیشت کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا مرکزی تصور انسان اور اس کی معاشی و اخلاقی فلاح ہے۔ وہ معاشی ترقی کے ساتھ اجتماعی عدل شخصی آزادی اور اخلاقی ترقی کو اولین اہمیت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کا معاشی نظام سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں سے اپنے اصولوں اور مقاصد کے اعتبار سے مختلف اور اعلیٰ اور برتر ہے۔

سوال نمبر ۸: اسلام کے نقطہ نظر سے معاشیات اور مذہب و اخلاق کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالئے:-

جواب: اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور جس طرح زندگی کے باقی تمام شعبوں کے بارے میں ہدایات دیتا ہے اسی طرح معاشیات کے متعلق بھی احکام سے آگاہ کرتا ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے معاش، دین کا ایک حصہ ہے۔ اسی لئے قرآن پاک نے مال کو "خیر" اور معاش کو "فضل اللہ" کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ○ فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ وَاذْكُرُوا اللَّهَ كَثِيرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○	اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن کیلئے اذان دی جائے تو تم اللہ کے ذکر کیطرف دوڑو اور لین دین چھوڑ دو یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔ پھر جب نماز ختم ہو جائے تو تم زمین پر پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کا ذکر

Marfat.com

کثرت سے کرتے رہو تاکہ تم نجات پاؤ۔

(الجمعہ: ۶-۱۰)

ان آیات ہی یہ بات واضح کی گئی ہے کہ یہ سب نعمتیں جو انسان کو میسر ہیں خدا تعالیٰ کی عنایت ہیں لہذا ضروری ہے کہ انسان اپنی معاشی زندگی میں خدا تعالیٰ کے احکام و قوانین کی پابندی کرے تاکہ اس کے مفاد کے ساتھ معاد بھی بہتر ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان اگر معاشی جدوجہد میں حدود ربانی کی پابندی کرے تو نہ صرف یہ کہ اسے اطمینان قلب حاصل ہوتا ہے بلکہ یہ عبادت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ اور ہر وہ قدم جو انسان حدود اللہ کی پابندی کرتے ہوئے فکر معاش کے لئے اٹھاتا ہے اس کے عوض نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس جب انسان مادہ پرستی اور عیش کوشی میں مبتلا ہو کر ذکر الٰہی اور اصل فرائض سے غفلت برتنے لگتا ہے تو قابل مذمت ٹھہرتا ہے۔ لہذا اسلام نے جہاں انسان معاشی جدوجہد کو ضروری قرار دیا ہے وہاں اسے اخلاقی ضابطوں کا پابند بھی کیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک نے اچھے مسلمانوں کا کردار یوں بیان کیا ہے

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ	وہ لوگ جنہیں کاروبار اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر اور نماز سے غافل نہیں کرتے۔ (النور: ۳۷)

حقیقت یہ ہے کہ اسلام معاش کو دین و مذہب سے الگ نہیں کرتا بلکہ معاشی قوانین کو مذہب و اخلاق کی حدود میں رکھتا ہے چنانچہ قرآن پاک میں عقائد و عبادات کے ساتھ ساتھ خرید و فروخت قرض، سود، معاہدات، دستاویز اور شہادت وغیرہ کے احکام جا بجا بیان

Marfat.com

ہوئے ہیں۔ اگر معاشیات کا تعلق اخلاق و مذہب سے نہ ہوتا تو پھر یہ احکام قرآن پاک میں کیونکر بیان کئے جاتے۔ پھر قرآن پاک میں حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کا ذکر کیا گیا ہے جو تجارتی اخلاق و ضوابط کی پابندی نہ کرنے کی بنا پر عذاب الٰہی کا شکار ہوئی۔

ان دلائل سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام معاشیات کو مذہب و اخلاق سے ہم آہنگ کرتا ہے اور اس طرح اسلامی معاشیات کا انداز اخلاقیاتی ہے۔

سوال ۵:۔ معاشی جدوجہد کو اسلام میں کیا مقام حاصل ہے؟ اس کے مقاصد بھی تحریر کیجئے۔

جواب: حصول معاش کیلئے جدوجہد فطری تقاضا ہے۔ اسلام جو دین فطرت ہے۔ انسان کے اس فطری تقاضے کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ تلاش معاش کو فریضہ قرار دیتا ہے۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسب حلال کو "فریضۃ بعد الفریضۃ" یعنی عبادت کے بعد سب سے بڑا فرض قرار دیا۔

دراصل اسلام کے نقطہ نظر سے پوری کائنات انسان کے لئے میدان عمل ہے اور انسان کو یہ ترغیب دی گئی ہے کہ وہ حصول معاش اور رضائے الٰہی انسان کی خوشحالی و فارغ البالی کے لئے اس میں جدوجہد کرتا رہے۔ گویا اسلام تکثیر پیداوار یعنی پیداوار کو زیادہ بڑھانے پر زور دیتا ہے۔ یہی چیز اسلام کو سرمایہ داری سے ممیز کرتی ہے کیونکہ سرمایہ داری میں اصل مقصد منافع کی تکثیر کو حاصل ہے یعنی سرمایہ دارانہ نظام صرف نفع بڑھانے پر زور دیتا ہے۔ جبکہ اسلام کل پیداوار کو بڑھانے اور سامان معاش کی زیادہ سے زیادہ فراوانی چاہتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:۔

وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا — اور البتہ ہم نے تمہیں زمین میں جگہ دی

لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ۔

اور اس میں تمہارے لئے سامان معاش مہیا کیا۔ (الاعراف:۱۰)

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ط

اللہ تعالیٰ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے اور اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں تم پر پھیلا دی ہیں (لقمان:۲۰)

اس حقیقت کو واضح کرنے کے بعد کہ تمام زمین اور پوری کائنات کی نعمتیں خدا تعالیٰ نے انسان کے لئے پیدا کی ہیں اسلام حصول معاش اور کسب حلال کے لئے محنت اور جدوجہد کی انسان کو ترغیب دیتا ہے۔ اسلام ہر شخص کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ کثیر پیداوار اور سامان معیشت کو بڑھانے کے لئے سرگرم عمل رہے۔ چنانچہ قرآن پاک اور احادیث میں کئی طرح سے اس جدوجہد کو بیان کیا گیا ہے۔

(۱) سب سے پہلے ان تمام باتوں سے منع کیا گیا ہے جن سے حصول معاش کا جذبہ سست پڑتا ہو۔ چنانچہ بے عملی بے روزگاری اور گداگری کو ناجائز ٹھہرایا گیا ہے اور ان پر سخت وعید سنائی گئی ہے۔ چنانچہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بیکار بیٹھے رہنا مومن کے شایان شان نہیں اور نہ یہ اسے زیب دیتا ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے اور صرف دعا مانگتا رہے کہ اللہ مجھے رزق عطا کرے بلکہ دعا کے ساتھ عملاً بھی جدوجہد کرنی لازم ہے کیونکہ تم جانتے ہو کہ آسمان سے سونا چاندی نہیں برستا۔

ایک دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ گداگری عزت

Marfat.com

دنیا میں یہ بدنما داغ ہے۔ گداگر کے چہرے پر قیامت کے روز گوشت نہیں ہو گا۔" ایک اور حدیث میں فرمایا کہ "قیامت کے دن گداگری کا داغ چہرے پر لے کر آنے سے بہتر ہے کہ تم کام کرو۔" حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسی اور کلہاڑی لے کر جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانا اور معاش کا انتظام کرنا اس سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کیا جائے۔ کیونکہ مانگنے والے کو دینا یا نہ دینا لوگوں کے بس میں ہے مگر محنت کرنے والا لازماً روزی حاصل کر لیتا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ارشاد ہے کہ "جو شخص دنیا کو جائز طریقے سے حاصل کرتا رہے تاکہ سوال سے بچے اور اہل و عیال کی کفالت کرے اور ہمسائے کی مدد کرے تو وہ قیامت کے دن اس حال میں اٹھے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی مانند روشن ہو گا۔"

(۲) اس کے ساتھ ساتھ قرآن و احادیث میں حصول رزق اور تلاش معاش کی مثبت طور پر ترغیب دی گئی ہے اور کسب حلال کو ہر مسلمان پر فرض ٹھہرایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے:-

كُلُوا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا۔ — جو کچھ زمین میں ہے اس میں سے حلال و پاکیزہ کھاؤ (البقرہ)

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا:-

وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا۔ — اور دنیا سے اپنا حصہ بھول نہ جاؤ (القصص ۷۷)

ایک اور جگہ فرمایا:-

وَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا۔ — اور خدا نے جو حلال و پاکیزہ چیزیں تمہیں بطور رزق دی ہیں انہیں کھاؤ۔ (المائدہ ۸۸)

Marfat.com

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رزق حلال کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا:۔

نِعْمَةَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ — نیک آدمی کے لئے اچھا مال کیا ہی اچھی چیز ہے

ایک دوسری حدیث میں فرمایا:۔

طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ — رزق حلال کی تلاش عبادت الٰہی کے بعد فرض ہے۔

حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ نماز فجر کی ادائیگی کے بعد رزق کی تلاش کیا کرو اور غفلت کی نیند نہ سوتے رہو۔ نیز آپ نے فرمایا کہ دنیا کی شرافت مالداری اور سخاوت ہے اور دین کی شرافت تقوی و پرہیز گاری ہے۔ ایک اور حدیث میں فرمایا کہ "صنعت و حرفت سے روزی کمانا انسان پر فرض ہے۔" آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ "روزی کمانے کی جدوجہد میں مغموم و متفکر رہنا بعض گناہوں کا کفارہ ہے۔"

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حصول معاش اور کسب حلال پر جو تاکید کی ہے اس کا اندازہ اس حدیث سے ہوتا ہے جس میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص نے آکر سوال کیا۔ آپ نے اسے کسب حلال کی ترغیب دی اور پوچھا تمہارے پاس کیا ہے۔ اس نے عرض کیا کہ ایک لکڑی کا پیالہ اور ایک چادر۔ آپ نے یہ دونوں چیزیں فوراً فروخت کر کے بازار سے کلہاڑی اور لکڑی منگوائی اور پھر اپنے دست مبارک سے کلہاڑی کا دستہ لگا کر اس کے حوالہ کیا اور جنگل سے لکڑیاں کاٹنے پر لگا دیا۔ کچھ روز بعد وہ شخص آیا تو اس کا چہرہ ہشاش بشاش تھا اور وہ خوشحال نظر آتا تھا۔

اسلام کے انہی احکام کی روشنی میں ہمارے فقہاء نے معاشی جدوجہد کو

Marfat.com

فرض عین (جو ہر شخص پر لازم ہو) اور تکثیر پیداوار کو فرض کفایہ (جو فرض تو سب پر ہو مگر جب کچھ لوگ ادا کر دیں تو سب بری الذمہ ہو جاتے ہیں) قرار دیا ہے۔ چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب "ردالمحتار" میں ہے:

وَمِنْ فُرُوْضِ الْكِفَايَةِ الصِّنَاعَةُ الْمُحْتَاجُ اِلَيْهَا ضروری صنعتوں کو قائم کرنا فرض کفایہ ہے

اسی طرح فقہ شافعی کی مشہور کتاب "المنہاج" میں ہے:

وَمِنْ فُرُوْضِ الْكِفَايَةِ الْحِرَفُ وَالصَّنَائِعِ وَمَا يَتِمُّ بِهِ الْمَعَاشُ	صنعت وحرفت اور وہ تمام چیزیں جو ہمیں معاش کے لئے ضروری ہیں فرض کفایہ ہیں۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اس سلسلے میں مختلف فقہاء کی آراء کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بہت سے شافعی، حنبلی اور دوسرے فقہاء مثلاً امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور امام جوزی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ کا قول ہے کہ جس طرح جہاد فرض کفایہ ہے۔ اسی طرح صنعت وحرفت کا قیام بھی فرض کفایہ ہے کیونکہ ان کے بغیر معاش کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔"

قرآن وسنت کے ارشادات اور فقہائے اسلام کے اقوال سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ معاش انسانی ضروریات میں سے ہے اور معاش کی تکمیل انسانیت کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ جس طرح انسان کی روحانی و اخلاقی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ جہاد کیا جائے اور طاغوتی غلبے اور منکرات سے اپنے آپ کو بچایا جائے اسی طرح جسمانی و مادی ضروریات کی تکمیل کے لئے صنعتوں کا قیام اور تلاش معاش لازمی ہے۔ اسلام دین اعتدال ہونے کے اعتبار سے انسان کی روحانی و مادی دونوں قسم کی ضروریات کو یکساں اہمیت دیتا ہے اور ملکیت کے خلاف جہاد اور حصول معاش دونوں کو فرض کفایہ ٹھہراتا ہے۔

معاشی جدوجہد کی اہمیت و مقام واضح کرنے بعد اسلام اسکے بعض مقاصد بھی متعین کرتا ہے۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے معاشی جدوجہد کا سب سے اولین مقصد تمام انسانوں کو وسائل معاش فراہم کرنا ہے۔ چنانچہ اسلام یہ تقاضا کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے جو وسائل زندگی عطا کئے ہیں انہیں ترقی دی جائے اور پیداوار کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جائے۔ پھر رزق کے خزانوں کو صرف چند ہاتھوں میں محدود نہ رکھا جائے بلکہ ہر دولتمند ضرورت سے زائد دولت کو ضرورتمندوں میں تقسیم کرے اور اسطرح دولت افراد معاشرہ کے درمیان گردش کرتی رہے۔ گویا اسلام معاشیات کی اصطلاح کے مطابق تکثیر پیداوار اور وسائل کی منصفانہ تقسیم کا تقاضا کرتا ہے۔ تاکہ تمام بنی نوع انسان کو معاش فراہم ہو سکے یہی اسلامی نظام معیشت کا بنیادی مقصد ہے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"اولاد آدم کا یہ بنیادی حق ہے کہ رہنے کیلئے گھر، جسم ڈھانپنے کیلئے کپڑا، کھانے کیلئے روٹی اور پینے کیلئے پانی میسر ہو۔"

حصول معاش کے مواقع میسر کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی نظام معیشت کا ایک اہم مقصد غربت و افلاس کا خاتمہ ہے۔ اسلام کا اولین مقصد کفر کا استیصال ہے اور غربت و افلاس اور فقر و فاقہ انسان کو کفر پر آمادہ کرتے ہیں۔ لہٰذا اسلام ایسی معاشی پالیسیاں فراہم کرتا ہے جن سے غربت و افلاس کا مکمل طور پر انسداد ہو سکے تاکہ محتاجی کے سبب کفر نہ ابھرے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَّكُوْنَ كُفْرًا

قریب ہے کہ محتاجی انسان کو کفر تک لے جائے

Marfat.com

دیکھا یہ گیا ہے کہ انسان بعض اوقات غربت و افلاس کے خوف سے اور معیار زندگی کے پست ہونے کے ڈر سے قتل اولاد اور نسل کشی کا ارتکاب کرتا ہے۔ اسلام اس منفی رویے کو سخت ناپسند کرتا ہے اور اس نسل کشی اور انسان کشی کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:۔

وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝

اور اپنی اولاد کو تنگدستی کے ڈر سے قتل نہ کرو ہم انہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی۔ یقیناً ان کا قتل بہت بڑا گناہ ہے

(بنی اسرائیل: ۳۱)

اس آیت کریمہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رازق حقیقی خدا تعالیٰ ہے تمام بنی نوع انسان کو رزق فراہم کرنے کی ذمہ داری لی ہے اور اس نے اس کائنات میں سب کیلئے رزق پیدا کیا ہے۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ قلت وسائل کا واویلا کرنے کی بجائے تلاش معاش کے لئے جدوجہد کرے۔ چنانچہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: "رزق کا دروازہ فرش سے عرش تک کھلا ہوا ہے اور اسباب معاش غیر محدود ہیں۔"

اسلام تلاش معاش کی ذمہ داری امیر غریب اور مرد عورت سبھی پر ڈالتا ہے تاکہ پورا معاشرہ خوشحالی و فارغ البال ہو سکے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ عورت کو گھر میں بیکار بیٹھے رہنے کی بجائے چرخہ کاتنا بہتر کمائی کا موجب ہے۔ اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مالداروں کو بکریاں پالنے اور غریبوں کو مرغیاں پالنے کا حکم دیا ہے تاکہ فارغ البالی حاصل ہو۔

مختصر یہ کہ اسلام عبادات اور دیگر احکام کی طرح حصول معاش پہ بھی تاکید کرتا ہے اور اسے ہر شخص کا فریضہ قرار دیتا ہے۔ اسلام ہر شخص کی توجہ

Marfat.com

اس امر پر مبذول کراتا ہے کہ بحیثیت فرد اور بحیثیت قوم معاشی وسائل کو ترقی دیں اور پیداوار کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیں تاکہ غربت افلاس کا نام و نشان باقی نہ رہے۔ ہر شخص کو معاش میسّر ہو اور پورا انسانی معاشرہ خوشحالی و فارغ البالی نظر آئے۔

سوال ۱۲ :- اسلام نے معاش پر حلال و حرام کی کیا کیا پابندیاں عائد کی ہیں؟ وضاحت کیجئے۔

جواب : اسلام کا اصل مقصد صرف وسائل معاش کو فروغ دینا ہی نہیں بلکہ ان کی منصفانہ عادلانہ اور مصلحانہ تقسیم بھی ہے۔ اس لئے اسلام معاشی جدوجہد اور حصول معاش پر حلال و حرام کی پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اسلام کے نقطہ نظر سے ہر پاک اور مفید چیز جائز اور حلال ہے اور ہر ناپاک اور مضر چیز ناجائز اور حرام ہے۔ اسی لئے اسلام لوگوں کو کسب حلال کا پابند کرتا ہے تاکہ وہ نقصان سے بچے رہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا ط	اے لوگو! زمین میں جو کچھ ہے اس میں سے حلال و پاکیزہ کھاؤ۔

(البقرۃ : ۱۶۸)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد احادیث میں کسبِ حلال کی تاکید فرمائی ہے۔ آپ نے فرمایا "بہترین عمل حلال روزی کمانا ہے"۔ ایک دوسری حدیث میں فرمایا کہ "رزق حلال کی تلاش ایسے ہے جیسے خدا کی راہ میں جہاد و قتال ہے اور رزق حلال کی تلاش میں تھک کر رات کو سو جانے والے سے اللہ راضی ہے"۔ اس کے برعکس حرام روزی کے بارے میں آپؐ نے فرمایا کہ "حرام روزی سے پرورش پایا ہوا گوشت (دوزخ کی) آگ میں ڈالے جانے کا زیادہ مستحق ہے"۔ پھر حرام

Marfat.com

روزی کمانے والوں کو حضور علیہ السلام نے ان الفاظ میں تنبیہ کی ہے کہ حرام خور کی دعا قبول نہیں ہوتی۔"

قرآن و حدیث میں رزق حلال کی جس قدر اہمیت بیان کی گئی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام میں صرف جائز و حلال طریق سے فروغ پیداوار اور حصول معاش کی کوششیں ہوں گی اور ان تمام ذرائع کا پوری طرح سدباب کیا جائے گا جنہیں شریعت حرام قرار دیتی ہے۔ دراصل اسلام بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح چاہتا ہے۔ لہذا اس میں رزق حرام کی کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ حرام روزی سے ظلم و ستم، حق تلفی، دھوکہ دہی اور دیگر مفاسد پھیلتے ہیں اور فرد اور معاشرے کی جسمانی و اخلاقی زندگی مجروح ہوتی ہے۔

الغرض اسلام اپنے معاشی نظام میں حلال و حرام کی پابندی عائد کر کے انسانوں میں معاشی تعاون و مساوات، عدل و انصاف، قسط و توازن اور آزادی جدوجہد کو فروغ دیتا ہے تاکہ حقیقی فلاحی معیشت قائم ہو سکے۔

سوال ۳۳:۔ حرمت سود کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا خلاصہ قلمبند کیجئے۔

جواب:۔ اسلام رزق حلال اور جائز کمائی پر زور دیتا ہے اور تقاضا کرتا ہے کہ دولت صرف حلال ذرائع سے حاصل کی جائے۔ چنانچہ اسلام حرام کمائی کے تمام ذرائع سے اجتناب کی تاکید کرتا ہے۔ بالخصوص ربٰو یا سود جو ناجائز کمائی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

سود سرمایہ دارانہ معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے مگر اسلام کے نقطۂ نظر سے یہ سب سے بڑا معاشی ظلم اور ایک عظیم مہذب ڈاکہ ہے۔

Marfat.com

لہٰذا اسلام سود کی ہر شکل اور ہر قسم کو قطعاً اور مطلقاً حرام قرار دیتا ہے۔ سود مفرد ہو یا مرکب۔ ذاتی ضرورت کے قرضوں پر لیا جائے یا تجارتی و پیداواری قرضوں پر ہر صورت میں حرام ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَوٰا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ۔ (البقرۃ: ۲۷۸)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو سود کا بقایا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

ایک دوسری جگہ فرمایا۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَوٰا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً ص وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ٥ (آل عمران: ۱۳۰)

اے ایمان والو! سود کو کئی گنا بڑھا چڑھا کر نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح حاصل کرو۔

سود کے بارے میں عموماً یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ یہ بھی ایک تجارت ہے کیونکہ سود خواہ اپنے قرض دار سے رقم کے استعمال کے معاوضہ کے طور پر وصول کرتا ہے حالانکہ دونوں کی حیثیت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ قرضدار اکثر اوقات اپنی کسی مجبوری کی بناء پر قرض لیتا ہے۔ اور اگر کاروبار کے لیے قرض لیا جائے تو اس میں نفع و نقصان دونوں کا احتمال رہتا ہے۔ حالانکہ سود میں نفع ہی نفع پیش نظر رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَوٰا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَوٰا (البقرۃ: ۲۷۵)

وہ کہتے ہیں کہ تجارت بھی تو سود کی طرح ہے اور اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے۔

قرآن پاک نے سود کی اس شدت سے حرمت بیان کی ہے کہ جو لوگ سود خوری سے باز نہیں آتے ان کے خلاف اللہ اور اسکے رسول کی جانب سے جہاد کا اعلان کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ۔ (البقرۃ : ۲۷۹)

پس اگر تم ایسا نہ کرو گے تو اللہ اور اسکے رسول کی طرف سے جنگ کے لئے خبردار ہو جاؤ۔

اس سے بڑھ کر قرآن پاک نے سود خوروں کا انجام بڑا ہولناک بیان کیا ہے کہ وہ قیامت کے روز پاگلوں کی طرح بہکے اور لڑکھڑاتے ہوئے اٹھیں گے فرمایا۔

اَلَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ۔ (البقرۃ : ۲۷۵)

جو لوگ سود کھاتے ہیں نہ کھڑے ہو سکیں گے مگر اسطرح جیسے شیطان نے چھو کر خبطی بنا دیا ہو۔

احادیث میں بھی سود کی حرمت اسی طرح بیان ہوئی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود لینے والے۔ سود دینے والے۔ سود کا کاغذ لکھنے والے اور سود کے گواہوں سب پر لعنت فرمائی ہے۔ اور ان سب کو گناہ میں برابر شمار کیا ہے آپؐ نے سود سے اس حد تک بچنے کی تلقین فرمائی ہے کہ آپؐ نے قرضخواہ کو قرضدار سے ہدیہ لینے سے بھی منع فرما دیا چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ "جب کوئی کسی کو قرض دے تو پھر قرض لینے والے سے کوئی ہدیہ قبول نہ کرے"۔

اسلام میں سود کی حرمت محض اخلاقی بناء پر ہی نہیں بلکہ اس سے بھی کہ سود کے معاشی۔ معاشرتی اور سیاسی نتائج بھی بے حد خطرناک ہیں۔ سود کی وجہ سے دولت کی گردش رک جاتی ہے اور معاشرے کی ساری معیشت چند سود خور

Marfat.com

مہاجنوں کے ہاتھوں میں سمٹ جاتی ہے اور باقی معاشرہ غربت و افلاس کا شکار ہو جاتا ہے اور یہی چند سرمایہ دار پورے معاشرے پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اس سے انتشار و اضطراب پھیلتا ہے اور نفرت و کدورت اور حسد و بغض جنم لے کر پورے معاشرے کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کئی قدیم معاشروں کی تباہی و بربادی میں سود کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اور آج بھی اکثر معاشروں کی جڑوں کو یہ کھوکھلا کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام سود کو مکمل طور پر ختم کرتا ہے۔

سوال ۵: اسلامی تعلیمات کی رو سے تجارتی اخلاقیات کے ضابطہ پر روشنی ڈالیئے۔

جواب: اسلام کا معاشی نظام دنیا کے تمام اقتصادی نظاموں میں اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اس نے تجارتی کاروبار کے لئے اخلاقیات کا ایک ضابطہ مقرر کیا ہے تاکہ صالح اور منصفانہ معیشت فروغ پا سکے اور افراد اور معاشرہ کے باہمی تعلقات خوشگوار ہوں۔ اسلام کے تجارتی اخلاقیات کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں۔

۱: باہمی رضامندی اسلام میں تجارت اور لین دین کی بنیاد باہمی تعاون و رضامندی پر رکھی گئی ہے۔ یعنی فریقین اپنے معاملات بغیر کسی جبر و اکراہ کے آزادانہ اپنی مرضی سے طے کریں۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ۔ (النساء : ۲۹)

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق نہ کھاؤ۔ ہاں اگر باہمی رضامندی سے تجارت ہو تو درست ہے۔

اسی آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام صرف باہمی رضامندی سے کئے گئے کاروبار کو جائز قرار دیتا ہے اور اس کے برعکس ایسے تمام لین دین جو ظلم و زیادتی حق تلفی و دھوکہ دہی اور مکر و فریب وغیرہ باطل ذرائع پر مبنی ہوں ناجائز و ممنوع ٹھہرتا ہے۔ اسی طرح معاملات کی وہ تمام صورتیں جن میں کمزوری و مجبوری یا بے بسی سے فائدہ اٹھایا گیا ہو ناجائز ہیں۔ اسی اصول کے تحت ایسے اشتہار یا نفسیاتی حربوں کا استعمال بھی ممنوع ہے جو لوگوں کے حواس کو معطل کر دے اور ان کی آزاد مرضی پر اثر انداز ہو۔ پھر تجارتی منڈی کی آزادی میں خلل ڈالنے والا ہر وہ حربہ بھی ناجائز ٹھہرتا ہے جس سے عموماً سرمایہ دار وقتاً فوقتاً مصنوعی قلت یا بحران پیدا کر کے اپنے ہاتھ رنگتے رہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ اسلامی تجارت کا اولین اصول فریقین کی باہمی رضامندی اور اس آزادانہ لین دین پر اثر انداز ہونے والے تمام حربے ناجائز و ممنوع ہیں۔

۲:۔ دیانت داری

اسلامی تجارت کا دوسرا اصول دیانت داری ہے یعنی لین دین کا ہر معاملہ صاف صاف کھلا کھلا اور برسر عام ہونا چاہیئے۔ مال کی اصل کیفیت گاہک کے آگے رکھ دینی چاہیئے۔ اور کسی قسم کا دھوکا و فریب نہ ہو۔ تجارت کو فروغ دینے کے خفیہ ہتھکنڈے اختیار کرنا اور لوگوں کو غلط فہمی میں رکھ کر سودا فروخت کرنا ناجائز ہے۔ غرض ہر وہ معاملہ جس میں دوسروں کا نقصان مدنظر ہو مثلاً ناپ تول میں کمی۔ معاملے پر معاملہ کرنا وعدہ خلافی کرنا۔ خیانت اور بددیانتی ہے اور ناجائز ہے۔

تجارت میں امانت و دیانت کی اہمیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے واضح ہوتی ہے جس میں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ

اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ ... سچ بولنے والا ایماندار اور تاجر

النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِيْنَ وَالشُّهَدَاءِ (قیامت کے روز) نبیوں، صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔
(ترمذی شریف)

۳ :- جائز اشیاء کی تجارت

اسلامی تجارت کا تیسرا اصول یہ ہے کہ جس چیز کی خرید و فروخت کی جائے وہ فی نفسہ جائز و حلال ہو۔ ہر وہ چیز جس کا استعمال ناجائز و حرام ہے اس کی تجارت بھی اسلام میں ممنوع ہے۔ مثلاً شراب، سور، مردار، بت وغیرہ۔ چنانچہ جب حرمت شراب کا حکم آیا تو بعض صحابہ نے جو شراب کی تجارت کرتے تھے اسے فروخت کر دینے کی اجازت چاہی تو آپؐ نے فرمایا کہ "اب شراب حرام کر دی گئی ہے اور اسکی قیمت بھی"۔ یہی حکم دوسری حرام اشیاء کے لئے ہے۔

۴ :- احتکار کی ممانعت

اسلامی تجارت کا ایک اہم اصول احتکار یعنی ذخیرہ اندوزی کی ممانعت ہے۔ ضروریات زندگی کو اس لئے روک رکھنا کہ ان کی قیمتیں بڑھ جائیں اور نفع زیادہ حاصل ہو احتکار یا ذخیرہ اندوزی کہلاتا ہے اور اسلام میں اس کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احتکار کو ناجائز ٹھہرایا ہے اور اسکے مرتکب پر لعنت بھیجی ہے۔

۵ :- جوا اور سٹہ کی ممانعت

اسلامی تجارت کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ ہر وہ ذریعہ جس سے بغیر مناسب محنت اور بغیر کسی بدل کے ایک فریق کو فائدہ اور دوسرے کو نقصان پہنچتا ہو ناجائز ہے۔ کیونکہ اس سے انتشار و اضطراب پھیلتا ہے اور معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ جوا، سٹہ، لاٹری اور قمار بازی کی دیگر تمام صورتیں اسلام میں ناجائز و ممنوع ہیں۔

Marfat.com

۸:۔ تاجروں کا ذاتی کردار اسلامی تجارت کا ایک اہم اصول یہ بھی ہے کہ اسلام تاجروں کو اعلیٰ اخلاق وکردار پیش کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ تاجر ایسے اخلاق وکردار کے حامل ہوں کہ وہ دوسروں کے سامنے اسلام کی صحیح نمائندگی کریں ان میں دولت جمع کرنے کی ہوس کی بجائے خوش اخلاقی اور لوگوں کی خدمت کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے اور اپنے کاروبار کو پوری محنت ۔ دلجمعی اور مستقل مزاجی سے انجام دینا چاہیئے تاکہ وہ تجارت کا صحیح حق ادا کرسکیں۔

تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام دنیا کے بہت سے ممالک میں مسلمان تاجروں کی بدولت پہنچا ۔مسلمان تاجر جہاں بھی جاتے لوگ ان کی سچائی ۔ دیانت ۔ ہمدردی ۔ خوش خلقی اور خدا خوفی سے متاثر ہو کر قبولِ اسلام پر آمادہ ہو جاتے چنانچہ انڈونیشیا ۔ ملائیشیا ۔ برما ۔ لنکا اور چین وغیرہ ممالک اور برصغیر پاک وہند کے ساحلی علاقوں میں انہی تاجروں کی بدولت اسلام کی اشاعت ہوئی۔

معاش اور اخلاق میں یہی وہ توازن ہے جو اسلامی نظام معیشت کا طرۂ امتیاز ہے۔

سوال ۷۹:۔ اسراف وتبذیر کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا خلاصہ تحریر کیجئے۔

جواب:۔ اسلام جس طرح طلب معاش پر جائز وحلال ہونے کی پابندی عائد کرتا ہے اسی طرح دولت کو جائز مصارف پر خرچ کرنے کا بھی تقاضا کرتا ہے اور اسراف وتبذیر سے روکتا ہے۔ اسراف کے معنی فضول خرچی یعنی ضرورت سے زیادہ خواہ مخواہ خرچ کرنا ہے۔ اور تبذیر کے معنی بے جا صرف کرنا یعنی ناجائز امور پر خرچ

Marfat.com

کرتا ہے۔ قرآن پاک نے ان دونوں کی ممانعت کی ہے۔ فرمایا۔

کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۔ کھاؤ پیو اور فضول خرچی نہ کرو۔

(الاعراف ۱ ۳۱)

دوسری جگہ فرمایا

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ہ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ط (الاسراء: ۲۶-۲۷)

اور بے جا خرچ نہ کرو، بیشک بے جا خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔

اسراف و تبذیر کو اسلام نہ صرف اس لئے روکتا ہے کہ ان سے قومی دولت کا ضیاع ہوتا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ ان کا مقصد نام و نمود اور نمائش و ریاکاری ہوتا ہے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلے میں ارشاد فرمایا ہے کہ "جو شخص جائز ضروریات پورا کرنے کے لئے محنت کرتا ہے وہ اللہ کی راہ میں کام کرتا ہے اور جو محض آن بان کے لئے دولت کماتا ہے وہ شیطان کی راہ میں کام کرتا ہے۔"

درحقیقت اسلام یہ چاہتا ہے کہ دولت کو بے جا اور ناجائز خرچ کرنے کی بجائے ایسے تعمیری اور مفید کاموں پر خرچ کیا جائے۔ اسی لئے اسلام میں اسراف و تبذیر کی سخت ممانعت کی گئی ہے۔

سوال نمبر ۸: ارتکاز دولت کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر واضح کیجئے اور بتائیے کہ اس کا سدِّباب کرنے کے لئے اسلام نے کیا کیا صورتیں تجویز کی ہیں۔

جواب: اسلام دولت کی گردش کا قائل ہے۔ اور ارتکاز دولت یعنی دولت

Marfat.com

کے ایک یا چند ہاتھوں میں جمع ہو جانے کی سختی سے مخالفت کرتا ہے۔ چنانچہ اسلام نے مختلف اخلاقی۔ معاشرتی۔ اور قانونی تدابیر سے اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ دولت پورے معاشرے میں گردش کرے اور اس کی تقسیم زیادہ سے زیادہ منصفانہ و عادلانہ ہو۔ قرآن پاک نے اس سلسلے میں فرمایا ہے :-

کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً م بَیْنَ الْاَغْنِیَاءِ مِنْکُمْ۔ (الحشر: ۷) تاکہ دولت پھر پھر کر تمہارے مالداروں کے پاس ہی نہ رہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس بارے میں ارشاد فرمایا۔

اَقْسِمُوا الْمَالَ بَیْنَ الْفَرَائِضِ عَلٰی کِتَابِ اللّٰہِ (ابوداؤد شریف) مال کو مقرر شدہ حصوں میں کتاب اللہ کے مطابق تقسیم کردو۔

ارتکاز دولت کو روکنے اور دولت کی منصفانہ تقسیم کے لئے اسلام نے مندرجہ ذیل صورتیں تجویز کی ہیں۔

۱: زکوٰۃ زکوٰۃ اسلام کا ایک اہم رکن ہے اور ہر صاحب نصاب مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔ زکوٰۃ سونا۔ چاندی۔ نقدی۔ مال تجارت دفینہ۔ اور صنعتی پیداوار اور مویشیوں وغیرہ پر عائد ہوتی ہے۔ صاحب نصاب سے مراد وہ شخص ہے جس کے پاس مال کی ایک خاص مقدار جمع ہو جائے اور پھر اس میں سے اسے چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ ادا کرنا ہوتا ہے۔

زکوٰۃ کے مصارف بھی قرآن پاک میں بیان ہوئے ہیں اور یہ محتاج۔ مصیبت زدہ معذور اور معاشرہ کے گرے پڑے لوگوں کو ادا کرنا ہوتی ہے۔ یہ کوئی خیرات نہیں بلکہ فقراء و مساکین کا حق ہے۔ چنانچہ قرآن پاک کا ارشاد ہے۔

وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا بھی حق ہے۔

Marfat.com

اس آیت کریمہ سے واضح ہوتا ہے کہ مال و دولت صرف اسی کا نہیں جو اسے کمانے بلکہ اس میں ان لوگوں کا بھی حق ہے جو کمانے سے عاجز ہیں۔ مثلاً یتیم و لاوارث۔ بیوہ و بے سہارا۔ اپاہج و دائمی بیمار اور تمام وہ لوگ جو کسی نہ کسی وجہ سے معاشی دوڑ میں پیچھے رہ گئے ہوں۔ کیونکہ کسب مال میں صرف کمانے والے کی محنت و قابلیت ہی سب کچھ نہیں بلکہ اس میں قدرت کی بے شمار کھلی و پوشیدہ قوتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ ورنہ خدا تعالےٰ نے چاہے تو اچھا بھلا انسان بیماری یا حادثے کا شکار ہو کر کمانے سے معذور ہو جائے۔ لہٰذا کمانے والوں کا فرض ہے کہ وہ محروم رہنے والوں کی دستگیری کریں اور انہیں سہارا دیں۔

دراصل اسلام اس ذہنیت کا قلع قمع کرتا ہے کہ کشمکش حیات میں زندہ رہنے کا صرف اسی کو حق حاصل ہے جو مسابقت میں دوسروں سے آگے بڑھ جائے بلکہ اسلام کے نقطہ نظر سے کمزوروں کو سہارا دینا اور زندگی کی دوڑ میں ان کی اعانت کرنا مضبوط و طاقتور افراد کا فریضہ ہے۔ اسی طرح معاشی دوڑ میں پیچھے رہ جانے والوں کو سہارا دینا اہل دولت کی ذمہ داری ہے۔ پیچھے رہ جانے والوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دینا اور گرے ہوئے کو کچل کر گذر جانا سنگدلی اور درندگی ہے جسے اسلام سخت ناپسند کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر گرتوں کو تھاما نہ جائے اور ناداروں کو سہارا نہ دیا جائے تو معاشرہ انسانی قدروں سے خالی ہو جاتا ہے اور انسانی معاشرہ کہلانے کا حقدار نہیں رہتا۔

اسلام نظام زکوٰۃ کے ذریعے معیشت کو مستحکم کرتا ہے اور معاشرے کو باہمی تعاون و ہمدردی کی فضا پیدا کر کے صحت مند بنیادوں پر استوار کرتا ہے۔ اسلام ایک فلاحی مملکت قائم کرنا چاہتا ہے۔ اور زکوٰۃ کے ذریعے کمزور و بے سہارا اور مجبور و عاجز افراد کی ضروریات زندگی کی فراہمی کا انتظام کرتا ہے۔ اسلام کا بنیادی

Marfat.com

مقصد یہ ہے کہ معاشرے کا کوئی فرد بھی خواہ وہ اپاہج و معذور، یتیم و لاوارث اور ضعیف و محتاج ہی کیوں نہ ہو بے روزگاری اور غربت و افلاس کا شکار نہ ہو جائے بلکہ بیت المال کے زکوٰۃ فنڈ سے اسے ضروریاتِ زندگی مہیا کی جائیں تاکہ پورا معاشرہ خوشحال رہے۔

نظامِ زکوٰۃ کو مسلمانوں نے عملاً نافذ کر کے دکھایا کہ فلاحی مملکت کے قیام کا یہ بہترین ذریعہ ہے۔ بلکہ ناگزیر ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی حکومت نے آبادی کی مردم شماری کرائی۔ معذوروں اور مجبوروں کے رجسٹر تیار کرائے اور زکوٰۃ فنڈ سے ان کے وظائف مقرر کئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں یہ حال ہو گیا کہ زکوٰۃ دینے والے تو سینکڑوں تھے مگر لینے والا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ اکثر مورخین اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں بالکل یہی کیفیت پیدا ہو چکی تھی کہ زکوٰۃ لینے والا ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا تھا۔

اس کے علاوہ زکوٰۃ معاشی ناہمواری دور کرنے اور دولت کی غیر فطری تقسیم کو ختم کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ اس سے دولت چند ہاتھوں میں جمع نہیں ہونے پاتی بلکہ امیروں سے غریبوں کی طرف منتقل ہوتی رہتی ہے اور اس طرح افرادِ معاشرہ میں باہمی ہمدردی و تعاون پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ معاشی مساوات و ہم آہنگی بھی قائم رہتی ہے پھر عوام کی قوتِ خرید میں اضافہ ہوتا ہے اور پیداوار کا عمل بھی تیز ہو جاتا ہے۔ اس طرح ملکی و قومی معیشت میں توازن قائم رہتا ہے اور معاشی بحران کبھی پیدا نہیں ہوتا۔

۳: صدقاتِ واجبہ

اسلام نے ارتکازِ دولت کو ختم کرنے کے لئے زکوٰۃ کے علاوہ ایسے صدقات بھی مقرر کئے ہیں جو مختلف مواقع پر صاحبِ حیثیت مسلمان پر ادا کرنا واجب ہوتے ہیں۔ مثلاً صدقہ فطر، عید الاضحیٰ کی قربانی، نذر وغیرہ۔ ان کے مصارف و فوائد بھی زکوٰۃ ہی کی طرح ہیں۔

۴۔ انفاق فی سبیل اللہ ارتکاز دولت کا سدِ باب کرنے کے لئے اسلام واجب صدقات کے علاوہ نفلی صدقہ کرنے کی بھی ترغیب دیتا ہے۔ جسے "انفاق فی سبیل اللہ" یعنی خدا کی راہ میں خرچ کہا گیا ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان میں مال کی محبت کم ہو اور بنی نوع انسان سے ہمدردی کا جذبہ فروغ پائے تاکہ پورا معاشرہ خوشحال ہو۔ اس لئے قرآن و سنت میں انفاق فی سبیل اللہ کی بار بار تاکید ہوئی ہے۔ اور اسکے فضائل بیان کئے گئے ہیں۔

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥ (البقرۃ ۲۷۴)	جو لوگ (اللہ کی راہ میں) اپنے مال خرچ کرتے ہیں رات کو اور دن کو پوشیدہ اور ظاہر پس ان کے لئے ان کے پروردگار کے پاس اس کا اجر ہے۔ اور نہ انہیں کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

ارتکاز دولت کو ختم کرنے کے سلسلے میں اسلام کا سب سے بڑا اقدام اس کا قانون وراثت ہے۔ اسلامی قانون وراثت کی رو سے فوت ہونے والے کی جائیداد و مال صرف ایک یا دو ہاتھوں میں منتقل نہیں ہوتا بلکہ پورے خاندان میں ایک فطری ترتیب سے تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اسطرح دولت کی ایک منصفانہ تقسیم رونما ہوتی ہے اور دولت کبھی بھی کسی ایک ہاتھ میں مرتکز نہیں ہو پاتی۔

۵۔ حق سوی الزکوٰۃ زکوٰۃ اور صدقات واجبہ تو قانونی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی ادائیگی لازم ہے مگر ایک دولت مند شخص صرف یہی ادا کر کے ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو جاتا بلکہ اگر ان سے معاشرہ کے نادار اور محتاج افراد کی کفایت نہ ہو سکے تو حکومت استحکام ریاست اور

Marfat.com

عوام کی فلاح وبہبود کے لئے اس سے مزید رقم بھی وصول کرسکتی ہے جسے "حق سوی الزکوٰۃ" کہا جاتا ہے۔ چنانچہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔

اِنَّ فِي الْمَالِ لَحَقًّا سِوَى الزَّكٰوةِ (ترمذی شریف) بے شک مال میں زکوٰۃ کے علاوہ اور بھی حق ہے۔

۶:۔ **عفو** اسلام نے صرف زکوٰۃ ۔ صدقات، وراثت اور انفاق فی سبیل اللہ ہی سے ارتکاز دولت کا سدباب نہیں کیا بلکہ 'عفو' کی ترغیب دے کر یہ مطالبہ بھی کیا ہے کہ انسان صرف ضرورت کے مطابق دولت اپنے پاس رکھے اور اس سے زائد جس قدر ہو اللہ کی راہ میں دوسروں کی فلاح وبہبود پر خرچ کرتا رہے۔ اسی کا نام 'عفو' ہے چنانچہ قرآن پاک نے واضح الفاظ میں اعلان کیا ہے

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۛ قُلِ الْعَفْوَ۔ (البقرۃ: ۲۱۹) (اے نبیؐ) لوگ آپؐ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ آپؐ کہدیجئے کہ جو کچھ بچ رہے۔

ان مختلف اقدامات سے اسلام ارتکاز دولت کو روکتا ہے اور دولت کی منصفانہ ومساویانہ تقسیم عمل میں لاتا ہے تاکہ دولت معاشرے کے ہر فرد تک پہنچے اور معاشرہ خوشحال ہو۔

سوال ۔۔۔:۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں "انفرادی ملکیت وتصرف" پر نوٹ قلمبند کیجئے۔

جواب:۔ اسلامی تصور ملکیت کی رو سے تمام کائنات کا مالک حقیقی فقط خدا تعالیٰ ہے لیکن معاملات زندگی کے لئے اس نے انسان کو محدود انفرادی ملکیت وتصرف کا حق دیا ہے۔ جو چیز انسان جائز طریق پر حاصل کرتا ہے اس پر اسے ملکیت

Marfat.com

ہوتی ہے اور اسے جائز طور پر صرف کرنے کا اسے پورا پورا اختیار حاصل ہوتا ہے حکومت یا مملکت یا اس کے کسی ادارے کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ انسان کی اس جائز ملکیت و تصرف میں دخل اندازی کرے۔ لیکن اگر کسی کی ملکیت ظلم و تعدی کا نتیجہ ہو یا ظلم و ستم کا ذریعہ بنے یا دوسروں کے حقوق پہ اثرانداز ہو تو حکومت کو مداخلت کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح اگر تصرف بھی ناجائز جگہ پہ ہو رہا ہو تو حکومت اسے روک سکتی ہے۔

اسلام کا انفرادی ملکیت و تصرف کے بارے میں یہی وہ نقطۂ نظر ہے جس سے معاشی آزادی کی حفاظت ہوتی ہے اور عمدہ اخلاق پروان چڑھتے ہیں۔ دراصل اسلام انفرادی ملکیت کو ایک امانت کی صورت دیتا ہے۔ اسی لئے یہ ملکیت محدود ہے اور اس میں تصرف کا حق بھی بعض قانونی و اخلاقی پابندیوں سے محدود ہے اسکا مقصد یہ ہے کہ انسان تمام وسائل حیات کو اپنی مستقل ملکیت سمجھ کر بندگانِ خدا کی ضروریات سے غافل نہ ہو جائے بلکہ عارضی امانت سمجھ کر اس میں سے خدا کے ضرورت مندوں اور حاجتمندوں پر خرچ کرتا رہے۔ تاکہ معاشرہ خوشحال و فارغ البال رہے۔

سوال ۸۲ :۔ اسلامی نقطۂ نظر سے عدل اجتماعی کا مفہوم اور اس کی اہمیت بیان کیجئے۔

جواب :۔ عدل اجتماعی سے مراد یہ ہے کہ حکومت یا ریاست اپنی تمام رعایا کو بنیادی ضروریات زندگی لازماً فراہم کرے۔ ریاست کے دولت مند اور خوشحال لوگ معذوروں اور ناداروں اور ضرورت مندوں کی امداد کریں۔ مزدوروں کسانوں اور دوسرے کارکنوں کو عدل و انصاف حاصل ہو اور اسطرح ہر ایک کو معاشی تحفظ بہم پہنچایا جائے اور کسی قسم کا ظلم نہ ہونے دیا جائے۔

Marfat.com

اسلام سماجی فلاح اور معاشی عدل کے قیام کو ریاست کی اولین ذمہ داری قرار دیتا ہے۔ اور زکوٰۃ و صدقات کے نظام سے رعایا کی فلاح و بہبود کا انتظام کرتا ہے۔ پھر معاشی قانون سازی اور عدلیہ کی طاقتوں کے ذریعے اجتماعی عدل کو قائم کرتا ہے اسلامی حکومت اپنی حدود میں بسنے والے ہر انسان کو بنیادی ضروریات زندگی بہم پہنچانا اپنا فریضہ سمجھتی ہے۔ اور بیمار، ضعیف، بے روزگار، لاوارث، یتیم، بیوہ اور معذور ہر ایک کو ہر طرح کا جانی و مالی تحفظ مہیا کرتی ہے۔

اسلام نے سماجی فلاح اور اجتماعی عدل کا ایک ایسا تصور پیش کیا ہے جس سے کوئی شخص بھی بے یار و مددگار نہیں رہ سکتا۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے اگر کسی شخص کا کوئی بھی بار اٹھانے والا نہ ہو اور کوئی بھی اس کی سرپرستی نہ کر رہا ہو تو حکومت اس کی سرپرست ہوتی ہے اور اس کی تمام ضروریات حکومت کے ذمہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اَلسُّلْطَانُ وَلِیُّ مَنْ لَا وَلِیَّ لَہٗ۔ (بخاری شریف)

جس کا کوئی ولی نہیں حکومت اس کی ولی (سرپرست) ہے۔

ایک دوسری حدیث میں فرمایا۔

مَنْ تَرَکَ کَلًّا فَاِلَیْنَا۔ (بخاری و مسلم)

جس نے ذمہ داریوں کا کوئی بوجھ (قرض یا بے سہارا کنبہ) چھوڑا وہ ہمارے (حکومت) کے ذمہ ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتماعی عدل کے قیام کی خاطر فرمایا کہ اے لوگو! صدقہ دو کیونکہ تم پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ آدمی صدقہ لے کر پھرے گا مگر کوئی لینے والا اسے نہ ملے گا۔

امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اجتماعی عدل کے قیام کا تہیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بخدا اگر میں زندہ رہا تو صنعا کی پہاڑیوں میں بھی چرواہا اپنی بکریاں چراتا ہے

Marfat.com

اسکو اس کے مال میں سے حصہ پہنچے گا اور اسکے لئے اسے خود کوئی تکلیف نہ اٹھانا پڑے گی۔" آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "خدا اگر عراق کی بیواؤں کی خدمت کے لئے زندہ رہا تو ان کو اسی حال میں چھوڑ جاؤں گا کہ میرے بعد وہ کسی کی مدد کی محتاج نہ رہیں۔

حضرت علی المرتضیٰ نے اسی بات کو یوں بیان فرمایا کہ "اللہ تعالےٰ نے دولت مندوں کے اموال میں غریبوں اور محتاجوں کی ضروریات مقرر کر دی ہیں۔ پس اگر وہ ان کا حق ادا نہ کریں اور یہ ان کی عدم توجہی سے بھوکے ننگے اور تنگدست ہوں تو اللہ تعالےٰ قیامت کے روز ان سے محاسبہ کرے گا۔"

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظام معیشت صحیح معنوں میں عدل اجتماعی اور سماجی فلاح و بہبود کا مکمل طور پر ضامن ہے اور خلافت راشدہ کا دور دنیا کے سامنے اس کی زندہ مثال ہے۔

اسلام کا سیاسی نظام

سوال ۸۳:۔ ریاست کی تعریف کیجئے اور اسکی ضرورت و اہمیت واضح کیجئے۔

جواب:۔ انسان نے اپنی اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے جو ادارے قائم کئے ہیں ان میں ریاست کا ادارہ بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ ریاست اس منظم ادارے کا نام ہے جو کسی ملک کا نظم و نسق چلانے اور قائم رکھنے کے لئے وجود میں آتا ہے۔ قیام ریاست کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ (۱) اقتدار (۲) اطاعت۔

ریاست کا ناظم اعلیٰ اقتدار پر قابض ہوتا ہے۔ اور اسکے باشندے اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اطاعت و اقتدار کے اجتماع سے ریاست معرض وجود

Marfat.com

میں آتی ہے۔ داخلی و خارجی انتظامات کے لئے ریاست کا قیام ناگزیر ہے۔ قیامِ ریاست کے بغیر نہ ملکی حدود کا تحفظ ممکن ہے۔ نہ داخلی انتشار و خلفشار کو روکا جا سکتا ہے۔ ہر شہری کے کچھ حقوق ہیں۔ اسی طرح اس کے ذمہ کچھ فرائض بھی ہیں۔ ریاست کے بغیر نہ حقوق کی حفاظت و نگہداشت کی کوئی صورت ہے نہ فرائض کی عدم ادائیگی پر زجر و عتاب کا کوئی امکان ہے۔ ظہورِ اسلام سے قبل جزیرہ نمائے عرب کی یہی حالت تھی۔ منظم حکومت نہ ہونے کے باعث ہر طرف غنڈہ گردی اور شر و فساد کا دور دورہ تھا۔ غارت گری اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا۔ نہ مظلوم کسی کے آگے داستانِ ظلم و ستم بیان کر کے دادخواہی کا امیدوار ہوتا نہ ظالم کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے کوئی قوت حرکت میں آتی۔

انسان جب دوسروں سے لین دین کرتا ہے تو ان معاملات کی انجام دہی کیلئے اسے قانون کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ قانون کے پہلو بہ پہلو اسے ایسے ادارہ کی ضرورت اولین مرحلہ پر محسوس ہوتی ہے جو اپنی قوت اقتدار سے اس قانون کو نافذ کرے۔ قوتِ نافذہ کی عدم موجودگی میں قانون بے مقصد ہو کر رہ جاتا ہے۔ ریاست ایک ایسا ادارہ ہے جو معاشرتی تعلقات لین دین اور تمدنی معاملات کی ترتیب و تہذیب کا محافظ ہے۔ فرد اپنی صلاحیتوں کو اسی صورت میں بروئے کار لا سکتا ہے اور اس کی ذہنی نشو و نما اسی صورت میں ممکن ہے جب ایک طرف اسے سازگار اور پرامن ماحول حاصل ہو اور دوسری طرف وہ فرد کو ایسی تمام سہولتیں فراہم کر دے جو وہ خود نہیں حاصل کر سکتا۔ قیامِ ریاست کے بغیر نہ دفاع ممکن ہے نہ عدل و انصاف اور تحصیلِ علم کا کوئی ذریعہ موجود ہے۔ اسی بناء پر ریاست کے قیام سے انسانی زندگی کی تشکیل میں بڑی مدد ملتی ہے۔

ریاست کی اسی ضرورت و اہمیت کا تقاضا ہے کہ انسان نے جب سے

اپنے تہذیبی سفر کا آغاز کیا ہے۔ وہ اسی وقت سے اس ادارہ کی بے پناہ افادیت کا قائل ہوگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانیت کی پوری تاریخ گویا ریاست کے تدریجی ارتقاء اسکے استحکام اور اس کے مختلف ادوار و منازل کی تاریخ ہے۔ انسان نے اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں ریاست کو بڑھانے اور پھیلانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ دورِ حاضر میں اجتماعی ترقی اور زندگی کے احوال و کوائف کی تبدیلی کے باعث یہ ادارہ برابر ترقی کی منزلیں طے کر رہا اور اسکے اثر و رسوخ اور وسائل و ذرائع میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ریاست کا کام صرف ملکی دفاع اور قیام امن و امان تک ہی محدود نہیں بلکہ اسکے ذریعہ اجتماعی عدل و انصاف اور سماجی فلاح و بہبود کے کاموں میں بھی زبردست مدد ملتی ہے۔

یہ ادارہ اسقدر ہمہ گیر ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اسکی گرفت سے باہر نہیں اور یہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر برابر اثر ڈالتا ہے۔ ریاست کا قیام و بقاء اور ارتقاء اخلاقی اقدار اور انسان کے جذبۂ عدل و انصاف کا رہین منت ہے۔ اگر دنیا میں عدل و انصاف کی کارفرمائی نہ ہوتی تو ریاست کا ادارہ عالم وجود میں نہ آتا۔ عدل و انصاف محور و مرکز ہے جس کے گرد سیاسی نظم کا ہر ذرہ حرکت کرتا ہے۔ ریاست کے سب افعال و امور صرف عدل و انصاف ہی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ریاست اگر معاشی تعلقات استوار کرتی ہے تو عدل کے لئے، اگر قانون بناتی ہے تو اس کی غرض بھی قیام عدل ہوتی ہے اور بس۔ ریاست پر اخلاقی احساس کا اسقدر غلبہ ہوتا ہے کہ اگر خود غرض عناصر اپنے ذاتی مفاد کے لئے بھی کچھ قوانین مرتب کرتے ہیں تو عوام میں ان کو مقبول بنانے کے لئے مجبوراً اس پہ عدل و اخلاق کی ملمع سازی کرتے ہیں۔

تاریخِ عالم اس بات کی شاہد بھی ہے کہ جب بھی ریاست نے کوئی غیر اخلاقی قانون بنایا اور عوام نے اسے شرفِ قبول نہ بخشا تو زود یا بدیر ایسا زبردست انقلاب

Marfat.com

برپا ہوا جس نے ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ ریاست کو ہمیشہ استحکام اسی صورت میں حاصل ہوا جب اسکے قوانین قومی ازواق اور قلب و ضمیر سے ہم رنگ وہم آہنگ تھے اور قوم ان کو چاہتی تھی۔

سوال ۸۴:۔ آئین، قانون اور دین میں کیا تعلق ہے؟ نیز بتائیے کہ اقامتِ دین کے لئے قانون و اقتدار کی کس حد تک ضرورت ہے؟

جواب:۔ دین اسلام اس جاہلانہ تصور کا قائل نہیں کہ دین اور دنیا دو چیزیں ہیں۔ اسلام ایک کامل نظامِ زندگی ہے اور انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اس سے خارج نہیں ہے۔ اسلام اقتصادی، سیاسی، معاشرتی اور عمرانی تمام قسم کے مسائل کی گتھیاں سلجھاتا ہے۔ ریاست کا اولین مقصد عدل و انصاف کا قیام و بقا ہے یہ دین کا کام ہے کہ وہ ریاست کے لئے اصول، انصاف اور ضابطۂ اخلاق مہیا کرے جس کو ریاست قائم کرنے کے دریے ہو۔ قرآن ہمیں حکم دیتا ہے کہ ہم پوری زندگی کو مسلمان بنائیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہماری زندگی کے کچھ حصے آغوشِ اسلام میں آجائیں۔ اور اسکے کچھ اجزاء اسلام کی حدود سے باہر رہیں۔ قرآنِ حکیم میں فرمایا۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ اے ایمان والو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

(البقرۃ۔ ۲۰۸)

اسلام میں پورے پورے داخل ہونے کا مطلب یہی ہے کہ ہمارا اسلام ناقص نہ ہو۔ اگر ہم اسلام لاتے ہی ہیں تو پوری زندگی کو اسلام کا مطیع کر دیں اور اسکے تمام گوشوں میں اسلامی اصول و ہدایات کو جاری کر دیں۔

اہل کتاب کی یہ عادت تھی کہ جو احکام خداوندی ان کے موافق ہوتے ان پر

Marfat.com

عمل پیرا ہوتے اور جو طبیعت پر گراں ہوتے انہیں نظر انداز کر دیتے گویا شریعت کا انحصار ان کی پسند پر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں ان کو ڈانٹا۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ۔ (البقرۃ۔ ۸۵)

کیا تم کتاب الٰہی کے بعض حصوں کو مانتے ہو اور بعض کو نہیں مانتے۔

پھر اس جرم کی سزا ان الفاظ میں بیان فرمائی۔

فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (البقرۃ۔ ۸۵)

پس اگر تم میں سے جو شخص ایسا کرے گا اس کی سزا دنیا کی زندگی میں سوائے ذلت و رسوائی کے اور کیا ہو سکتی ہے؟ اور قیامت کے دن ایسے لوگوں کو شدید ترین عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا

قرآن کریم کے ان واضح احکام کے بعد دین اسلام کی ناقص اطاعت خارج از بحث معلوم ہوتی ہے۔ اسلام نے اپنی پوری تاریخ میں ریاست کی اہمیت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ انبیاء کرام کا شیوہ یہی رہا کہ وہ برسر اقتدار لوگوں کو ہمیشہ دین حق کی طرف بلاتے رہے۔ ان کی دعوت کا مرکزی نقطہ قوت و اقتدار کو صرف خدا کی ذات میں محدود کرنا اور شرک کا قلع قمع کرنا تھا خواہ وہ کسی شکل و صورت اور زمان و مکان میں موجود ہو۔ حضرات انبیاء کی مشترکہ دعوت آغاز انسانیت سے یہی رہی ہے کہ

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ (الاعراف۔ ۶۵)

اے میری قوم! اللہ ہی کی بندگی کرو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے۔

Marfat.com

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ (سورۂ یوسف۔ ۴۰) قانون اور حکم خدا کے سوا کسی کیلئے نہیں۔

أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ (الاعراف۔ ۵۴) خبردار تخلیق اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کے لئے ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُونِ (الشعراء۔ ۱۶۳) اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔

انبیائے کرام نے انسان کی پوری زندگی کو اپنی دعوت وارشادات کا نشانہ بنایا اور اساس بات کے لئے معروف سعی وجہد ہے کہ خدا کی زمین پر خدا کا قانون جاری وساری رہے۔ انہوں نے ریاست کی اصلاح وفلاح کے لئے بھی انتہائی کوشش کی۔ قرآن کریم کے مطالعے سے عیاں ہوتا ہے کہ حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت یوسف علیہم السلام اور خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ اسلامی ریاست قائم کی اور اسے معیاری شکل میں چلایا۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی مظلومی کا مرقع تھی۔ لیکن مدینہ میں اسلام کی اقتصادی وسیاسی قوت دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتی گئی۔ ۲ھ میں غزوۂ بدر کی شاندار فتح نے مسلمانوں کے لئے قوت وشوکت کا دروازہ کھول دیا۔ لیکن ماہ رمضان ۸ھ میں مکہ مکرمہ فتح ہوا جس نے کفار قریش کے تابوت میں آخری کیل لگا دی اور ہمیشہ کے لئے مغلوب ہو گئے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم جب فاتحانہ شان سے مدینہ لوٹے تو اسلامی حکومت کی تشکیل نے کروٹ لی۔ آپ نے تاسیس حکومت کے سلسلہ میں پہلا کام یہ کیا کہ قبائل میں محصلین زکوٰۃ کا تقرر فرمایا لیکن دراصل خلافت الٰہی کے تمام اجزاء اواخر ۱۰ھ حجۃ الوداع کے زمانہ میں تکمیل پذیر ہوئے چونکہ آپ کا اصلی مقصد دعوتِ اسلام، اصلاحِ اخلاق اور تزکیۂ نفوس تھا اس لئے آپ نے ملکی انتظامات اسی حد تک قائم کئے جہاں ملکی بدامنی کے باعث دعوتِ توحید میں رکاوٹ پیدا ہوتی تھی۔

فکر اسلامی میں ریاست کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا سکھائی۔

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا۔ (سورۃ بنی اسرائیل ۸۰)

اور آپ کہہ دیں کہ اے پروردگار مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک اقتدار کو میرا مددگار بنا دے۔

یہ آیت کریمہ مکہ مکرمہ میں ہجرت سے تھوڑا عرصہ پہلے نازل ہوئی۔ اس تاریخی پس منظر میں اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت میں دعا کرتے ہیں کہ یا تو مجھے خود اقتدار سے بہرہ ور کر یا کسی حکومت کو میرا پشت پناہ بنا دے تاکہ تیری عطا کردہ قوت و شوکت سے میں دنیا میں پیدا شدہ فتنہ و فساد کی اصلاح کر سکوں، برائیوں کا انسداد کر دوں، نیکیوں کو قائم کر دوں اور تیرے قانونِ عدل کا سکہ دنیا میں جاری کر دوں۔ حضرت حسن بصری اور قتادہ نے اس آیت کی یہی تفسیر بیان کی ہے۔ ابن جریر اور ابن کثیر نے بھی یہی تفسیری مسلک اختیار کیا ہے۔ اس کی تائید میں مندرجہ ذیل احادیث نبویہ ملاحظہ ہوں۔

آپ نے فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَيَزَعُ بِالسُّلْطَانِ مَا لَا يَزَعُ بِالْقُرْاٰنِ۔ (تفسیر ابن کثیر)

اللہ تعالیٰ حکومت کے ذریعہ ان چیزوں کو روک دیتا ہے جن کا انسداد قرآن سے نہیں کرتا۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ چند سعادت مند انسان ہی ایسے ہوتے

Marfat.com

ہیں۔ جو قرآنی مواعظ و نصائح کو سن کر ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ لیکن جب شرعی احکام کو قانون کی پشت پناہی حاصل ہو جائے تو کوئی شخص سرتابی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ایک دوسری حدیث میں تاجدار مدینہ علیہ السلام نے یوں فرمایا۔

اَلْاِسْلَامُ وَالسُّلْطَانُ تَوْاَمَانِ لَا یَصْلُحُ وَاحِدٌ مِنْهُمَا اِلَّا بِصَاحِبِهٖ وَالْاِسْلَامُ اُسٌّ وَالسُّلْطَانُ حَارِسٌ وَمَا لَا اُسَّ لَهٗ یَنْهَدِمُ وَمَا لَا حَارِسَ لَهٗ ضَائِعٌ۔ (کنز العمال)

اسلام اور حکومت دو جڑواں بھائی ہیں۔ ان میں سے ایک کی درستی دوسرے کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اسلام ایک عمارت ہے اور حکومت اس کی نگران ہے۔ جس عمارت کی بنیاد نہ ہو وہ ضرور گر جائے گی۔ اور جس کا کوئی پاسبان نہ ہو وہ ضائع ہو جائے گا۔

مزید براں یہ بات قابل غور ہے کہ حکومت کے بغیر اسلامی احکام کو نافذ کرنا ممکن نہیں۔ چونکہ اسلام ایک کامل نظام زندگی ہے اس لیے وہ جمیع شعبہ ہائے حیات کے لئے قوانین دیتا ہے۔ مثلاً اسلام کا اپنا قانون شہادت ہے، فوجداری اور دیوانی قانون ہے، تجارت اور کاروباری معاملات کے لئے اس کے پاس ایک مفصل قانون موجود ہے۔ اس کے پاس نکاح و طلاق، وراثت و وصیت اور بیع و شرا کے قوانین موجود ہیں۔ ان سب قوانین کو نافذ کرنے کے لئے حکومت کی ضرورت ہے۔ اگر حکومت موجود نہ ہو تو شریعت کا ایک بڑا حصہ بیکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے حکومت دریاست سے چارہ نہیں۔ اس لئے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی تائید ہوتی ہے کہ اسلام اور حکومت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اور ان میں سے کوئی بھی دوسرے

کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔

سوال ۸۵:۔ دلائل کی روشنی میں ثابت کیجئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد حکومتِ الٰہیہ کی تشکیل تھا۔

جواب :۔ یہ حقیقت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اہم مقصد حکومت الٰہیہ قائم کرنا اور دنیا میں خداوندی نظام حکومت اور اسلامی اخلاق و معاشرت کا جاری کرنا تھا۔ یہ امر ذہن نشین کرنے کے قابل ہے کہ حکومت الٰہی کے قیام اور اسلامی حدود و تعزیرات کے نفاذ اور ماحول کی تبدیلی کے بغیر اصلاح کی تمام مساعی بے کار ہیں۔ اس قسم کی کوششوں کے نتیجہ میں صرف چند آدمیوں کی اصلاح ہو سکتی ہے اس سے کسی قوم کی اصلاح و فلاح کی امیدیں وابستہ کرنا کسی طرح درست نہیں جب کہ ضرورت کا تقاضا یہ ہے کہ ایک عالمگیر انقلاب کے ذریعہ پوری فضا کو بدل دیا جائے اور پورے معاشرہ کی کایا پلٹ جائے یہی طریق کار تھا جس کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنایا۔ تجربہ و مشاہدہ اس بات کا گواہ ہے کہ کوئی انقلاب اس سے زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوا۔ مستقبل میں بھی یہی طریق کار اسلام کی ترقی کا ضامن اور اس کی صلاح و فلاح کا کفیل ہے۔

اسلام عالمگیر اصلاح کا داعی ہے اور اسکا مقصد صرف چند آدمیوں کو دعوت دینا نہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کی طرح اسلام چند عقائد کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ زندگی کے لئے ایک مکمل نظام عمل ہے۔ اس لئے وہ پوری کائنات کا طرز و انداز، افتاد مزاج اور رنگ ڈھنگ مکمل طور پر بدل دینا چاہتا ہے، اسلام

Marfat.com

اس بات کا متقاضی ہے کہ نہ صرف افکار و آراء بلکہ اخلاق و معاشرت زندگی کے معیار و مدار، طرز فکر و نظر اور انسانی توازن کو بھی اپنے سانچہ میں ڈھال دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اسلامی نظام حکومت کو قائم کئے بغیر یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اقتدار پر اسلام کا قبضہ ہو، قانون سازی کا حق اسلام کے سوا اور کسی کے پاس نہ ہو۔ وہ خود ہی قانون بنائے اور خود ہی چلائے۔ اس کے نمائندے اپنے طرز عمل بے مثال سیرت و کردار اور اعلیٰ اخلاق سے یہ ثابت کر دیں کہ یہی دین اس قابل ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔ اسلام کے مادی اقتدار کا نتیجہ یقیناً اس کے روحانی اقتدار کی صورت میں برآمد ہوگا۔ اسی حقیقت کو قرآن حکیم ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ (سورۃ الحج۔ ۴۱)

مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین پر اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ ادا کریں گے۔ نیکیوں کا حکم دیں گے برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ حصول اقتدار، قیام صلوٰۃ، ادائے زکوٰۃ، نیکیوں کے پھلنے پھولنے اور خواہش و منکرات کے انسداد کا موجب ہے۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ایک ایسا اہم فریضہ ہے کہ اسے امت مسلمہ کا مقصد وجود اور علت ظہور قرار دیا گیا ہے۔

قرآن پاک میں فرمایا:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ

تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی اصلاح کے لئے معرض ظہور میں لائی گئی ہے

Marfat.com

وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آلِ عمران۔ ۱۱۰) تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

امر بالمعروف ایک ایسا فریضہ ہے جس کی بجا آوری قیامت کے دن تک مسلمانوں پر فرض ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (سورہ آل عمران ۱۰۴) اور تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیئے جو نیکی کی دعوت دے۔ بھلائی کا حکم دے اور برائی سے باز رکھے۔

اس آیت میں امر و نہی کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ امر و نہی کے لیے سیاسی قوت و اقتدار کی ضرورت ہے۔ اس آیت میں یہ نہیں فرمایا گیا کہ وہ نیک کام کرنے کی التجا کریں گے یا منت سماجت کے ذریعہ برائی سے روکیں گے۔ لہٰذا امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ اسی صورت میں ادا کیا جا سکتا ہے جب قوت و اقتدار کی باگ ڈور اہل اسلام کے ہاتھ میں ہو۔ سیاسی اقتدار کے بغیر اس فریضہ کی ادائیگی کا کوئی امکان نہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ۔ تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اسکو ہاتھ سے بدل دے۔ اگر ایسا نہ کر سکے تو زبان سے روکے۔ اگر یہ بھی نہ کر سکے تو دل سے برا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ برائی کا ہاتھ سے روکنا اعلیٰ ترین ایمان کی علامت ہے۔ زبان سے روکنا درمیانہ درجہ ہے اور دل سے برا سمجھنا ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہاتھ سے روکنا اسی صورت میں ممکن ہے جب آدمی اس کی

Marfat.com

قدرت رکھتا ہو اور قدرت کے لئے قوت و شوکت کی ضرورت ہے۔ برائی کو زبان سے روکنے کے لئے کسی حد تک قدرت مطلوب ہے۔ دونوں کی عدم موجودگی میں تیسرے درجہ پر اکتفا کرنا ہوگا جو ایمان کا آخری درجہ ہے۔ آجکل تو یہ تیسرے درجہ کا ایمان بھی عنقا ہے۔ دورِ حاضر میں برائی کا ارتکاب کرنے سے پہلے اس کی حلّت کا فتویٰ بھی صادر کر دیا جاتا ہے۔ جب سود کو نفع اور رشوت کو ہدیہ کا نام دے کر حلال طیب قرار دے لیا جائے تو حرام کونسی چیز رہی؟ غلامانہ ذہنیت نے ہماری سیرت و کردار کے ساتھ ساتھ ہمارے قلب و ذہن کو اس حد تک بدل دیا ہے کہ برائی کا احساس مر چکا ہے ؎

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر (اقبالؒ)

مذکورہ صدر بیان اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ فطرتِ اسلام اور نصوصِ کتاب و سنت اس امر کے متقاضی ہیں کہ اسلام کی نشر و اشاعت اور سربلندی کے لئے ایک آزاد ماحول ہونا چاہیئے جس میں دینی حدود کے اندر رہ کر حکومت و ریاست کے وسائل کو اسلام کے فروغ کے لئے استعمال کیا جائے۔ جو ریاست اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے مصروفِ سعی و جہد ہوگی وہ اسلامی ریاست ہے۔ اور ایسی ریاست کے قیام کے بغیر اسلام کا نصب العین نامکمل رہے گا۔ پاکستان بھی اسی لئے معرضِ وجود میں آیا تھا کہ مسلمان یہاں اپنے افکار و عقائد اور اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گذار سکیں گے۔ ورنہ اسلامی عبادات و ارکان ادا کرنے کی اجازت تو انگریزی حکومت کے زمانہ میں بھی حاصل تھی۔

سوال نمبر ۸۶: اسلام میں امامت و خلافت کی حیثیت پر ایک جامع نوٹ لکھئے۔

جواب: اسلام کا نظریۂ امامت و خلافت یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالٰے نے

Marfat.com

دنیا میں اپنا خلیفہ (نائب) بنا کر بھیجا ہے تا کہ جہاں تک ممکن ہو احکام خداوندی کی اطاعت کرے اور اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر ان کو دنیا میں نافذ کرے۔ انسان کی غایتِ تخلیق اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت ہے۔ قرآن میں فرمایا:۔

"مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ" — میں نے جن و انس کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

عبادت کا اطلاق بندگی اور اطاعت دونوں پر ہوتا ہے۔ آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ انسان دنیا میں خداوند تعالیٰ کی عبادت و اطاعت دونوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان طبعاً یہ کام انجام دینے کے لئے تیار نہیں۔ اس کے مختلف وجوہ و اسباب ہیں۔

۱۔ انسان طبعاً تغافل شعار واقع ہوا ہے۔

۲۔ دنیوی حرص و ہوا عبادتِ خداوندی سے مانع ہے۔

۳۔ انسان مشاغل حیات میں منہمک ہو کر عبادتِ خداوندی بجالانے سے قاصر رہتا ہے۔

ان امور و اسباب کا تقاضا ہے کہ کوئی بالائی قوت ہونی چاہیئے جو انسان سے اوامر خداوندی کی تعمیل کرائے اور اسے باغی ہونے سے بچائے۔ یہ اختیار اسی انسان کو ودیعت کیا جاتا ہے۔ جو ہر لحاظ سے اس کا اہل ہوتا ہے۔ اس کو امیر، خلیفہ یا امام کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں:۔

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ — خدا نے تم میں سے ایماندروں اور نیکوکاروں سے وعدہ کیا کہ ان کو زمین میں اپنی خلافت اسی طرح عطا کرے گا جس طرح کہ گذشتہ امتوں کو اس نے

Marfat.com

الَّذِی ارْتَضٰی لَهُمْ وَلَیُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا" (سورۂ نور) اپنی خلافت عطا کی تھی۔ اور ان کے اس دین کو جس کو اس نے ان کیلئے پسند کیا ہے قوت بخشے گا اور ان کی بے امنی کو امن سے بدل دے گا۔

یہ آیت کریمہ اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے۔ کہ خدا کی اس امانت (امامت وخلافت) کا بار انہی لوگوں پہ ڈالا جاتا ہے جو مندرجہ ذیل اوصاف کے حامل ہوتے ہیں

۱۔ وہ ایماندار ہوں۔

۲۔ اعمال صالح انجام دیتے ہوں۔

۳۔ خدا کی عبادت کرتے ہوں۔

۴۔ شرک سے بیزار ہوں۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جو قوم اللہ تعالیٰ پر ایمان نہیں رکھتی یا اس کے احکام پر عمل نہیں کرتی خواہ وہ کس قدر طاقتور با اقتدار اور زور آور ہو وہ خلافت الٰہی سے بہرہ ور نہیں ہو سکتی۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حاکمیت مطلقہ، صرف خدا کی ذات کیلئے ہے۔ دنیا میں جو حاکم ہوگا وہ صرف خدا کا خلیفہ (نائب) ہوگا۔ دوسرے یہ کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تمام مومن خلیفہ بننے کے مستحق ہیں اور جو خلافت ان کو ملے گی وہ عمومی حیثیت کی ہوگی کسی ایک شخص یا خاندان یا نسل یا طبقہ میں محدود نہ ہوگی با الفاظ دیگر ہر مومن خدا کا خلیفہ ہے۔ اور اس حیثیت سے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

مدینہ منورہ تشریف لا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکومت الٰہیہ کی تشکیل فرمائی آپ کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو یہ عظیم امانت سونپی گئی۔ خلافت راشدہ صحیح معنوں میں حکومت الٰہیہ اور نیابت نبوت تھی۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوا

کہ خلفائے راشدین مومن مخلص، عبادت گزار اور نیکو کار تھے۔ انہی صفات کی بناء پر اس عظیم امانت کیلئے ان کا انتخاب عمل میں آیا۔

اسلامی حکومت انسانی ذہن کے اختراع کردہ قوانین کی مرہون منت نہیں ہوتی نہ اسے انسانی قواعد وضوابط کا احتیاج ہوتا ہے۔ اس کے پاس ایک بنا بنایا، دستور ہوتا ہے جو اس خطۂ ارضی پر بسنے والے تمام بنی نوع انسان کی ضرورت کا کفیل ہے۔ یہ دستور زمان ومکان کی حدبندیوں سے آزاد ہے۔ یہ ازلی اور ابدی ہے۔ انسانی تمدن بدلتا رہتا ہے۔ انسانی ذہن کے سانچے نئے نئے قالب اختیار کرتے ہیں۔ ہر ملک وہر قوم کے جذبات واحساسات طرزِ بودوباش اور طرزِ فکر ونظر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ مگر خداوندی قانون کبھی نہیں بدلتا۔ اور بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہوتا ہے۔ یہ دستور اس قانون سازِ حقیقی کا وضع کردہ ہے جو علیم وخبیر اور علام الغیوب ہے۔ اسے انسانی ضروریات کا بخوبی علم ہے اور اس کا وضع کردہ قانون ان کے بالکل مطابق ہے۔

اسلامی حکومت میں خلیفہ صرف احکام کو نافذ کرتا ہے وضع نہیں کرتا۔ اس لئے اقتدارِ اعلیٰ قانون سازِ حقیقی (اللہ تعالیٰ) کے قبضہ میں ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے "اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ" حکم صرف خدا کا ہے۔

اس آیت سے خلیفہ وامیر کے حدودِ اختیار پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ اپنی طرف سے کوئی ایسا حکم نہیں دے سکتا جو اللہ ورسولؐ نے نہ دیا ہو۔ اگر وہ ایسا حکم دے گا تو وہ قابلِ اطاعت نہیں۔ گویا اصل اطاعت اللہ کی ہے امیر کی نہیں۔ امیر اس لئے واجب الاطاعت ہے کہ وہ خدا کے احکام دنیا میں نافذ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں اطاعتِ امیر پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ قرآن میں فرمایا۔

مسلمانو! اللہ کا حکم مانو اور رسولؐ کا حکم مانو اور جو تم میں سے صاحب

Marfat.com

الامر ہیں ان کی اطاعت کرو۔ پھر اگر کسی بات میں حاکمِ وقت سے تمہارا اختلاف ہو تو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لانے کی شرط یہ ہے کہ اس بات میں اللہ اور رسولؐ کے حکم کی طرف رجوع کرو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی یہی طریقہ اچھا ہے۔"

(سورۂ نساء۔ رکوع ۸)

اس آیت میں اطاعتِ امیر کا حکم دیا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ "مِنکُمْ" (مسلمانوں میں سے) کی شرط کا حامل ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی حکومت وہ ہے جو انسانی قانون کے بجائے خداوندی قوانین پر عمل پیرا ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ جس حکومت یا ریاست میں مسلمان بودوباش رکھتے ہوں اور ان کا حاکم بھی مسلمان ہو اس ریاست کو بھی اسلامی کہا جائے۔ اسے مسلم سٹیٹ یا مسلم حکومت تو کہا جا سکتا ہے مگر اسلامی حکومت کے نام سے نہیں پکارا جا سکتا۔

خلیفہ کا انتخاب خلافت کا حق پوری ملت کو عطا ہوتا ہے۔ اس ملت کے سب افراد نظم و نسق میں حصہ دار ہوتے ہیں۔ افرادِ ملت میں سے چند دیندار اور اہل آدمیوں کا انتخاب کر کے ایک مجلسِ شوریٰ مرتب کی جاتی ہے۔ یہی مجلسِ شوریٰ خلیفہ کا انتخاب کرتی ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا "وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" (وہ اپنے معاملات مشورہ سے طے کرتے ہیں)

مجلسِ شوریٰ کے تمام ممبر قابل، دیانت دار اور ہر لحاظ سے اس کے اہل ہوتے ہیں۔ خلیفہ کے انتخاب کے لئے مجلسِ شوریٰ کا انتخاب شرط نہیں۔ البتہ ملتِ اسلامیہ کی رضامندی اور عام پسندیدگی ضروری ہے۔

نصبِ امامت کا وجوب یہ ایک فقہی مسئلہ ہے جس پر تمام مکتبہ ہائے فقہ کا اتفاق ہے کہ ملت کے لئے نصبِ امامت ضروری ہے اور امام کا تقرر واجب ہے اس لئے کہ امام کی عدم موجودگی میں ملت کا نظم و نسق، ملکی امن و امان، دفاعِ اعداء اور احکامِ شریعت کا نفاذ واجراء ممکن نہیں۔ امام ابن حزم اندلسی لکھتے ہیں۔

Marfat.com

"اتفق جميع أهل السنة وجميع المرجئة وجميع الشيعة وجميع الخوارج على وجوب الإمامة وأن الأمة واجب عليها الانقياد لإمام عادل يقيم أحكام الله ويسوسهم بأحكام الشريعة التي أتى بها رسول الله صلى الله عليه وسلم"۔
(الفصل بين الملل والنحل لابن حزم جلد چہارم صہ ۸۷)

سب اہل سنت مرجیہ، شیعہ اور خوارج اس بات پر متفق ہیں کہ امام کا تقرر واجب ہے۔ نیز یہ کہ امت پر ایسے امام عادل کی اطاعت واجب ہے جو اللہ تعالیٰ کے احکام قائم کرے اور ان احکام شریعت کے مطابق ان کا سیاسی نظام قائم کرے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"مسلمانوں پر جامع شرائط خلیفہ کا مقرر کرنا واجب بالکفایہ ہے اور یہ حکم قیامت تک کے لئے ہے" (ازالۃ الخفاء مقصد اول فصل اول)

اس سے معلوم ہوا کہ نصب امامت کا مسئلہ اجماعی ہے جس پر پوری امت کا اتفاق ہے۔ اختلاف اگر ہے تو وہ تقرر امام کی تفصیلات و جزئیات یا اس کے طرق و شرائط میں ہے۔ لیکن نصب امامت کے وجوب پر کوئی اختلاف نہیں یہ سب کے نزدیک ضروری ہے۔

تلخیص مباحث سابقہ | نصب امامت کے باب میں بیان کردہ مباحث کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ حکومت کا قیام انسانی معاشرہ کی ایک بنیادی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر منظم اجتماعی زندگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ اسلام ایک کامل نظام زندگی ہے اور اس نے انفرادی و اجتماعی زندگی کیلئے

Marfat.com

ہدایات دی ہیں۔

۳۔ اسلام کی نگاہ میں دین و سیاست کی کوئی تفریق نہیں۔ وہ پوری زندگی کو خداوندی قانون کے تابع کرنا چاہتا ہے اور اس لئے سیاست کو بھی اسلامی سانچے میں ڈھالتا ہے۔ اسلام دینی احکام کے نفاذ و اجراء میں ریاست سے مدد لیتا ہے۔

۴۔ یہ امر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہے۔ کہ دینی احکام کی ادھوری اطاعت کی جائے۔ بعض احکام پر عمل کیا جائے اور بعض سے روگردانی اختیار کی جائے۔

۵۔ اسلام اور حکومت باہم لازم و ملزوم اور ایک دوسرے کا جزو لاینفک ہیں۔ اگر حکومت و ریاست سے دین کو خارج کر دیں تو فرعونیت اور چنگیزی کے مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اور اگر اسلام ریاست و حکومت کے بغیر ہو تو اس کی ناقص تعمیل ہو گی۔ لوگ جس حصہ پر چاہیں گے عمل کریں گے اور جس کو چاہیں گے نظر انداز کر دیں گے۔ اس لئے ریاست کو اسلامی بنیادوں پر استوار کرنے کی ضرورت ہے اور حکومت کے لئے اسلام کی پابندی ناگزیر ہے۔

اسلامی ریاست کی خصوصیات

اصولی اور نظریاتی ریاست

سوال نمبر ۸:۔ یہ بات کہاں تک درست ہے کہ اسلامی ریاست اصولی اور نظریاتی ریاست ہے؟ نیز اسلامی نقطۂ نگاہ کے مطابق حکومت کے مقاصد و غایات کیا ہیں؟

جواب:۔ جو چیز ایک اسلامی ریاست کو دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتی ہے

دوسری یہ ہے کہ یہ ایک نظریاتی ریاست ہے جس کی بنیاد نہ رنگ و نسل پر ہے اور نہ وطن و زبان پر۔ یہ معاشی مفادات کے اشتراک اور سیاسی گٹھ جوڑ پر بھی مبنی نہیں ہے۔ اس ریاست کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اسلامی نظریۂ حیات کی داعی اور اس کی پیروی کرنے والی اور اس کو دنیا میں چلانے اور پھیلانے والی ہے۔ اسلامی ریاست حاکمیتِ اعلیٰ کا منصب صرف اللہ تعالیٰ کو تفویض کرتی ہے۔ حاکم اور امیر قانون کا بنانے والا نہیں ہوتا بلکہ ایک نے بنائے خداوندی قانون کو چلانے والا ہوتا ہے۔

باقی ریاستوں کی طرح اسلامی ریاست کا بھی ایک متعین علاقہ اور حدود اربعہ ہوتا ہے جس کی حفاظت و نگہداشت اور جس کے رہنے والوں کی فلاح و بہبود اس کا اولین مقصد ہوتا ہے۔ تاہم اسلامی حکومت کا امتیازی وصف یہ ہے کہ وہ ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے جس کے اصول و ضوابط کسی خطۂ ارضی تک محدود و محصور نہیں بلکہ وہ یکساں طور پر پوری انسانیت کے لئے ہیں۔

اسلامی ریاست کے مقاصد اسلامی حکومت کا اولین مقصد اسلامی ارکان و عبادات کا قیام، نیکیوں کو پھیلانا اور برائیوں کو مٹانا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں۔

"اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ (الحج - ۴۱)	مسلمان وہ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین کا اقتدار سونپ دیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام کریں گے اور نیکیوں کا حکم دیں گے اور برائیوں سے روکیں گے

دوسری جگہ فرمایا:

"لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ	ہم نے اپنے رسولوں کو روشن دلائل دیکر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ انسان انصاف پر قائم رہیں اور

Marfat.com

فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ
لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ
يَّنْصُرُهٗ بِالْغَيْبِ" (الحدید - ۲۵)

ہم نے لوہا (یا مت کی قوت و شوکت) اتارا
جس میں سخت خطرہ ہے اور لوگوں کیلئے بہت
فوائد بھی ہیں۔ تاکہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ کون
اسکی اور اسکے رسولوں کی بن دیکھے مدد کرتا ہے

اس آیت میں میزان کے لفظ سے اسلام کے متوازن اور مبنی بر عدل و انصاف احکام مراد ہیں جن کے وسیلے سے لوگوں میں عدل و انصاف قائم ہوتا ہے۔ الحدید (لوہا) سے احکام جہاد اور حدود و تعزیرات مراد ہیں۔ اس آیت میں حکومت حاصل کرنے کا مقصد یہ بتایا کہ خدا کے دین کو قائم کیا جائے اور اس کے رسولوں پر نازل شدہ شریعت کو دنیا میں عملاً نافذ کیا جائے :

ایک اور جگہ فرمایا :۔

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ
وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ
فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ
مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ
دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ
وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ
أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ
بِي شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذَٰلِكَ
فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ.
وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ

تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل
کریں ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ ان کو
زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا کہ ان
سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی اور جس
دین کو اس نے ان کے لئے پسند کیا ہے۔
اس کو ان کے لئے قوت دیگا اور خوف و
ہراس کے بعد ان کو امن بخشے گا۔ وہ میری
عبادت کریں گے۔ اور میرے ساتھ کسی
اور کو شریک نہیں کریں گے اور جو اس
کے بعد نافرمانی کی روش اختیار کریں گے۔
وہ فاسق ہیں اور اے مسلمانوں! نماز

Marfat.com

ترجمہ: حکومت" قائم کرو اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرتے رہو
(سورۃ نور۔۵۵۔۵۶) اور رسولؐ کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے

ان آیات سے معلوم ہوا کہ اسلام میں حکومت کا مقصد دین کو قائم کرنا، خدا کی کتاب کے مطابق عدل و انصاف کرنا، نیکیوں کا پھیلانا اور برائیوں کا مٹانا ہے۔ یہ ریاست ایک نظریاتی اور مقصدی ریاست ہے۔ اور اس کی اصل ذمہ داری اس اصول کی سربلندی ہے جسے قائم کرنے کے لئے وہ قائم کی جاتی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اسلام میں ریاست و حکومت کا ادارہ کن اعلیٰ مقاصد کے لئے قائم کیا جاتا ہے۔ اور اس کے پیش نظر کونسے بلند نظریات ہیں۔

سوال نمبر۸۸:۔ اسلامی ریاست میں اقتدار کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہوتی ہے؟ مدلل طور پر بیان کیجیے۔

جواب:۔ اسلامی ریاست میں اقتدارِ اعلیٰ خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہی قانون ساز اور دستور ساز ہے۔ اس کے سوا کسی کو آئین سازی کا حق نہیں ہے ریاست اس کے تابع ہوتی ہے۔ ریاست کا کام قانون بنانا نہیں بلکہ ایک بنے بنائے خداوندی قانون کو چلانا ہے۔ اسلامی ریاست کو کلی اختیار حاصل نہیں بلکہ یہ اپنے اختیارات خدا کے قانون سے حاصل کرتی ہے۔ اور اس کی ماتحت اور پابند ہے۔ اسلامی حکومت میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت ہر شخص کی اطاعت سے مقدم ہے۔ ریاست کی وفاداری اسی وقت تک ہے جب تک وہ احکامِ خداوی کی تابع ہے۔ اور اگر وہ خدا کے احکام کی اطاعت نہ کرے تو مسلمان ہرگز اس کی اطاعت کے پابند نہیں ہیں۔ قرآن کریم میں اس اصول کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ — اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کا کہا

فَمِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔ (سورہ نساء۔ ۵۹)

یا لو جو تم میں سے صاحب امر ہوں پھر اگر تمہارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع پیدا ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو، اگر تم واقعی اللہ اور روز آخر پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت میں اللہ اور رسول دونوں کے لئے "اطیعوا" کا لفظ الگ الگ لایا گیا ہے اولی الامر کے لئے "اطیعوا" کے لفظ کو دہرایا نہیں گیا۔ واو عاطفہ کے ذریعے اس کو "الرسول" سے ملا دیا گیا ہے۔ اس سے اس جانب اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت اصلی اور غیر مشروط ہے۔ بخلاف ازیں مسلم حکام کی اطاعت اصلی نہیں بلکہ اللہ و رسولؐ کے زیر اثر اور اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ اللہ و رسولؐ کے اطاعت شعار ہوں۔ جب عوام اور اصحاب الامر میں تنازعہ واقع ہو تو اس کو اللہ و رسولؐ کی طرف لوٹانے کا حکم دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ متنازعہ امور میں صرف اللہ و رسولؐ کا حکم ہی آخری سند ہو سکتا ہے۔ حاکم اس میں فیصلہ صادر کرنے کا مجاز نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا:۔

"لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ"

خدا کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت درست نہیں۔

ایک اور حدیث میں آپؐ نے فرمایا۔

"اصحاب الامر کی بات سننا اور اس کی تعمیل کرنا مسلمان پر لازم ہے خواہ یہ بات اسے پسند ہو یا نہ ہو۔ لیکن یہ اطاعت اسی وقت تک ہے جب تک وہ خدا کی نافرمانی کا حکم نہ دے۔ اگر حاکم خدا کی نافرمانی کا حکم صادر کرے تو نہ اس کی بات سننا ضروری ہے اور نہ اس پر عمل کرنا۔" (بخاری و مسلم)

مذکورہ صدر آیت میں "منکم" (تم میں سے) کی شرط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ

اصحاب اقتدار جن کو فیصلہ کن اختیارات حاصل ہوں اور جو ریاست کی بنیادی پالیسی بنائیں مسلمانوں ہی میں سے ہونے چاہئیں۔ اس آیت کی رو سے اسلامی ریاست کی کلیدی آسامیوں پر فائز ہونے کا حق انہی لوگوں کو دیا گیا ہے۔ جو مسلمانوں میں سے ہوں۔ اولی الامر کی اطاعت کا حکم اس لئے دیا گیا ہے تاکہ ملکی نظم و نسق ٹھیک ہی چلتا رہے۔ اور اس میں خلل واقع نہ ہو۔ لیکن اولی الامر کی اطاعت خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے تابع ہے۔ اگر وہ کوئی ایسا حکم دیں جو قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اس کی اطاعت نہیں کی جا سکتی۔ اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اصحاب الامر سے بحث و مذاکرہ اور ان پر تنقید و محاسبہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کو ان سے اختلاف کرنے کا جواز بھی اس آیت سے ثابت ہوتا ہے۔ مگر یہ تنقید و محاسبہ اور اختلاف آئینی حدود کے اندر ہونا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

"تم پر ایسے لوگ بھی حاکم بن کر آئیں گے جن کی بعض باتوں کو تم پسند کرو گے اور بعض کو ناپسند کرو گے۔ جس نے ان کے برے افعال پر تنقید کی وہ بری الذمہ ہوا اور جس نے ان کو ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا مگر جو ان پر راضی ہوا اور ان کی پیروی کرنے لگا وہ پکڑا جائے گا۔" (صحیح مسلم)

حکام کی اطاعت کے لئے جو شرط لگائی گئی ہے اس سے صاف عیاں ہے کہ اسلامی ریاست ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے۔ اس کا مقصد ایک نظریہ کی تعمیل کرنا ہے۔ اس میں ایک اصول کی اطاعت کی جاتی ہے۔ صرف اقتدار کے سامنے سر جھکانا مقصود نہیں۔ اسلامی ریاست کے نظریاتی ہونے سے چند امور ثابت ہوتے ہیں۔

۱۔ اسلام میں ریاست مقصود بالذات نہیں بلکہ حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے اس طرح اسلام اور فاشزم کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے جس میں ریاست ایک مقصد

Marfat.com

کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اور فرد کی کوئی مستقل حیثیت باقی نہیں رہتی۔

۲۔ اسلامی ریاست کا مقصد افراد کو اس بات کا سہولت بہم پہنچانا ہے کہ وہ خدا اور رسولؐ کے احکام کو پورا کر سکیں۔ اسلامی ریاست خود بھی احکامِ خداوندی کی مطیع ہوتی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ" (میں اولیں اطاعت گزار ہوں) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست کا سربراہ بھی ایک عام شہری کی طرح اسی قانون کا پابند ہے۔

۳۔ اسلامی ریاست بڑی حد تک ایک لادینی حکومت سے مختلف ہے۔ لادینی حکومت آسمانی و الہامی ہدایات کے عین برعکس محض عقلی ڈھکوسلوں کی پیروی کرتی ہے اور کسی بالاتر قانون کی پابند نہیں ہوتی۔ ایسی ریاست مذہب کے معاملہ میں غیر جانبدار بھی ہو سکتی ہے۔ اور اجتماعی معاملات میں اس کی مخالفت بھی کر سکتی ہے۔ بخلاف ازیں اسلام دینی ہدایات کی روشنی میں دنیوی معاملات کی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔

سوال نمبر ۸۹ :۔ "اولی الامر منکم" کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کو کلیدی آسامیوں پر تعینات نہیں کیا جا سکتا۔ کیا یہ جانبداری اور بےجا تعصب نہیں ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں سے امتیازی سلوک کیا جائے؟

جواب :۔ اسلامی ریاست ان غیر مسلموں سے بےحد فراخدلی اور رواداری کا سلوک کرتی ہے جو اس کے وفادار ہوں۔ اور مسلمانوں کی طرح اسلامی ریاست میں اقامت گزیں ہوں۔ اس ضمن میں اسلام نے جس وسعتِ قلب اور غیر جانبداری کا ثبوت دیا ہے۔ دنیا کا کوئی مذہب اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ ہندوستان میں مسلم سلاطین ایک عرصہ دراز تک برسرِ اقتدار رہے ہیں۔ اس طویل عرصہ میں انہوں نے ہندوؤں کو نہ صرف حکومت کی کلیدی آسامیوں پہ فائز کیا بلکہ وہ ان کے عہدِ حکومت

Marfat.com

ہیں ہر طرح مسرور و شادماں رہے اور کبھی شکایت کی نوبت نہ آئی۔ مذہبی رواداری اور بے تعصبی کے لئے اکبر کا عہدِ حکومت ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلم سلاطین کی یہ رواداری ان اسلامی تعلیمات کی غمازی کرتی ہے جن سے متاثر ہو کر انہوں نے غیر مسلموں سے یہ طرزِ عمل اختیار کیا۔ اسلامی ریاست حدودِ ملک میں غیر مسلموں کو ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچاتی ہے۔ وہ ان کی جان و مال، عزت و آبرو اور مذہب کا پورا تحفظ کرتی ہے۔ معاشی اعتبار سے ان کو وہی آزادی حاصل ہے جو اہلِ اسلام کو۔

ان تمام سہولتوں کے باوصف جو اسلامی ریاست غیر مسلم رعایا کو دیتی ہے وہ اس بات کو گوارہ نہیں کرتی کہ اس کا سربراہ ایک ایسا شخص ہو جو ان اصول و قواعد کو سرے سے مانتا ہی نہیں جن کی اساس پر وہ ریاست معرضِ وجود میں آئی ہے۔ اور جو اس کے مقصدِ وجود کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ صرف اسلامی ریاست ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ دنیا کی کوئی نظریاتی مملکت اپنے اندر اتنی لچک پیدا نہیں کرسکتی۔ کہ وہ ایسے شخص کو اپنا سربراہ بنالے جو اصولی طور پر اس سے متفق نہیں اور جن نظریات پر اس کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ ان کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ یہ بات اس قدر معقول ہے کہ آج دیارِ مغرب کے رہنے والے بھی اس کا اعتراف کر رہے ہیں چنانچہ اس کے نتیجہ میں ایک غیر اشتراکی شخص اشتراکی ریاست کا سربراہ نہیں بن سکتا۔ ایک فاشسٹ ریاست کا صدر ایک اشتراکی نہیں بن سکتا۔ اس کی حد یہ ہے کہ جن ممالک میں جمہوری حکومت رائج ہے ان میں بھی یہ مسئلہ زیرِ بحث ہے کہ آیا جمہوریت پر ایمان نہ لانے والوں کو وہاں مسندِ اقتدار پر فائز کیا جاسکتا ہے یا نہیں ؟ جب کیلیا کے الیکشن میں اشتراکیوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی تو سیاسی مفکرین کے یہاں یہ سوال ابھرا کہ آیا ایک جمہوری ملک میں اشتراکیت پسند لوگ برسرِ اقتدار آسکتے ہیں یا نہیں ؟ (دیکھئے برٹرینڈ رسل کا مضمون در مانچسٹر گارڈین ۱۲ ؍ اکتوبر ۱۹۵۲ء)

Marfat.com

ڈیلی ٹیلیگراف لندن کا سیاسی مبصر اپنے ایک مضمون میں لکھتا ہے۔

"ہم اشتراکی پارٹی کو اقتدار کے لئے جدوجہد کی آزادی اس لئے دیتے ہیں کہ ہمیں یقین ہے کہ اس کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں۔ اگر اس کی کامیابی کا کوئی بھی امکان پیدا ہو جائے تو ہماری سیاسی فطرت ہمیں فوراً یہ سوچنے پر مجبور کر دے گی کہ ہم اپنے جمہوری نظریات کو بدل لیں۔ اشتراکیت امریکی و برطانوی جمہوری روایت کو اس بری طرح تہ و بالا کر دیتی ہے کہ اشتراکیوں کی انتخابی فتح کو بھی جمہوری قرار دینا نہایت کھلے ارتداد کے مترادف ہوگا۔"

مغربی ممالک میں شہریوں کے درمیان مذہبی بلکہ وطنی اور فرقہ وارانہ بنیادوں پر امتیاز برتا جاتا ہے۔ انگلستان میں سربراہ حکومت کیلئے ضروری ہے کہ وہ پروٹسٹنٹ ہو اور انگریزی کلیسا سے وابستہ ہو۔ آئرلینڈ کے صدر کے لئے کیتھولک عیسائی ہونا ضروری ہے۔ ارجنٹائن کا صدر یا نائب صدر صرف کیتھولک فرقہ کا عیسائی ہی ہو سکتا ہے۔ ڈنمارک کے بادشاہ کے لئے ایونجلیکل چرچ کا عیسائی ہونا ضروری ہے۔ سویڈن میں بادشاہ اور سٹیٹ کونسل کے ممبروں کے لئے ایونجلیکل ہونا لازمی ہے۔ یونان کے بادشاہ کے لئے مشرقی کلیسا کا پیرو ہونا اور سپین کے صدر کا رومن کیتھولک ہونا ضروری ہے۔ تھائی لینڈ کے دستور کی رو سے سربراہ مملکت صرف بدھ مذہب کا پیرو ہو سکتا ہے۔

جب یہ تمام ریاستیں جو اپنے کو لامذہب (SECULAR) کہتی ہیں، سربراہ مملکت کیلئے ایک خاص مذہب کا پیرو ہونا ضروری سمجھتی ہیں تو اسلامی ریاست جو بنیادی طور پر ایک نظریاتی ریاست ہے اور اس بات کا صاف اعلان بھی کرتی ہے کہ وہ ایک اصولی ریاست ہے یہ کیسے گوارا کر سکتی ہے کہ اس کی کلیدی آسامیوں پر وہ لوگ فائز ہوں جو اس کے اصول و قواعد ہی کے منکر ہیں۔

Marfat.com

اسلام اور لادینی ریاست

سوال نمبر ۹:۔ لادینی تحریک کیونکر پیدا ہوئی اور اس نے مغربی زندگی پر کیا اثرات ڈالے؟ مدلل لکھئے۔

جواب:۔ یورپ کے تاریک ادوار (DARK AGES) میں جب پوپ نے وسیع اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر مذہب کا انکار کرنے والوں پر مظالم ڈھانے شروع کئے تو مغربی منکرین اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ پوپ نے بادشاہت سے گٹھ جوڑ کر کے اس نئی تحریک کو کچل دینا چاہا۔ پوپ کے ظلم و تعدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ لوگ سرے سے مذہب ہی سے متنفر ہو گئے۔ اس بغاوت نے لادینی سیاسی تحریک کو جنم دیا۔ یہ نئی تحریک باقاعدہ اس وقت اٹھی جب ۱۹۳۲ء میں جیکب ہولیک نے سیاست و مذہب کی دوئی کا شاخسانہ کھڑا کیا۔ پڑھے لکھے لوگوں نے اس تحریک کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور بہت جلد یہ مقبول ہو گئی۔ یہ تحریک اس دعویٰ کو لے کر اٹھی تھی کہ مذہب ایک پرائیویٹ چیز ہے اور اجتماعی و سیاسی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ آغاز کار میں صرف یہ بات پیش نظر تھی کہ ہر شخص کسی مذہب کو اختیار کرنے نہ کرنے میں آزاد ہے۔ اور اس میں کسی کو جبر یا مداخلت کا حق حاصل نہیں لیکن بعد میں اس تحریک کے داعی مذہب کے مخالف اور فلسفہ مادیت یا اشتراکیت کے مبلغ بن گئے۔ اس تحریک کو اعتدال میں لانے کی بہت کوشش کی گئی۔ مگر اس ضمن میں سب مساعی بیکار ثابت ہوئیں۔ نتیجتاً ایک لادینی تحریک کی صورت میں نکلا جو اب اقصائے عالم میں پھیل چکی ہے اور جس کے اثرات ہر جگہ نمایاں ہیں۔

لادینی تحریک کے اثرات: لادینی تحریک جب ایک مرتبہ شروع ہوئی تو بڑھتی ہی چلی گئی۔ اس سے مندرجہ ذیل اثرات ظہور پذیر ہوئے:

Marfat.com

۱۔ لادینی تحریک کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ انسانیت قلق و اضطراب، شکوک و شبہات اور ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گئی۔ اس فکری انتشار نے اشتراکیت اور فسطائیت جیسی تحریکوں کو جنم دیا اور انسان کو مادہ پرستی کے جہنم میں جھونک دیا۔ اشتراکیت کا مشہور نقاد آر۔ این کیریونٹ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"اشتراکیت غربت و افلاس اور خراب سماجی حالات کی پیداوار نہیں ہے اس لئے کہ اس کی اصلی کشش نچلے افلاس زدہ طبقات کے مقابلہ میں اچھی تنخواہ پانے والے مزدوروں اور تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ کارکنوں کیلئے ہے یہ اس امر کا نتیجہ بھی نہیں ہے کہ عوام میں اب سرمایہ دارانہ نظام کی ناانصافیوں اور بے انصافیوں کا شعور پیدا ہو گیا ہے۔ اور نہ ہی یہ نظام پیداوار کی اکتا دینے والی یکسانی اور عدم تنوع کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے اور آخری تجزیہ ہمیں اسی نتیجہ تک لاتا ہے کہ اشتراکیت ان نظریات کے مجموعہ کا نام ہے۔ جنہوں نے ہماری زندگی کے اس خلاء کو پُر کیا ہے جسے منظم مذہب کے انہدام نے پیدا کیا تھا اور جو زندگی پر لادینیت کے غلبہ کا لازمی نتیجہ تھا۔ اس نظام فکر و عمل کا مقابلہ اگر کیا جا سکتا ہے تو ایک دوسرے ہمہ گیر نظام حیات ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ جو کچھ دوسرے اصولوں کا علمبردار ہو۔"

۲۔ لادینی تحریک کا دوسرا اثر یہ رونما ہوا کہ افراد خودغرضی، لذت پرستی اور نفسانی خواہشات کی بندگی میں مبتلا ہو گئے۔ اجتماعی زندگی ظلم و تعدی سے بھر گئی اور ملکی و قومی زندگی کے لئے کوئی ضابطہ اخلاق باقی نہ رہا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اس صدی نے دو ہولناک عالمی جنگوں کا مشاہدہ کیا جن میں ہلاک و زخمی ہونے والوں کی مجموعی تعداد تاریخ عالم کی تمام جنگوں میں قتل اور زخمی ہونے والوں کی تعداد سے کہیں زیادہ ہے۔

۳۔ لادینی تحریک کے تمام اخلاقی اثرات بھی بڑے مہلک ثابت ہوئے۔ استقامت

Marfat.com

واستقلال، جرأت و شجاعت اور پامردی و مردانگی جیسے جوہر ختم ہوگئے۔ نیکی اور بدی میں کوئی فرق نہ رہا۔ انفرادی اور اجتماعی اخلاق کی بنیاد یہ ٹھہری کہ جو چیز بھی فائدہ مند اور افادیت و مصلحت کی موجب ہو وہ جائز اور درست ہے جو کام جیسے بھی بن پڑے نکال لیا جائے اس میں کوئی اخلاقی قباحت نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرہ میں لاتعداد برائیاں پیدا ہوگئیں جنہوں نے امن و سکون غارت کر دیا نیکیاں روپوش ہوگئیں اور برائیاں منظر عام پر جلوہ گر ہوگئیں۔ یہ سب لادینی تحریک کے برگ و بار ہیں۔

۴۔ یہ بات تجربہ سے ثابت ہے کہ اگر خالص مادی فائدہ کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیا جائے اور کوئی اعلیٰ اخلاقی و روحانی مقصد پیش نظر نہ ہو تو مادی فائدہ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی لادینی تحریک کی ناکامی کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

”اب یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ اگر دنیوی عیش و مسرت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا جائے تو ان سے مادی خوشحالی اور دنیوی راحت و سکون بھی حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اگر کوئی بلند روحانی مقصد پیش نظر ہو تو اس کے ضمن میں انسان کو دنیوی مسرت و شادمانی بھی حاصل ہو جاتی ہے۔“

۵۔ اصل بات یہ ہے کہ لادینی تحریک اب فرسودہ اور داستان پارینہ بن چکی ہے اب اس کی ناکامی کا راز طشت از بام ہو چکا ہے۔ جن مخصوص حالات میں اس تحریک نے جنم لیا تھا وہ اب ماضی کی یادگار بن چکے ہیں اور تاریخ ان سے ہزاروں میل آگے نکل گئی ہے۔ تاریخ بڑی تیز رو ہے اور اس کی رفتار کو کوئی روک نہیں سکتا۔ کچھ خاص قسم کے تاریخی عوامل تھے جنہوں نے ایک مخصوص ذہنی فضا پیدا کر کے اس تحریک کو بروئے کار لانے میں مدد دی تھی۔ ان عوامل کی عدم موجودگی میں یہ تحریک زندہ

Marfat.com

نہیں رہ سکتی۔ دورِ حاضر میں وہ عوامل سب ختم ہو چکے ہیں اس لئے سیکولرزم کا زندہ
رہنا اب بحالات ہیں سے ہے۔

سیکولرزم کا خاص نظریہ یہ ہے کہ انسانوں کے سیاسی اور ریاستی معاملات میں ان کو پوری آزادی حاصل ہو اور مذہب اس میں کوئی مداخلت نہ کرے۔ انیسویں صدی کی سیاسی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں سیکولرزم کا خصوصی نصب العین انسانوں کو انفرادی قومی اور معاشی امور میں مکمل آزادی دینا تھا یہاں تک کہ ریاست یا کوئی ادارہ بھی اس آزادی میں خلل انداز نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ریاست کی حیثیت صرف ایک دفاعی ادارہ کی ہو جس کا مقصد صرف اندرونی نظم کو قائم رکھنا اور ملک کو بیرونی حملہ سے بچانا ہے۔ اس قسم کی ریاست میں فرد کو پوری آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ جیسے چاہے زندگی بسر کرے۔ یہ تصورِ ریاست انیسویں صدی میں موجود تھا مگر اب بدل چکا ہے۔ آج ریاست کی حیثیت ایک ہمہ گیر ادارہ کی ہے جس میں تقریباً انسانی زندگی کے سب شعبے شامل ہیں۔ آج یہ ممکن نہیں کہ ریاست انسانوں کو مکمل آزادی دے کہ جیسے چاہیں کریں۔ آج ریاست کا ادارہ بہت وسیع ہو چکا ہے وہ زندگی کے ہر شعبہ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا اور اسے اپنے آپ سے ہم آہنگ بناتا ہے۔

دورِ حاضر میں حکومت علم کی شمع روشن کر کے جہالت کو ملک بدر کرتی ہے۔ دولت کی مساوی تقسیم سے غربت کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ آج حکومت کا دائرہ کار اس قدر بڑھ گیا ہے کہ سماجی برائیوں کا انسداد کرنا شہریوں کی تعلیم و تربیت بیماروں کا علاج مظلوموں کی دادرسی مجبور و معذور لوگوں کی امداد حکومت کے فرائض میں شامل ہے۔ آج کل کی ریاست ایک فلاحی ریاست ہے اور اس کے لئے نظریاتی غیر جانبداری کسی طرح ممکن نہیں۔ موجودہ ریاست کوئی نہ کوئی نظریہ ضرور اختیار کرے گی۔ بھلائی یا برائی، کامیابی یا ناکامی میں سے

Marfat.com

کسی ایک کو اختیار کرنا اور اس کی روشنی میں اپنا طریق کار متعین کرتا ہوگا۔ یہ حقیقت ہے کہ آج کی ریاست ایک اصولی اور نظریاتی ریاست بنتی چلی جا رہی ہے۔ سیکولرزم جن بنیادوں پر معرضِ وجود میں آیا تھا۔ اب ان کی یاد صرف تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ البتہ حقیقت کی دنیا میں اس کا کوئی نشان نہیں ملتا۔ لادینی تحریک کے آثار اب ماضی کی یادگار رہ چکے ہیں۔ اور اب اس کا کوئی نشان باقی نہیں۔ نہ اس کی گنجائش کا کوئی امکان ہے۔ تاریخ اسے پیچھے چھوڑ کر ہزاروں میل آگے بڑھ چکی ہے۔ آج اس بات کی ضرورت ہے کہ سیکولرزم کے عین برخلاف نظریاتی ریاست قائم کی جائے جو اس کی ضد ہے اور جس کو اسلام قائم کرنا چاہتا ہے۔

مذکورہ بالا بیان اس حقیقت کی آئینہ داری کرتا ہے کہ سیکولرزم کی تحریک ایک خاص ماحول اور مخصوص گردوپیش کے نتیجہ میں اٹھی تھی جس کا اب کوئی نشان باقی نہیں ہے۔ دورِ حاضر کی ضروریات اس کے مخصوص حالات اور تقاضے پکار پکار کر کہہ سکتے ہیں کہ اب ایک نظریاتی ریاست کا وجود از بس ناگزیر ہے۔ دورِ حاضر کی اس پکار کا جواب اسلام کے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔

سوال نمبر ۹۱:۔ اسلامی ریاست اور قومی ریاست کے مابین نقطۂ فرق و امتیاز واضح کیجئے۔

جواب:۔ اسلامی ریاست ایک خالص قومی ریاست سے جداگانہ نوعیت کی ہوتی ہے۔ قومی ریاست نظریۂ قومیت کی ساختہ پرداختہ ہوتی ہے۔ یہ ریاست محض رنگ و نسل قوم و وطن زبان و بیان اور کالے گورے کے امتیاز پر قائم ہوتی ہے کسی ملک کا حدودِ اربعہ اس کے پہاڑ اور میدان، اس کا خاص رنگ ڈھنگ اور اس کے خصوصی خدوخال اس کی حد بندی کرتے ہیں۔ یہ امتیازات قومی حکومت کو ایک مخصوص انداز میں پیش کرتے ہیں۔

اس کے عین برخلاف اسلامی حکومت ان امتیازات اور حدود سے آشنا نہیں۔ اس کے یہاں کالے گورے، عربی عجمی، زنگی و فرنگی، امیر و غریب اور آقا و غلام کی کوئی تمیز نہیں۔ وہ جغرافیائی حد بندیوں اور قومی خصوصیتوں کی قائل نہیں۔ وہ ایک نظریاتی ریاست ہے جو شخص اس کی دعوت پہ لبیک کہتا ہے اور اس کے افکار و آراء کو دل و جان سے قبول کر لیتا ہے۔ وہ اس کا فرد بن جاتا ہے۔ یہ نظریہ اختیار کرنے کے بعد اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کس قوم کا فرد ہے؟ کونسی زبان بولتا ہے؟ کیا کام کرتا ہے اور کہاں رہتا ہے؟ یہ ریاست انسانی برادری اور بین الاقوامیت کی اساس پہ معرض وجود میں آتی ہے۔ اس کا نظریہ قومیت مصنوعی اور عارضی عوامل کی پیداوار نہیں بلکہ ایک جدید قسم کا نظریہ ہے جو لوگ بھی اس کے اصولوں کو اپنالیں وہ ایک امت اور ایک جماعت بن جاتے ہیں۔ یہ ریاست آغاز کار میں اپنے لئے ناگزیر طور پر کچھ جغرافیائی حدود اور ایک خاص ملک و وطن تو اختیار کرتی ہے لیکن یہ اپنے آپ کو اس میں محدود نہیں رکھتی۔ اس کی اصل دعوت یہ ہے کہ رنگ و نسل، قوم و وطن اور اس قسم کی محدود پابندیوں کو توڑ کر ایک نظریاتی قومیت اختیار کرے اور اسی بنیاد پہ ایک عالمگیر ریاست قائم کرے۔ اس طرح اسلامی ریاست ان ریاستوں سے بھی مختلف ہو جاتی ہے جو محض جغرافیائی قومیت پہ مبنی ہے اور جن کے پیش نظر کوئی نظریہ اور دعوت نہیں۔

اسلام اور تھیاکریسی

سوال نمبر ۹۲:۔ اسلامی ریاست اور تھیاکریسی کا فرق واضح کیجئے؟

جواب:۔ اسلامی ریاست اور تھیاکریسی میں بنیادی فرق و امتیاز پایا جاتا ہے۔ دونوں کے مقاصد، معیار، مدار، طرز و انداز اور طریق کار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مستشرقین یورپ نے جس طرح اسلام کو اپنے تراشیدہ اتہامات کا نشانہ بنایا ہے ان میں

Marfat.com

سلسلہ ایک یہ بھی ہے کہ اسلامی نظام حکومت دراصل تھیا کریسی کا چربہ ہے۔ تحقیق فریقین سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنفین یورپ کا یہ اتہام قطعی طور پر بے بنیاد ہے اور اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اسلامی ریاست اور تھیا کریسی میں حسب ذیل فرق پایا جاتا ہے۔

تھیا کریسی کی تعریف تھیا کریسی (THEOCRACY) کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

"تھیا کریسی وہ نظام حکومت ہے جس میں خدا کو سرکز اقتدار تصور کیا جاتا ہے اور مذہبی نمائندے اور پروہت خدا کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اس کا نظم برقرار رکھتے ہیں"۔

مذاہب کے انسائیکلوپیڈیا میں تھیا کریسی کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"تھیا کریسی حکومت کی ایک ایسی قسم ہے جس میں اقتدار اعلیٰ کا مرکز خدا یا خداؤں یا کسی اور کتابی قوت کو سمجھا جاتا ہے۔ حقیقی حکمران پادری یا مذہبی پروہت ہوں اور ان کے احکام کو خداوندی احکام سمجھا جاتا ہے"۔ (مذہب اور مذاہب کا انسائیکلوپیڈیا ص ۳۷۴)

تاریخی اعتبار سے یہودیوں، عیسائیوں اور برہمنوں کی حکومتوں کو صحیح معنوں میں تھیا کریسی حکومتیں کہا جا سکتا ہے۔ اسلامی ریاست بلاشبہ خدا کی حاکمیت اعلیٰ پر مبنی ہوتی ہے۔ مگر اس میں اور تھیا کریسی طرز حکومت میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے۔ دونوں کے مابین فرق و امتیاز کے خصوصی خدوخال یہ ہیں۔

ا۔ تھیا کریسی میں نظری طور پر خدا کو حاکم اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے مگر عملاً اقتدار پر ایک مذہبی طبقہ قابض ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں تمام اختیارات ہوتے ہیں۔ اس کی رائے کو قانون کا درجہ دیا جاتا ہے۔ اس طبقہ کو تنقید و محاسبہ سے بالا تصور کیا جاتا ہے۔ یہ طبقہ بلا جھجک تمام اختیارات استعمال کرتا ہے۔ اور کوئی اس سے محاسبہ کا حق نہیں رکھتا۔ اسلام میں ایسا کوئی طبقہ نہیں پایا جاتا جو تنقید و محاسبہ سے بالا ہو۔

اسلام میں بندہ اور خدا کے تعلق کو جوڑنے کے لئے کسی واسطہ اور ذریعہ کی ضرورت نہیں

بندہ براہ راست خدا سے اپنا رشتہ قائم کر سکتا ہے۔ اسلامی تعلیمات ہر فرد بشر کے سامنے ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح نہ صرف واشگاف ہیں بلکہ ان سے آگاہی حاصل کرنا اور ان کو عملی طور پر اپنانا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اسلام میں حکام بالا خدا کے سامنے اسی طرح جوابدہ ہیں جیسے ایک عام آدمی۔ دونوں میں قطعی طور سے کوئی فرق نہیں۔ اسلام میں اصحاب الامر کے لئے علم اور تقویٰ کے سوا کسی شرط کا پایا جانا ضروری نہیں۔ اور علم و تقویٰ کی راہیں سب کے لئے یکساں طور پر کھلی ہیں۔ یہ کسی فرد بشر کی میراث نہیں۔

۲۔ اسلامی تاریخ کے اوراق اس برہمنیت اور پاپائیت کے وجود سے یکسر خالی ہیں۔ جو یورپ، ہندوستان، جاپان اور تبت میں پائی جاتی ہے۔ مسلم علماء قدیم ہی سے حق کے محافظ اور آزادی کے علمبردار رہے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ آزادی کی جدوجہد میں مجاہدانہ سرگرمی دکھائی اور ظلم و ستم اور جور و استبداد کا نشانہ بنے۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابن سرہندی رحمہم اللہ اور ان کے ہزاروں رفقاء کی مثالیں موجود ہیں۔ یہاں علماء کا کوئی خاص طبقہ نہیں ہے۔ اسلام میں علم پر کسی کی اجارہ داری نہیں علم کی راہ ہر شخص کے لئے کھلی ہے۔ اسلام کی سیاسی تاریخ میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی کہ "مذہبی دیوانوں" نے کبھی عوام کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا ہو۔ جیسا کہ قرون وسطیٰ میں یورپ اور ہندو تاریخ میں برہمن نے بنایا ہے۔ مغربی مورخین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اسلامی حکومت نے یورپ کے تھیاکریسی نظام حکومت کی طرح عوام کو کبھی ظلم و ستم کا نشانہ نہیں بنایا۔

رابرٹ بریفالٹ لکھتا ہے۔

"مشرق (یعنی عالم اسلام) میں تھیاکریسی کبھی بھی ذہنی استبداد کا موجب نہیں بنی۔ مغربی دنیا (بشمول روم و یونان) جس ظلمت پسندی، ظلم اور آزادی رائے پر پابندی کے لئے مشہور ہے۔ اس کی مثال ہمیں اسلامی دنیا میں نہیں ملتی۔"

Marfat.com

(THE MAKING OF HUMANITY P. 113)

۳۔ تھیاکریسی میں خدا کا نام تو موجود تھا مگر زندگی کے گوناں گوں مسائل حل کرنے کے لئے کوئی الہامی ہدایت موجود نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پادریوں اور پروہتوں نے اپنی رائے سے کام لینا شروع کر دیا۔ اور خدا کے نام سے اپنا قانون جاری کیا۔ ان کا بنایا ہوا قانون، تمام انسانی خواہیوں کا مظہر تھا۔ ایک خاص طبقہ کے امتیازی مفادات کا تحفظ اس پر مزید تھا۔ نتیجہ بے انصافی اور ظلم و تعدی کے سوا کچھ نہ نکلا۔ مذہبی طبقہ کو تنقید و محاسبہ سے بالا قرار دیا گیا تا کہ اس کی ہر بات بلا روک ٹوک مان لی جائے۔ خواہ وہ کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔

اسلامی ریاست کا معاملہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ یہاں ایک آسمانی کتاب ہدایت موجود ہے۔ یہ کتاب جس کو نازل ہوئے چودہ صدیاں گذر چکی ہیں جوں کی توں محفوظ ہے اس میں سر مو تغیر رونما نہیں ہوا۔ اور نہ ہو سکتا ہے۔ کتاب الٰہی میں اصحاب الامر سے اختلاف کرنے والوں کو ہدفِ تنقید بنانے کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے بلکہ اسے فرض قرار دیا گیا ہے تا کہ ان کے قدم جادۂ مستقیم سے ڈگمگا نہ جائیں۔ کتاب الٰہی کو آخری سند کا درجہ حاصل ہے اور ہر شخص صرف اسی کو دلیل و برہان کے طور پر پیش کرنے کے لئے مجبور و مامور ہے ہر شخص براہ راست قرآن سے استفادہ کرنے کا مجاز ہے۔ علم القرآن کسی کی میراث نہیں صرف جہد و سعی مطلوب ہے۔ اس سے اسلامی نظام حکومت اور تھیاکریسی کی راہیں جدا جدا ہو جاتی ہیں۔

۴۔ اسلام اور تھیاکریسی کے مزاج میں ایک نمایاں اور اہم فرق یہ بھی ہے کہ تھیاکریسی نقطۂ نظر کے مطابق یہ دنیا قابلِ نفرت ہے۔ لہٰذا اس سے جس قدر جلد نجات حاصل ہو سکے غنیمت ہے۔ برہمنیت اور بدھ مت نے تو آواگون کے عقیدے کے مطابق دنیوی زندگی کو کسی پہلی زندگی کے گناہوں کی یاداشت ٹھہرایا۔ اس لئے یہاں الم و رنج اٹھانا ناگزیر ہے۔ یہ دنیا دار العذاب ہے۔ اس زاویۂ نگاہ نے عوام کو ریاست کی اصلاح اور برسر اقتدار طبقہ

کے ظلم و ستم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے سے روک دیا۔ انہوں نے جبر و ستم کے سامنے سپر ڈال دی اور تسلیم و رضا کا شیوہ اختیار کیا۔

اسلام کا طریق کار اس سے یکسر مختلف ہے۔ انسان اس کائنات ارضی پر خدا کا خلیفہ بن کر آیا ہے۔ خدا نے ہی زندگی کی یہ نعمتیں پیدا کی ہیں اور انسان سے متمتع ہونے کی اجازت عطا کی ہے۔ اسلام میں حکومت و ریاست کا اولین مقصد بھلائی کو فروغ دینا اور ایک صالح معاشرہ کو قائم کرنا ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ اسلامی نظام ریاست تھیاکریسی کی ضد ہے۔ اسلامی ریاست اپنا ایک مخصوص مزاج رکھتی ہے اور وہ ایک اصولی اور مقصدی ریاست ہے۔

شورائی اور جمہوری ریاست

سوال نمبر ۹۳: شوریٰ اور جمہوریت کو اسلامی ریاست میں کیا مقام حاصل ہے؟ تفصیلاً لکھیے۔

جواب:- نظریاتی ریاست ہونے کے بعد اسلامی ریاست کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک شورائی اور جمہوری ریاست ہے۔ اس میں تمام انسانوں کو یکساں حیثیت حاصل ہے۔ رنگ و نسل، حسب و نسب اور قوم و ملک کی اساس پر کسی گروہ کو یہاں کوئی برتری حاصل نہیں۔ اس کی بنیاد وحدت انسانیت، احترام آدمیت اور مساوات بنی آدم پر رکھی گئی ہے۔ اس میں سب کو یکساں حقوق و مراعات حاصل ہیں۔ قیادت کی ذمہ داری ان لوگوں کو تفویض کی جاتی ہے جن پر ملت اعتماد کرتی ہو۔ اصحاب الامر اہم امور سلطنت باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں اور نظام حکومت کو جمہور کی مرضی کے مطابق چلاتے ہیں۔ تمام شہریوں کے حقوق و فرائض متعین ہیں۔ حکومت ان حقوق کی ادائیگی کی ذمہ دار ہے۔ اور ان کے لئے خدا اور مخلوق کے سامنے جوابدہ ہے۔ اسلام میں ڈکٹیٹر شپ اور شہنشاہیت کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ یہ خالص جمہوری اور شورائی نظام حکومت کا حامل ہے۔

Marfat.com

اسلامی ریاست میں جمہوریت کی بنیاد چار باتوں پر رکھی گئی ہے۔ اس پر اب ترتیب وار روشنی ڈالی جاتی ہے۔

۱۔ انسانی مساوات کا نظریہ ۔ اسلامی جمہوریت کی بنیاد انسانی مساوات پر رکھی گئی ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

"یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً" (سورۃ نساء۔ ۱)

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں دنیا میں پھیلا دیں۔

دوسری آیت میں فرمایا:۔

"یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ" (الحجرات آیہ ۱۱)

لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ اور قبائل بنا دیا۔ تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ یقیناً اللہ کے نزدیک تم میں سے معزز ترین وہ ہے جو خدا سے زیادہ ڈرنے والا ہو۔

ان دونوں آیتوں سے وحدتِ انسانی اور مساوات ثابت ہوتی ہے اور یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں عظمت و فضیلت کا انحصار اخلاقِ عالیہ اور خوفِ خداوندی پر ہے حسب نسب اور قوم و قبیلہ سے صرف تعارف مقصود ہے نہ کہ اظہارِ عزت و شرافت۔

درج ذیل آیات سے روشن ہوتا ہے کہ انسان خدا کے نزدیک اکرام و احترام کے لائق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ریاست کی بنیاد احترامِ آدمیت پر رکھی گئی ہے۔

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْۤ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ" (سورۃ التین)

یقیناً ہم نے انسان کو بہترین قد و قامت میں پیدا کیا ہے۔

Marfat.com

"وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ" (بنی اسرائیل ۔۷۰) ہم نے آدم کی اولاد کو عزت بخشی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی وحدت و مساوات پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی۔

"اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ أَنَا شَهِيدٌ أَنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ إِخْوَةٌ" اے ہمارے اور ہر چیز کے رب میں گواہی دیتا ہوں کہ سب انسان بھائی بھائی ہیں۔

(مسند احمد ۔ ابوداؤد)

فتح مکہ کے بعد مجمع عام میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ دیا اس میں فرمایا۔

"خوب سن لو کہ فخر و غرور کا ہر سرمایہ خون اور مال کا ہر دعویٰ آج میرے قدموں کے نیچے ہے۔ اے اہل قریش! اللہ تعالیٰ نے دور جاہلیت کا کبر و فخر اور باپ دادا کی بزرگی کے نازکو ختم کر دیا ہے۔ اے لوگو! تم سب آدم کی اولاد ہو۔ اور آدمی مٹی سے بنے تھے۔ حسب و نسب باعث فخر نہیں۔ عربی کو عجمی پر اور عربی کو عجمی پر فضیلت جتانے کا کوئی حق نہیں۔ تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔"

کتاب و سنت کے ان نصوص سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسلامی قانون کی نگاہ میں حاکم و محکوم، آمر و مامور، عربی و عجمی، امیر و غریب اور ادنیٰ و اعلیٰ کی کوئی تمیز نہیں۔ اسلامی قانون میں سب برابر ہیں۔ ایک دفعہ ایک معزز خاتون چوری کی مرتکب ہوئی بعض صحابہؓ نے حضورؐ کی خدمت میں گزارش کی کہ اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے۔ آپؐ نے یہ سفارش قبول نہ کی اور فرمایا۔

"وَالَّذِي نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَوْ سَرَقَتْ فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ لَقَطَعْتُ يَدَهَا" (مسلم) اس ذات کی قسم جس کی مٹھی میں محمدؐ کی جان ہے اگر فاطمہؓ بنت محمدؐ نے بھی چوری کی ہوتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔

یہ ہے وہ معاشرتی اور قانونی مساوات جس سے بہتر مساوات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ **اولی الامر کی اہلیت و صلاحیت** اسلامی جمہوریت کی دوسری بنیاد یہ ہے کہ

Marfat.com

اس کے اولی الامر اور سرداران کار اس قابل ہوں کہ انہیں یہ عظیم ذمہ داری تفویض کی جائے اور لوگ ان پر اعتماد بھی کرتے ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

خِيَارُ أَئِمَّتِكُمُ الَّذِينَ تُحِبُّونَهُمْ وَيُحِبُّونَكُمْ وَتَدْعُونَ لَهُمْ وَيَدْعُونَ لَكُمْ وَشِرَارُ أَئِمَّتِكُمُ الَّذِينَ تُبْغِضُونَهُمْ وَيُبْغِضُونَكُمْ وَتَدْعُونَ عَلَيْهِمْ وَيَدْعُونَ عَلَيْكُمْ وَفِي رِوَايَةٍ تَلْعَنُونَهُمْ وَيَلْعَنُونَكُمْ (صحیح مسلم)

تمہارے بہترین حاکم وہ ہیں جن سے تم محبت کرتے ہو اور وہ تم سے محبت کرتے ہوں، تم ان کے لئے اور وہ تمہارے لئے دعائیں کرتے ہوں اور تمہارے بدترین حاکم وہ ہیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو۔ اور وہ تمہیں ناپسند کرتے ہوں۔ تم ان کیلئے اور وہ تمہارے لئے بددعا کرتے ہوں۔

ایک حدیث میں بددعا کی بجائے لعنت کا لفظ آیا ہے۔

مسلمانوں کے تمام فرقے اس ضمن میں متحد الخیال ہیں کہ اصحاب الامر کا عوام کے نزدیک قابل اعتماد ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ یہ مسئلہ متنازعہ فیہ ہے کہ خلیفہ و امام کا تقرر و انتخاب کیسے اور کیونکر ہو۔ اس ضمن میں شیعہ کا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ خانوادۂ نبوت کے سوا کوئی شخص امامت کے منصب پر فائز نہیں ہو سکتا۔ وہ کہتے ہیں کہ خلیفہ خدا کی جانب سے منصوص ہوتا ہے۔ کسی کو اس کے مقرر کرنے کا حق حاصل نہیں۔ اس لئے انتخاب امام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شیعہ کا فرقہ زیدیہ انتخاب کے اصول کو صحیح مانتا ہے۔ مگر ان کے نزدیک بھی امامت و خلافت کے حقدار صرف خاندان نبوت کے افراد ہیں۔ خوارج کی رائے میں ہر صالح اور نیک چلن آدمی خلافت کا اہل ہے۔ البتہ کسی معقول وجہ کے بغیر خلیفہ و امام کو معزول کرنا درست نہیں۔ معتزلہ کے نزدیک خلافت و امامت کیلئے سرے سے کوئی قید ہی نہیں۔ ہر شخص اس منصب کا اہل ہے۔ اہل سنت کے نزدیک خلیفہ کا قریشی یا کسی اور خاندان سے

Marfat.com

ہونا شرط نہیں۔ لیکن خلافت کی اہلیت کیلئے علم و اجتہاد اعلیٰ سیرت و کردار، عقل و دانش، بیدار مغزی اور فنون حرب و ضرب میں مہارت لازمی شرائط ہیں۔ اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ خلیفہ کے طریق تقرر و انتخاب کے باوجود مسلمانوں کے تمام فرقے اس مسئلہ میں متفق ہیں کہ اسلامی ریاست کے اصحاب الامر کا قابل ہونا ضروری ہے۔

۳۔ شوریٰ اسلامی جمہوریت کی تیسری بنیاد شوریٰ ہے۔ شوریٰ کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے یہ قابل اعتماد افراد امور سلطنت کو خداوندی احکام کے مطابق مسلمانوں کے مشورہ کی روشنی میں طے کریں۔ مشورہ اس قدر ضروری چیز ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مشورہ کا حکم دیا گیا ہے۔

قرآن میں فرمایا:۔

"وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ" (آل عمران۔ ۱۵۹) اور ان سے معاملات میں مشورہ کیجئے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

"مَا رَأَيْتُ اَحَدًا اَكْثَرَ مَشْوَرَةً لِاَصْحَابِهِ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ" (بخاری و ترمذی)

میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کسی کو اپنے اصحاب سے مشورہ کرنے والا نہیں پایا۔

اللہ تعالیٰ اصحاب الامر کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ" (الشوریٰ۔ ۳۸) اور وہ اپنے امور مشورہ کی روشنی میں طے کرتے ہیں۔

مشہور محدث خطیب بغدادی حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔

"میں نے عرض کیا یا رسول اللہ آپؐ کے بعد کوئی معاملہ ایسا پیش آجائے جس کے متعلق نہ قرآن میں کچھ اترا ہو اور نہ آپؐ سے کوئی بات سنی گئی ہو تو ہم کیا کریں؟ آپؐ نے فرمایا میری امت میں سے عبادت گزار اور اطاعت شعار لوگوں کو جمع کرو اور آپس

Marfat.com

میں مشورہ کرو اور کسی ایک شخص کی رائے کے مطابق فیصلہ نہ کرو۔" (تفسیر روح المعانی)

ایک دوسری حدیث میں اسلامی معاشرہ کی منظر کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

"اِذَا کَانَ اُمَرَاءُکُمْ خِیَارَکُمْ	جب تمہارے حاکم تم میں سے بہترین
وَاَغْنِیَاءُکُمْ سُمَحَاءَکُمْ	لوگ ہوں اور تمہارے دولت مند
وَاَمْرُکُمْ شُوْرٰی بَیْنَکُمْ	سخاوت پیشہ ہوں اور تمہارے معاملات
فَظَهْرُ الْاَرْضِ خَیْرٌ لَّکُمْ	مشورہ سے طے ہوتے ہوں تو زمین
مِنْ بَطْنِهَا"	کی سطح تمہارے لئے اس کے پیٹ سے
(ترمذی)	بہتر ہے۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب تک مسلمانوں میں مشورہ کی عادت باقی رہے گی تو ان میں شوریٰ اور جمہوریت کی روح زندہ رہے گی اور وہ ایک عظیم قوم کی حیثیت سے دنیا میں کامرانی اور شادکامی کی زندگی بسر کریں گے۔ جب مشورہ نہیں ہوگا تو لوگوں میں خود پسندی اور خودسری پیدا ہو جائے گی جس سے طرح طرح کے تنازعات سر نکالنے لگیں گے اور اس کا انجام اختلاف و شقاق کی صورت میں ظہور پذیر ہوگا۔

علمائے قانون کا قول ہے کہ شوریٰ اسلامی نظام کی ضرورت اور اس کا جزو لاینفک ہے۔ چھٹی صدی ہجری کے مشہور ماہر قانون عبدالحق بن غالب بن عطیہ لکھتے ہیں۔

"اِنَّ الشُّوْرٰی مِنْ قَوَاعِدِ الشَّرِیْعَةِ وَعَزَائِمِ الْاَحْکَامِ	شوریٰ شریعت کے قواعد اور نہایت ضروری احکام میں سے ہے۔
(ربشانی۔ جلد اول)	

تمام اہم امور میں مشورہ لازمی چیز ہے۔ اسلام میں شوریٰ کی کوئی متعین صورت

نہیں ہے۔ ہر زمانہ کے حالات اور ضروریات کے مطابق اس کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ ارباب شوریٰ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اصحاب فہم و ادراک، دیندار، قابل اعتماد اور صاحب بصیرت و فراست ہوں۔ تمام اہم امور شوریٰ سے طے کئے جائیں۔ کوئی شخص من مانی کارروائی نہ کرے۔ مشورہ آزادانہ فضا میں ہو اور ہر طرح سے بے لاگ اور بے لوث ہو۔ اجتماعی کام جن لوگوں سے متعلق ہوں شوریٰ میں ان سب کو یا ان کے نمائندوں کو بلایا جائے۔ جب تک آزادی رائے اور بے لاگ اظہار خیال کی فضا پیدا نہ کی جائے شوریٰ کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ شوریٰ کی کوئی متعین صورت نہیں۔ اصل چیز آزادانہ اظہار خیال اور بے لاگ اظہار رائے ہے۔

۴۔ شہریوں کے حقوق و فرائض اسلامی ریاست کی چوتھی بنیاد یہ ہے کہ اس میں شہریوں کے حقوق و فرائض متعین ہیں۔ ان حقوق میں کوئی شخص مداخلت کرنے کا مجاز نہیں۔ یہ حقوق اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہیں ان میں کسی ردوبدل کا امکان نہیں۔ حکومت کے پاس جب تک شرعی دلیل موجود نہ ہو وہ کسی کے حقوق پر پابندی عائد نہیں کر سکتی۔ اگر ایسا کرے گی تو وہ عوام کے علاوہ خدا اور رسولؐ کے نزدیک بھی مجرم ٹھہرے گی۔ اسلامی شریعت میں ظالم حاکم بروز آخرت بدترین سزا پائے گا۔ اسلامی ریاست میں شہریوں کی دو قسمیں ہیں (۱) مسلم شہری (۲) غیر مسلم شہری۔

غیر مسلم شہریوں کو اسلامی ریاست میں تمام بنیادی انسانی حقوق حاصل ہیں انہیں کامل مذہبی اور ثقافتی آزادی حاصل ہے۔ چونکہ اسلامی ریاست ایک نظریاتی اور اصولی ریاست ہے اس لئے غیر مسلم شہری اس کی کلیدی آسامیوں پر فائز ہونے کا حق نہیں رکھتے۔ اسی بنا پر مسلمانوں کی نسبت ان کی ذمہ داریاں کم ہیں۔ یہاں تک کہ انہیں فوجی خدمت سے بھی مستثنیٰ رکھا گیا ہے۔

سوال نمبر ۹۔ اسلامی ریاست کے شہریوں کے حقوق کی تفصیل بیان کیجئے۔

Marfat.com

جواب :۔ شہری سے مراد وہ انسان ہے جو بخوشی خاطر کسی معاشرہ، ریاست یا حکومت کے قانون و دستور کو قبول کر کے اس کی رکنیت اختیار کرے اور اس کے نصب العین کو صحیح مانے۔

شہریوں کے حقوق کا تحفظ ایسا شخص گاؤں میں رہتا ہو قصبہ میں یا کسی شہر میں اس ریاست کا شہری کہلائے گا۔ شہری ہونے کی حیثیت سے مسلم و غیر مسلم سب برابر ہیں۔ جو غیر مسلم اسلامی ریاست کے زیر سایہ بود و باش رکھتے ہوں ان کو ذمّی کہتے ہیں۔ سب لوگ ریاست کے وفادار اور اطاعت شعار ہونے کی صورت میں ریاست کی حدود کے اندر سکونت پذیر ہوں گے۔ ریاست و حکومت ان کی معاشی و سیاسی اور مذہبی ضروریات کی کفیل ہوگی۔ ان کی حفاظت کا اہتمام کرے گی اور یہ اس کے صلہ میں حکومت کو مالی واجبات ادا کریں گے۔

دینِ اسلام نے شہری (مسلم ہو یا غیر مسلم) کے حقوق کا کامل تحفظ کیا ہے۔ دینی احکام کی دو بڑی قسمیں ہیں۔ (۱) حقوق اللہ (۲) حقوق العباد

چونکہ اسلام امن اور سلامتی کا پیامبر ہے لہٰذا اس نے حقوق العباد پر بڑا زور دیا ہے۔ حدیث میں آیا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قیامت کے دن سب سے پہلے حقوق العباد کا محاسبہ کیا جائے گا۔" اسلام نے بنی نوع انسان کے ہر طبقہ کے لئے حقوق مقرر کیے ہیں۔ اس میں شہری کے حقوق بھی شامل ہیں۔ شہری کا مفہوم وسیع ہے۔ اسے مسلم شہری میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام کا دامن غیر مسلموں کے لئے ہمیشہ کشادہ رہا ہے قرآن میں فرمایا۔

"وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ" (مائدہ - ۲)	کسی قوم کی عداوت تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل و انصاف نہ کرو، انصاف کرو کیونکہ یہ تقویٰ کے بہت قریب ہے۔

اس آیت میں ہر فرد بشر کو عدل و انصاف کا حکم دیا گیا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کا تعلق کسی مذہب و ملت سے ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے۔

"تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔" (مستدرک حاکم)

یہ حدیث رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رحمت کو کتنی عمومیت کے ساتھ ظاہر کرتی ہے۔ ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا۔

"جو مسلمان کوئی درخت لگائے گا اس سے جو انسان یا پرندہ کچھ کھائے گا اس کا ثواب درخت لگانے والے کو ملے گا۔" (صحیح بخاری)

اس فیض کے عموم میں انسان کے علاوہ چرند پرند کو بھی داخل کر دیا۔ ایک اور حدیث میں فرمایا۔

"تم اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرو جو اپنے لئے چاہتے ہو۔"

بھائی کے لفظ سے مسلمان بھی مراد لیا جا سکتا ہے اور عام انسان بھی۔

صدقہ و خیرات میں مسلم فقراء و مساکین کو ترجیح دینا ایک فطری چیز ہے۔ تاہم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں غیر مسلم مسکینوں کے حقوق کا بھی خیال رکھا۔ قاضی ابو یوسفؒ نے کتاب الخراج میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ ایک غیر مسلم بوڑھا جو اندھا بھی تھا ایک دروازہ پر کھڑا بھیک مانگ رہا ہے۔ حضرت عمرؓ نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ مارا اور پوچھا کہ تم کو بھیک مانگنے کی ضرورت کیا پڑی؟ اس نے کہا کہ جزیہ کی ادائیگی اور بڑھاپے کی وجہ سے بھیک مانگتا ہوں۔ حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لائے اور اپنے گھر سے اسے کچھ دیا۔ پھر اس کو بیت المال کے خزانچی کے پاس بھیجا اور حکم دیا کہ ایسے آدمیوں کی تلاش کرو۔ خدا کی قسم ہم انصاف نہیں کریں گے اگر ہم اس کی جوانی کی کمائی تو کھائیں اور بڑھاپے میں اس کی مدد نہ کریں۔

یہ مشہور مسئلہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے عام صدقے غیر مسلموں کو دیئے

جاسکتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا۔ امّ المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو تیس ہزار درہم کی مالیت کا صدقہ دیا۔ امام مجاہد کہتے ہیں کہ مشرک رشتہ دار کا قرض معاف کر دینا ثواب کا کام ہے۔ ابن جریج محدث فرماتے ہیں کہ قیدی کو کھانا کھلانا کارِ ثواب ہے۔ ظاہر ہے کہ صحابہ کے قبضہ میں مشرک ہی قید ہو کر آتے تھے۔ آنحضرتؐ کے زمانہ میں حضرت عمرؓ نے اپنے مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا (صحیح مسلم) ۔ روایات میں آیا ہے کہ صحابہ جب مذہبی اختلاف کی بناء پر غریب مشرکوں کی مدد سے دست کش ہو گئے تو یہ آیت اتری۔

"ان کو ہدایت دینا تیرے اختیار کی بات نہیں لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے راہ پہ لے آتا ہے اور جو مال تم خرچ کرو گے اس کا فائدہ تمہیں پہنچے گا"۔ (سورۃ بقرہ۔۲۷)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک پورا مومن نہیں ہوگا جب تک وہ اور لوگوں کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے (مسند احمد جلد ۳ صـ۲۷۲)۔

اس حدیث میں انسانی محبت کی وسعت کو ساری انسانی برادری تک وسیع کر دیا گیا ہے۔ اسلامی ریاست کے شہریوں کو یہ حقوق حاصل ہیں۔

۱۔ جان و مال اور آبرو کی حفاظت ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ اپنے شہریوں کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کرے۔ نہ خود ان کی عصمت و آبرو پر ڈاکہ ڈالے نہ دوسروں کو اس امر کی اجازت دے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"فَذٰلِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِي لَهٗ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَلَا تُخْفِرُوا اللّٰهَ فِي ذِمَّتِهٖ" (صحیح بخاری)

یہی وہ مسلم ہے جس کی حفاظت کا ذمہ اللہ اور رسول نے لیا ہے۔ تم اللہ کی ذمہ داری میں خیانت نہ کرو۔

آپؐ نے فرمایا۔

Marfat.com

"كُلُّ الْمُسْلِمِ عَلَى الْمُسْلِمِ حَرَامٌ — ایک مسلم کی ہر چیز دوسرے پر حرام ہے
دَمُهُ وَمَالُهُ وَعِرْضُهُ" (صحیح مسلم) — اس کا خون، اس کا مال اور اسکی آبرو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غیر مسلم شہریوں کے بارے میں فرمایا۔

"جو کوئی ہمارا ذمی ہو اس کا خون ہمارے خون کی طرح اور اس کی دیت ہماری دیت کی طرح اور اس کا مال ہمارے مال کی طرح ہے"۔

حکومت تمام شہریوں کی ذاتی ملکیت کے تحفظ کی ذمہ دار ہے۔ قاضی ابو یوسفؒ فرماتے ہیں:۔

"وَلَيْسَ لِلْإِمَامِ أَنْ يُخْرِجَ شَيْئًا — امام کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کسی ثابت
مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِحَقٍّ ثَابِتٍ — قانونی حق کے بغیر کسی شخص کے قبضہ سے
مَعْرُوفٍ" (کتاب الخراج ص۶۳) — اس کی کوئی چیز نکالے۔

۲۔ **شخصی آزادی** اسلامی ریاست میں ہر شخص کو کامل آزادی حاصل ہے البتہ اسلامی حکومت کسی کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنی آزادی کو دوسروں کی آزادی سلب کرنے کے لئے استعمال کرے۔ یا حکومت کے مفاد کو نقصان پہنچائے۔ یا اس کو کسی خطرہ میں ڈالنے کی کوشش کرے۔ اگر کوئی شخص ایسا کرے گا تو حکومت اس میں مداخلت کر کے اس کو روک دے گی۔

ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ میں ایک شخص نے اپنے ہمسایوں کے بارے میں پوچھا جو شبہ کی بنا پر گرفتار کر لئے گئے تھے۔ آپؐ دو مرتبہ سوال سن کر خاموش رہے تاکہ اگر گرفتاری کی کوئی معقول وجہ ہو تو معلوم ہو جائے۔ اور جب اس ضمن میں کچھ بھی معلوم نہ ہوا تو آپؐ نے فرمایا۔

"خَلُّوا لَهُ جِيرَانَهُ" (ابو داؤد) — اس کے ہمسایوں کو رہا کر دو۔

اسلام کا اصول ہے کہ

"لَا يُؤْسَرُ رَجُلٌ فِي الْإِسْلَامِ — عدل وانصاف کے تقاضوں کے بغیر اسلام

Marfat.com

پیغمبر عدل " (موطا امام مالک) میں کسی کو قید نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ آزادی رائے ہر شخص کو کامل آزادی حاصل ہے کہ جو نسا مذہب چاہے اختیار کر لے۔ دین اسلام اسلامی ریاست میں رہنے والوں کو پوری آزادی رائے دیتا ہے اس ضمن میں قرآن کریم نے بڑا بے لاگ فیصلہ کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"لا اکراہ فی الدین" (البقرہ ۲۵۶) دین میں جبر نہیں۔

اسلامی ریاست اپنی غیر مسلم رعایا کو تبدیلی مذہب پہ مجبور نہیں کرتی۔ تاریخ اسلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم سلاطین اس ضمن میں بڑے کشادہ دل واقع ہوئے۔

عباسی خلافت کے زریں دور میں غیر مسلم بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ کبھی ان سے مذہب تبدیل کرنے کے لئے نہ کہا گیا۔ متحدہ ہندوستان میں یکے بعد دیگرے متعدد مسلمان خاندان وارث تخت و تاج ہوتے اگر وہ چاہتے تو سرزمین ہند کے طول و عرض میں کسی غیر مسلم کو زندہ نہ چھوڑتے۔ مگر انہوں نے اس کے برخلاف وسیع النظری اور عالی ظرفی سے کام لیتے ہوئے غیر مسلموں سے رواداری برتی اور ان کو حکومت کی کلیدی آسامیوں پہ فائز کیا۔

جس طرح ایک غیر مسلم کو اسلامی ریاست میں کامل مذہبی آزادی حاصل ہوتی ہے اسی طرح مسلمانوں کو اس بات کی کھلی اجازت ہے کہ مختلف فقہی مسالک مثلاً حنفی، شافعی، مالکی یا حنبلی میں سے جو نسا طرز فکر چاہیں اختیار کریں یا براہ راست کتاب و سنت کی پیروی کریں اور کسی فقہی مکتب خیال کی تقلید کو اپنے لئے ضروری نہ سمجھیں جس طرح آئمہ اربعہ کے ظہور سے قبل لوگ براہ راست قرآن و حدیث کا اتباع کرتے تھے اسلامی ریاست کو یہ حق حاصل نہیں کہ لوگوں کو کسی خاص مکتب خیال کی پیروی پہ مجبور کرے۔ خلیفہ منصور و ہارون نے جب مالکی فقہ کو بزور ملک میں رائج کرنا چاہا تو امام مالک نے یہ کہہ کر اس سے باز رکھا کہ علماء کا (فرعی) اختلاف اس امت کے لیے رحمت الٰہی

Marfat.com

ہے۔ البتہ اسلامی ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اندرونِ ملک کفر و الحاد کی ترویج و اشاعت کو روک دے اور ملک میں ایسے افکار و نظریات کو پھلنے پھولنے نہ دے جو اسلام کے بنیادی افکار و معتقدات سے متصادم ہوں۔

ریاست کا ہر شہری اس امر میں آزاد ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مذہبی روایات کے مطابق عبادت کر سکے اس کے ساتھ ساتھ عبادت گاہوں کا تحفظ اور ان کی تعمیر بھی حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔ مسلمان ہمیشہ یہود و نصاریٰ کے معابد کی حفاظت کرتے رہے ہیں اور انہوں نے کسی عبادت گاہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی حضرت علیؓ کے عہدِ خلافت میں خوارج نے فتنہ و فساد کا بازار گرم رکھا۔ وہ آپ کی خلافت کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔ تاہم آپ نے خوارج کو پیغام بھیجا تھا۔

"تم جہاں چاہو رہو۔ ہمارے اور تمہارے درمیان شرط یہ ہے کہ تم خون ریزی اور رہزنی اختیار نہ کرو اور ظلم سے باز رہو۔" (نیل الاوطار الشوکانی جلد ۷ ص ۱۳۹)

۴۔ **قانونی مساوات** ریاست کے ہر شہری کو قانونی مساوات حاصل ہونی چاہیئے۔ اسلامی ریاست کا قانون امیر و غریب مسلم و کافر عربی و عجمی سب کیلئے یکساں ہے۔ اس میں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں ہے قانونی مساوات کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ بلا معاوضہ ہو۔ مسلم سلاطین کی قانونی مساوات ضرب المثل کی حد تک مشہور ہے۔ حضرت علیؓ کے عہد خلافت کا واقعہ ہے کہ آپ کی زرہ گم ہو گئی۔ زرہ کچھ مدت کے بعد ایک یہودی کے پاس دیکھی گئی۔ مقدمہ عدالت میں پہنچا اور حضرت علیؓ بذاتِ خود فریق مقدمہ کی حیثیت سے عدالت میں تشریف لائے۔ آپ کے پاس چونکہ گواہ نہ تھا اس لئے قاضی نے یہودی کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ آپ نے قطعاً برا نہ مانا۔ یہودی کو معلوم تھا کہ یہ زرہ حضرت علیؓ کی ہے لیکن قانونی ثبوت مہیا نہ ہونے کی وجہ سے آپ کو نہ مل سکی۔ وہ اسلامی انصاف کا یہ عالم دیکھ کر ایمان لے آیا۔

Marfat.com

۵۔ معاشرتی مساوات اسلامی ریاست کے باشندوں کو کامل معاشرتی مساوات حاصل ہے۔ اس میں نام و نسب، رنگ و نسل، برادری یا خاندان، پیشہ و صنعت یا مقام سکونت کی بناء پر کوئی شخص صاحب عزت یا ذلیل نہیں سمجھا جاتا۔ عزت و فضیلت کا معیار و مدار تقویٰ پر ہے۔ یہاں ادنیٰ و اعلیٰ کی کوئی تمیز نہیں۔ سب یکساں سلوک کے حقدار اور یکساں حقوق و فرائض رکھتے ہیں۔

۶۔ بے لوث اور بلا عوض عدل و انصاف اسلامی ریاست ہر شہری کو ظلم و تعدی سے بچانے اور بلا معاوضہ عدل و انصاف مہیا کرنے کی ذمہ دار ہے۔ عدل و انصاف مہیا کرنا حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔ رعایا سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا۔

۷۔ حق تنقید و محاسبہ اسلامی ریاست کے ہر شہری کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ حکومت پر تعمیری تنقید کر سکے۔ ہر شخص حکومت کو مشورہ دے سکتا ہے اور ہر بات پر ٹوک سکتا ہے۔ خلافت راشدہ کے دوران عوام برملا خلفاء پر تنقید کرتے تھے۔ خلفاء نہ صرف اسے گوارا کرتے تھے بلکہ اس پر خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ اسلامی ریاست میں ہر مظلوم کو فریاد خواہی کا حق حاصل ہے۔ ہر شخص اپنے مسائل اور مشکلات افسران بالا کے سامنے پیش کرنے کا حق رکھتا ہے۔

۸۔ اجتماع و تنظیم اور نقل و حرکت کی آزادی اسلامی ریاست اپنے شہریوں کے حق اجتماع، حق تنظیم اور نقل و حرکت کی آزادی کو تسلیم کرتی ہے۔ وہ جہاں چاہیں اندرون ملک آ جا سکتے ہیں اس ضمن میں حکومت کی جانب سے ان پر کوئی پابندی نہیں۔

سوال نمبر ۹۵:۔ اسلامی ریاست میں شہریوں کے فرائض اور ذمہ داریوں کی تفصیل بیان کیجئے۔

جواب:۔ اسلامی ریاست کے شہریوں پر یہ فرائض عائد ہوتے ہیں۔

Marfat.com

۱۔ حکومت کی اطاعت | ایک شہری کا فرض ہے کہ وہ حکومت کی مکمل اطاعت کرے۔ ملک کا وفادار ہو اور اس کی ترقی و بہبود میں کوشاں رہے۔ قرآن کریم میں مسلم حکام کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اِسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَلَوْ اُمِّرَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ حَبَشِیٌّ۔ (ابن ماجہ) — تمہارا حاکم ایک حبشی غلام بھی ہو تو اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو

ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ حکومت کی ہر صحیح بات پر عمل کرے۔ البتہ خلاف شرع احکام کی اطاعت ضروری نہیں۔ آپ نے فرمایا۔

لَا طَاعَۃَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَۃِ الْخَالِقِ۔ — خدا کی نافرمانی والے کام میں کسی کی اطاعت درست نہیں۔

۲۔ قانون کا احترام | قانون کا احترام بھی ایک شہری کے لئے ازبس ضروری ہے اگر سب لوگ قانون شکنی پر اتر آئیں تو ملک میں ابتری پھیل جائے۔ ہر اچھا شہری قانون کا احترام کرتا اور قانون شکنی کو جرم خیال کرتا ہے۔

۳۔ واجبات کی ادائیگی | انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لئے حکومت بہت سے مصارف برداشت کرتی ہے۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لئے رعایا سے ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اس لئے رعایا کا فرض ہے کہ حکومت کے واجبات بخوشی ادا کرے۔

۴۔ حکومت سے تعاون | ہر شہری کا فرض ہے کہ حکومت سے تعاون کرے۔ قرآن کریم میں اسے فرض قرار دیا گیا ہے۔

۵۔ ایثار و قربانی | اگر ضرورت کا تقاضا ہو اور حکومت مال و جان کی قربانی کا مطالبہ کرے۔ تو اسلامی ریاست کے شہریوں کا فرض ہے کہ کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کریں۔ جب حکومت جہاد کے لئے پکارے تو اس کی پکار پر لبیک کہا جائے البتہ غیر مسلم شہریوں سے جبراً فوجی خدمت نہیں لی جا سکتی۔ اگر وہ بخوشی ایسا کریں تو

Marfat.com

چاہیں تو کر سکتے ہیں۔

۶۔ تعمیری تنقید: حکومت سے خیر خواہی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ حکومت کے شہری امورِ ریاست پر نگاہ رکھیں اور حکومت کو صراطِ مستقیم سے منحرف نہ ہونے دیں۔ اگر وہ کسی وقت اسلام کی راہ سے برگشتہ ہو رہی ہو تو ہاتھ اور زبان سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں۔

اسلام، اشتراکیت اور جمہوریت

سوال نمبر ۹۶:۔ اسلام کے سیاسی نظام اور اشتراکیت کا فرق واضح کیجئے؟

جواب:۔ مندرجہ ذیل امور اسلام کے سیاسی نظام اور اشتراکیت کے مابین وجہ امتیاز ہیں۔

۱۔ دینِ اسلام ایک کامل نظامِ حیات ہونے کی حیثیت سے زندگی کے تمام شعبوں کے لئے ہدایات دیتا ہے۔ انسانی زندگی کے تمام شعبے خواہ وہ معاشی ہوں یا معاشرتی عمرانی ہوں یا سیاسی دینی حدود میں داخل ہیں۔ سیاست انسانی زندگی کا اہم جزو ہے اور اس لئے اسلام میں داخل ہے۔ اسلامی نظامِ حکومت دین کے زیرِ اثر ہوتا ہے اور خدا کے قانون کو نافذ کرتا ہے۔ جو سیاست دینی تصورات برمبنی نہ ہو وہ سیاست نہیں چنگیزی اور فرعونیت ہے اس کے عین برخلاف اشتراکیت کی بنیاد ہی لادینی تصورات اور مذہب کی نفی پر رکھی گئی ہے۔ اس لئے وہ اپنے مزاج اور فطرت کے اعتبار سے ایک لادینی نظام ہے۔ اس لئے ان دونوں کے درمیان اساسی و اصولی فرق و امتیاز پایا جاتا ہے اور دونوں کے راستے آغازِ کار ہی سے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔

۲۔ اشتراکیت کی نگاہ میں فرد کی حیثیت صرف یہ ہے کہ وہ معاشرہ کی ایک اکائی ہے معاشرہ میں منظم ہو کر فرد اپنی حیثیت کو کھو بیٹھتا ہے۔ اور جماعت سے الگ ہو کر اس کی کوئی جداگانہ اور مستقل شخصیت باقی نہیں رہتی۔ ریاست کے سیاہ و سفید کا مالک ایک خاص طبقہ ہوتا ہے۔ اشتراکیت طبقاتی کشمکش کی قائل ہے۔ اس کے برخلاف اسلام طبقاتی تقسیم کا قائل نہیں۔ اس کے یہاں کوئی خاص طبقہ حکمران نہیں ہوتا سب انسان مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ معاشرہ سے الگ بھی فرد اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام فرد کی ایک ذاتی حیثیت کو مانتا ہے اور اس کی اہلیت و صلاحیت کو اجاگر کرنے کے لئے مواقع فراہم کرتا ہے۔

۳۔ اسلامی نظامِ حکومت ایک شورائی اور جمہوری نظام ہے۔ اس میں تمام معاملات باہم مشورہ سے طے پاتے ہیں۔ ہر کام لوگوں کی رضامندی سے کیا جاتا ہے خلیفہ وامام خدا اور لوگوں کے سامنے جواب دِہ ہوتا ہے۔ رعایا اس پر تعمیری تنقید کر سکتی ہے۔ اصحاب الامر تنقید و محاسبہ سے بالا نہیں ہوتے۔ اس کے برخلاف اشتراکیت کا نظام آمرانہ (ڈکٹیٹرانہ) ہے۔ اس نظام میں عوام کی رائے کو کوئی وقعت نہیں دی جاتی۔ یہ نظام ایک طبقے ایک پارٹی اور پھر اس پارٹی میں سے بھی چند ہوشیار قسم کے لوگوں کی آمریت کا قائل ہے۔

۴۔ اشتراکی نظامِ حکومت میں ریاست کو غیر محدود اختیار حاصل ہوتے ہیں۔ اس میں شخصی اور سیاسی آزادی کی کوئی ضمانت نہیں دی جاتی۔ جس شخص پر جیسی پابندی چاہی بلا وجہ عائد کر دی۔ جس کو چاہا روپیہ پیسہ اور ذاتی جائداد سے محروم کر دیا۔ مگر اسلام ریاست کو مطلق العنان نہیں چھوڑتا بلکہ اس کے اختیارات کو محدود کر دیتا ہے۔ اسلام کسی کی آزادی میں دخل انداز نہیں ہوتا۔ حاکم کی اطاعت اس وقت تک فرض ہے جب تک وہ احکام خداوندی کا مطیع ہے۔ اگر حاکم کسی خلافِ شرع بات کا حکم دے تو اس کی اطاعت ضروری نہیں۔ اسلامی حکومت خدا اور عوام کے سامنے جواب دِہ ہے۔ وہ شوریٰ کے مشورہ کی

Marfat.com

پابند ہے۔ اسلام شخصی اور سیاسی آزادی کی پوری ضمانت دیتا ہے۔ اسلامی ریاست ہمہ گیر ہونے کے باوصف کلیت پسند (TOTALITARIAN) اور تنقید و محاسبہ سے بالا نہیں بلکہ عوام اس سے محاسبہ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔

سوال نمبر ۹۷:۔ اسلامی ریاست اور مغربی جمہوریت کا فرق دلائل سے واضح کیجئے۔

جواب:۔ اسلام اس بات کے قطعاً خلاف نہیں کہ حکومت کے معاملات عوام کی رائے سے طے ہونے چاہئیں اور امورِ سلطنت کو عوام کے نمائندوں کی مرضی کے مطابق انجام دینا چاہیئے بلکہ وہ اس ضمن میں نام نہاد جمہوریت نواز طبقہ سے بہت آگے ہے جو بزعم خویش بڑے جمہوریت پسند ہیں، مگر عملاً وہ آمرانہ نظام ہی کو اپنائے ہوئے ہیں۔ اسلام جمہوریت کے اس پہلو کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ کوئی شخص بنیادی حقوق سے محروم نہ رہے اور ہر شخص کو حکومت کی جانب سے بنیادی حقوق کی ضمانت حاصل ہو۔ اسی طرح عوام کی مرضی کو معلوم کرنے اور اس کو موثر بنانے کے لئے جو تجربات کئے گئے ہیں اسلام اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ بلکہ ان سے استفادہ کرتا اور انہیں اپنے حالات اور تقاضوں سے ہم رنگ اور ہم آہنگ بناتا ہے ان امور میں اسلام جمہوریت کا ہمنوا ہے اور اس ضمن میں دونوں کے درمیان کچھ اختلاف نہیں پایا جاتا۔ جن امور میں اسلام اور مغربی جمہوریت کی راہیں الگ ہو جاتی ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اسلام میں حاکمیتِ اعلیٰ (SOVERIEGNTY) کا منصب ذاتِ خداوندی کے ساتھ مختص ہے۔ انسان اس کائناتِ ارضی پر خدا کا خلیفہ ہے۔ اس کا کام قانون بنانا نہیں بلکہ خدا کے بنائے ہوئے قانون کو چلانا ہے۔ انسان اس قانون میں سر مو تبدیلی کرنے کا مجاز نہیں۔ اسلامی قانون کا مصدر و ماخذ کتاب و سنت ہیں۔ اصحاب الامر اس قانون کے تحت معاملات کو طے کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ جن امور کے بارے

Marfat.com

میں کتاب وسنت خاموش ہوں اور نفی واثبات کی صورت میں بھی ان کا کوئی ذکر نہ ہو تو عوام کے نمائندوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اسلام کی روح اور اسلامی تعلیمات کے پیش نظر کوئی قانون بنائیں۔ عوام کے نمائندے یہ حق رکھتے ہیں کہ کتاب وسنت میں جن امور پر صرف اجمالی واصولی روشنی ڈالی گئی ہو اور تفصیلی بحث نہ کی گئی ہو ان کی تشریح وتوضیح کریں۔ اسلامی حکومت کے پاس ایک تیار شدہ ضابطہ ہے جس کی روشنی میں سب معاملات طے کئے جاتے ہیں۔ اس لئے اس کے اختیارات بڑی حد تک محدود ہیں۔

اس کے برخلاف مغربی جمہوریت میں انسان حاکمیت اعلیٰ پر قابض ہوتے ہیں۔ یہ اختیارات عوام کے نمائندے استعمال کرتے ہیں۔ یہ نمائندے قانون بھی بنا لیتے ہیں وہ کثرت رائے سے ہر قسم کا قانون بنا سکتے ہیں۔ غرض یہ کہ مغربی جمہوریت کا مدار و انحصار تمام تر عوامی نمائندوں پر ہوتا ہے اور انہیں وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ مغربی جمہوریت میں پارٹی بازی اور کشمکش کا بازار گرم رہتا ہے۔ الیکشن سے پہلے جوڑ توڑ جھگڑے فساد اور ہنگامے برپا ہوتے ہیں۔ الیکشن کے بعد بھی اس کے اثرات باقی رہتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں بغض وعداوت اور شکوک وشبہات کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ اسلامی جمہوریت کا دامن اس قسم کے تنازعات سے پاک ہے۔ اسلام یہ تعلیم دیتا ہے کہ نیک کاموں میں تعاون کیا جائے، برائی میں کسی سے تعاون نہ ہو۔ قرآن کریم میں فرمایا:

"وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ	نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون
وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ	کرو۔ اور برائی اور گناہ میں ہرگز
وَالْعُدْوَانِ" (المائدہ۔ ۲)	تعاون نہ کرو

اسلام تمام افراد و عناصر کے درمیان الفت و محبت اور تعاون و ہمدردی کی

فضا قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ نظام مغربی جمہوریت سے بہتر ہے
۳۔ اسلامی جمہوریت میں اقتدار کے بھوکوں اور لالچی لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ اسلام ان لوگوں کو عہدے نہیں دینا چاہتا جو ان کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہوں۔ اسلامی نقطہ نگاہ کے مطابق عہدوں کے اہل وہ لوگ ہیں جو ان کی طمع نہ رکھتے ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"خدا کی قسم ہم کسی ایسے شخص کو اپنی حکومت کے کسی عہدہ پر مقرر نہیں کرتے جس نے اس کی درخواست کی ہو یا جو اس کا حریص ہو" (بخاری و مسلم)

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہوا۔

"ہمارے نزدیک تم میں سب سے بڑا خائن وہ ہے جو خود اس حکومت کے کسی عہدہ و منصب کا طالب ہو" (ابوداؤد)

اس طرح اسلام ایک اخلاقی ماحول پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے عہدہ داروں میں چند اخلاقی صفات کے پائے جانے کو ضروری قرار دیا ہے جب تک وہ اعلیٰ اخلاقی صفات موجود نہ ہوں ان کو اعلیٰ عہدوں پر فائز نہیں کیا جا سکتا۔ مغربی جمہوریت ان سب باتوں سے بے نیاز ہے۔ اس کے یہاں اس قسم کی کوئی پابندی نہیں وہاں ہر غرض پرست اور اقتدار کا بھوکا جو سیاسی ہتھکنڈوں سے الیکشن جیت سکے عوام کا نمائندہ بن سکتا ہے۔

۴۔ مغربی جمہوریت وطنی قومی اور جغرافیائی حد بندیوں میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کے نتیجہ میں ہر جگہ بغض و عداوت اور نفرت و حقارت کے مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں۔ حسب و نسب، نسل و رنگ اور قوم و وطن کے اختلافات نے دنیا کے امن و سکون کو غارت کر دیا ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی ریاست ایک اصولی اور نظریاتی ریاست ہے جس کا پیغام پوری انسانیت کے لئے ہے اور کسی قوم و ملک تک محدود نہیں۔

Marfat.com

اسلامی ریاست قوم و وطن اور رنگ و نسل کی حد بندیوں سے آزاد ہے۔ اس کے نزدیک سب کائنات ایک ملک اور پوری انسانیت ایک قوم ہے۔

فلاحی ریاست

سوال نمبر ۹۸ :۔ فلاحی ریاست سے کیا مراد ہے ؟ دلائل سے ثابت کیجیے کہ اسلامی ریاست فلاحی ریاست ہے۔

جواب :۔ اسلامی ریاست کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ ایک فلاحی ریاست (WELFARE STATE) ہے۔ فلاحی ریاست ایک قسم کی خادمِ خلق ریاست ہوتی ہے۔ جس کا مقصد صرف لوگوں سے ٹیکس وصول کرنا ملک میں امن و امان قائم کرنا اور ملکی دفاع ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کی ذمہ داری لوگوں کی دنیوی و اخروی فلاح و بہبود بھی ہوتی ہے۔ فلاحی ریاست طبقاتی اونچ نیچ کو دور کر کے لوگوں میں انسانی مساوات کی روح پیدا کرتی اور ان مشکلات کا ازالہ کرتی ہے جو سعی و جہد کی مساوات میں مخل ہوتی ہیں۔ یہ ریاست مسلم و غیر مسلم شہریوں کی تمام ضروریاتِ زندگی کی کفیل ہوتی ہے۔ اگر اسلامی ریاست کے کسی کونے میں بھی فقر و فاقہ غربت و افلاس یا ظلم و جبر کی کارفرمائی نظر آتی ہے تو فلاحی ریاست فی الفور اسے ختم کرنے کے درپے ہوتی ہے۔ یہ ریاست اپنی تمام تر مساعی انسانی مسائل کو حل کرنے کے لئے وقف کر دیتی ہے۔ اس ریاست کے پیشِ نظر صرف منفی تصورات ہی نہیں ہوتے بلکہ یہ مشکلات کو دور کرنے کے لئے مثبت طرزِ عمل اختیار کرتی ہے مندرجہ ذیل دلائل سے اس کا فلاحی ریاست ہونا ثابت ہوتا ہے۔

اسلام فقر و فاقہ کا ازالہ کرنا چاہتا ہے اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ مثبت

طریقوں سے افلاس و غربت کو حدودِ سلطنت سے مٹا دے۔ جس طرح دینِ حق کی تبلیغ و اشاعت کے ذریعہ کفر و الحاد کو سرنگوں کرنا اسلامی حکومت کا فرض ہے۔ اسی طرح افلاس و غربت کو حدودِ مملکت میں پہنچنے نہ دینا بھی حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔ مشہور مقولہ ہے کہ "فقر انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے" آپؐ دعا فرمایا کرتے تھے۔

"اے اللہ مجھے کفر اور فقر و فاقہ سے محفوظ رکھ"

اسلام اشتراکیت کے برخلاف انسان کو انفرادی ملکیت کا حق دیتا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کو اجازت دیتا ہے کہ ذاتی جہد و سعی اور حلال ذرائع سے وہ جس قدر دولت چاہے کمائے۔ مگر اس اجازت کے ساتھ اسلام نے یہ تصور بھی دیا ہے کہ مال انسان کے پاس خدا کی امانت ہے۔ جسے صرف جائز مصارف میں ہی خرچ کیا جا سکتا ہے۔ ناجائز کاموں میں خرچ کرنا اسراف ہے جس سے منع کیا گیا ہے فرد کو محدود اختیار دیا گیا ہے۔ اگر وہ ان حدود سے تجاوز کرے گا تو خدا کی دی ہوئی امانت میں خیانت کرنے والا ہوگا۔ ہر شخص کی دولت میں اس کے اپنے حق کے علاوہ خدا اور اس کے بندوں کا حق بھی ہے۔ ضروری ہے کہ ہر شخص اپنی جائز ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ ریاست اور دوسرے انسانوں کے حقوق کو بھی ادا کرے اور اپنے وسائل ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے صرف کرے۔ جو لوگ دولت جمع کرتے اور اسے انسانی فلاح و بہبود کے لئے خرچ نہیں کرتے نہ اس کو دوسروں کے حقوق نکالتے ہیں ان کو سخت سزا ملے گی۔ جب مال ایک خاص مقدار میں جمع ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہے۔ زکوٰۃ کا مال اغنیاء سے لے کر فقراء میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

"تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَاءِهِمْ فَتُرَدُّ عَلٰی فُقَرَاءِهِمْ" (بخاری و مسلم)

ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے محتاجوں میں تقسیم کی جائے گی۔

Marfat.com

اسلام میں زکوٰۃ کو ایک صدقہ نہیں بلکہ حق قرار دیا گیا ہے۔ قرآن میں فرمایا:۔

"وَفِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ" (الذاریات۔ ۱۹)

ان کے مالوں میں مدد مانگنے والوں اور رزق سے محروم رہ جانے والوں کا بھی حق ہے

حکومت زکوٰۃ وصول کر کے حقداروں میں تقسیم کر دیتی ہے۔

"خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً" (التوبۃ۔ ۱۰۳)

ان کے مالوں سے صدقہ وصول کیجئے

اسلامی ریاست میں جو لوگ معذور و مجبور ہوں اور کمانے کے قابل نہ ہوں اسلامی ریاست ان تمام افراد کی کفالت کرتی اور ان کے لئے ضروریات زندگی مہیا کرتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"مَنْ مَاتَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ وَلَمْ يَتْرُكْ وَفَاءً فَعَلَيَّ قَضَاؤُهُ وَمَنْ تَرَكَ مَالاً فَلِوَرَثَتِهِ" (ابوداؤد)

جو شخص قرض چھوڑ کر مرے اور ادا کرنے کے لئے اس نے مال نہ چھوڑا ہو تو اس کی ادائیگی میرے (اسلامی ریاست) ذمہ ہے اور جو شخص مال چھوڑ جاتے وہ اس کے وارثوں کے لئے ہے۔

"مَنْ تَرَكَ دَيْناً أَوْ ضَيَاعاً فَلْيَأْتِنِيْ فَأَنَا مَوْلَاهُ" (ابوداؤد)

جو شخص قرض چھوڑے یا چھوٹے چھوٹے یتیم بچے چھوڑ جاتے تو وہ میرے پاس آئے میں اس کا سرپرست ہوں۔

ایک اور موقعہ پر ارشاد فرمایا۔

"مَنْ تَرَكَ مَالاً فَلِوَرَثَتِهِ وَمَنْ تَرَكَ كَلًّا فَإِلَيْنَا" (بخاری و مسلم)

جو شخص مال چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں کے لئے ہے اور جو شخص بوجھ (قرض، یتیم بچے وغیرہ) چھوڑ جائے اس کے ذمہ دار ہم ہیں

ایک جلیل القدر صحابی بیان کرتے ہیں ۔

"خدا کی قسم اگر جوانی میں ہم نے اس سے فائدہ اٹھایا اور بڑھاپے میں اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تو ہم نے اس سے انصاف نہیں کیا ۔" (کتاب الخراج قاضی ابو یوسف ص۱۲۶)

یہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں جو آپ نے ایک بوڑھے ذمی کے حق میں فرمائے تھے ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر حکومت جوانی کی عمر میں اس سے جزیہ وصول کرتی رہی ہو اور بڑھاپے میں اس کی ضروریات کی کفیل نہ ہو تو یہ انصاف سے بہت بعید ہے ۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حیرہ کے غیر مسلموں سے جو معاہدہ کیا تھا اس میں صاف لکھا تھا کہ جو شخص بوڑھا ہو جائے یا آفت زدہ اور مفلس ہو اس سے جزیہ وصول کرنے کے بجائے مسلمانوں کے بیت المال سے اس کی اور اس کے کنبے کی کفالت کی جائے گی ۔ (کتاب الخراج ص۸۵)

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ تمام آیات و احادیث کا خلاصہ علماء کے اس قول کی صورت میں بیان کرتے ہیں ۔

"علماء نے کہا ہے کہ حکومت جس طرح اس شخص کی وارث ہوتی ہے جس کا کوئی وارث نہ ہو ۔ اسی طرح وہ اس شخص کا قرض ادا کرنے کی بھی ذمہ دار ہے ۔ جس نے مرتے وقت قرض کی ادائیگی کے لئے مال نہ چھوڑا ہو ۔ علاوہ ازیں وہ اس کے حین حیات اس کی کفالت کی ذمہ دار ہو گی جب کہ اس کا کوئی کفیل نہ ہو ۔"

(زاد المعاد جلد اول ص۵۷)

امام ابن حزم اندلسی فرماتے ہیں ۔

"ہر بستی کے امراء کا فرض ہے کہ وہ فقراء اور غرباء کی معاشی زندگی کے کفیل ہوں اور اگر بیت المال کی آمدنی سے ان غرباء کی معاشی کفالت پوری نہ ہوتی ہو تو خلیفہ وقت

امام ان ارباب دولت کو اس پر مجبور کر سکتا ہے۔ کم از کم اتنی بات ضروری ہے کہ ان کے لئے ضروریاتِ زندگی مہیا کی جائیں۔ مثلاً روٹی، پہننے کے کپڑے جو گرمی و سردی سے بچانے کے لئے کافی ہوں۔ رہنے کے لئے ایک مکان جو ان کو بارش، گرمی، دھوپ اور سیلاب جیسے حوادث سے محفوظ رکھ سکے۔" (محلیٰ ابن حزم)

امام ابنِ حزم حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی نقل کرتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے اغنیاء کے مال پر ان کے غریب بھائیوں کی ضروریات کو پورا کرنا فرض کر دیا ہے۔ اگر اہلِ ثروت کے حق ادا نہ کرنے کی وجہ سے وہاں کے لوگ بھوکے ننگے یا معاشی مصائب میں مبتلا ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ان سے قیامت کے روز اس کی باز پرس کرے گا اور انہیں اس کوتاہی کی سزا دے گا۔" (محلیٰ ابن حزم ص۱۵۷)

اسلامی ریاست کی یہ کفالت صرف علمی دلائل ہی سے ثابت نہیں بلکہ قرنِ اول کے مسلمانوں نے عملی طور پر بھی اس نظام کو قائم کیا اور دنیا کی اولین فلاحی اور خادم خلق ریاست کی تشکیل کی تھی۔ دورِ حاضر کے مشہور مورخ مولانا شبلی نعمانی رقمطراز ہیں۔

"اس بات کا سخت اہتمام کیا کہ ممالک محروسہ میں کوئی شخص فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہونے پائے۔ یہ عام حکم تھا اور اس کی ہمیشہ تعمیل ہوتی تھی کہ ملک میں جس قدر اپاہج، از کار رفتہ، مفلوج وغیرہ ہوں سب کی تنخواہیں بیت المال سے مقرر کر دی جائیں۔ لاکھوں سے زیادہ آدمی فوجی دفتر میں داخل تھے جن کو گھر بیٹھے خوراک ملتی تھی ایک آدمی کو مہینے بھر کی خوراک کے لئے دو جریب آٹا کافی ہوتا تھا۔ اس لئے ہر شخص کے لئے اسی قدر آٹا مقرر تھا۔ غرباء و مساکین کیلئے بلاتخصیص مذہب حکم تھا کہ بیت المال سے ان کی تنخواہ مقرر کر دی جائے۔"

وہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے غرباء و مساکین کی نگہداشت کا بے نظیر نظام قائم کیا۔ اس کے برخلاف سرمایہ دارانہ نظام حکومت میں ایسے لوگوں کی کفالت کی۔

Marfat.com

کوئی ضمانت نہیں۔ وہاں تو جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول رائج ہے۔ گرے پڑے اور نادار طبقہ کی حفاظت و نگہداشت کیلئے کوئی اہتمام نہیں کیا جاتا۔ معاشی دوڑ میں جو پیچھے رہ جاتے اس کے لئے کوئی سہارا نہیں۔ اس کے مقدر میں یہی لکھا ہے کہ وہ صفحۂ ہستی سے مٹ جاتے۔ فقراء و مساکین کیلئے وہاں سعی و جہد کا بھی کوئی امکان نہیں اس کا صاف نتیجہ یہ ہے کہ جو امیر ہے وہ سدا امیر رہے اور جو غریب ہو وہ ہمیشہ غربت کے چکر میں پھنسا رہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں نفع اندوزی اور ظلم و تعدی کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے جاتے ہیں۔ غیر مسادی معاشی جد وجہد کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک طرف سونے کی تجوریاں پڑی ہیں اور دوسری طرف لوگ نانِ جویں کو ترس رہے ہیں۔ اسلامی نظام حکومت ایک عادلانہ معاشی نظام پر عمل کرتی ہے۔ یہ نظام امیر و غریب سب کو پھلنے پھولنے کے مساوی مواقع مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ وسیع پیمانے پر گرتوں کو تھامتا اور معاشی طور پر پسماندہ لوگوں کو سہارا دیتا ہے۔

اسلامی نظام حکومت غریب طبقہ کی کفالت کی ضمانت بھی دیتا ہے۔ اور اس کے پہلو بہ پہلو اس کی آزادی اور انفرادیت کو بھی برقرار رکھتا ہے۔ لوگوں کو انفرادی ملکیت سے محروم کرنا اسلامی عدل و انصاف سے بعید ہے۔ اسلام مالکانہ حقوق اور سعی و جہد کی آزادی دینے کے بعد توازن اور انصاف کو قائم کرتا ہے۔ اس کے برخلاف اشتراکی نظام عوام کے لئے روٹی کپڑا مہیا کرتا ہے لیکن ان کو شخصی آزادی اور انفرادی ملکیت سے محروم کر دیتا ہے۔ موجودہ دور میں بعض ممالک فلاحی مملکت کے تصور کو اپنانے کے دعویدار ہیں۔ مگر ان میں اور اسلامی نظام حکومت میں بڑا فرق ہے۔ نہ فلاحی مملکت ہونے کے مدعی ممالک عوام کی جو خدمت کرتے ہیں وہ ان کی سیاسی بیداری اور مطالبات کی شدت سے مجبور ہو کر کرتے ہیں۔ برسر اقتدار

Marfat.com

پارٹی اپنے سیاسی اقتدار کو قائم رکھنے اور الیکشن میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے عوام کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ مساعی صرف اس لیے انجام دی جاتی ہیں کہ زیادہ سے زیادہ ووٹ اور فائدہ حاصل کیا جاسکے۔ اور اپنے اقتدار کو قائم رکھا جائے۔

بخلاف ازیں اسلامی ریاست عوام کی فلاح و بہبود کو اپنا فرض خیال کرتی ہے اس کا مقصدِ وجود ہی عوام کو سہولت بہم پہنچانا اور ہر طرح کی حفاظت و نگہداشت کرنا ہے۔ اسلامی ریاست مطالبات اور احتجاج کے ڈر سے یہ حقوق ادا نہیں کرتی بلکہ اس کے یہاں یہ بنیادی اصول ہے۔ جس کو ہر قیمت پر نبھانا اس پر فرض ہے۔ اسلامی حکومت کسی جبر کے تحت یہ کام نہیں کرتی بلکہ دلی تعاون اور عبادت کے جذبہ کے ساتھ اسے انجام دیتی ہے۔ یہاں صرف معیارِ زندگی ہی کو اونچا نہیں کیا جاتا بلکہ اخلاقی اقدار کو بھی بلند کیا جاتا ہے۔ یہ ایک انقلابی تصور ہے جو موجودہ دور کے تمام معاشی تصورات سے بہتر ہے۔

معلّم اور داعی ریاست

سوال نمبر ۹۹ :۔ اسلامی ریاست میں تعلیم و تربیت، دعوت و ارشاد اور اخلاقِ حسنہ کو کیا اہمیت حاصل ہے؟

جواب :۔ **تبلیغ اور دینِ اسلام** اسلام صرف معاشی کفالت کا ہی ذمہ دار نہیں بلکہ اخلاقی تعلیم اور تہذیب و تمدن کی ترویج و اشاعت بھی اس کے ذمہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بُعِثْتُ مُعَلِّماً" مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے۔

اسلامی ریاست تمام شہریوں کی تعلیم وتربیت کا بندوبست کرنی، پوری دنیا کے سامنے حق کو پیش کرنی اور اسلام کے جھنڈے کو بلند رکھتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

"طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ" (ابن ماجہ) علم کی تلاش ہر مسلمان پر فرض ہے

نبی کا سب سے پہلا اور اہم فریضہ دعوت وتبلیغ ہے۔ یعنی جو سچائی اس کو خدا کی طرف سے ملی ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دینا اور جو علم اس کو عطا ہوا ہے اس سے اوروں کو بہرہ ور کرنا۔ خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے وہ لوگوں کو سنا دینا اس لئے اس کو جس صداقت سے آگاہ کیا ہے اس سے ہم جنسوں کو باخبر کرنا۔ جو مالی جانی، زبانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس کو بخشی گئی ہیں۔ ان کو اس راہ میں صرف کرنا اور اعلان ودعوت میں جو تکلیف بھی سامنے آئے اس کو راحت جاننا۔ جو مصیبت بھی درپیش ہو اس کو آرام سمجھنا، حق کی آواز کو دبانے کے لئے جو قوت بھی سر اٹھائے اس کو کچل دینا اور مال ومنال، اہل وعیال غرض جو چیز بھی اس سفر میں سنگِ راہ ہو کر سامنے آئے اس کو ہٹا دینا۔

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے۔ اس کا دائرہ جملہ اقوام عالم اور جمیع ازمنہ و امکنہ کو محیط ہے۔ اس لئے ہر دور کے مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ہمہ تن تبلیغ اسلام کے لئے تیار رہیں اور جس مذہب کو انہوں نے حق سمجھ کر اختیار کیا ہے دوسروں کو بھی اس سے روشناس کرائیں۔ قرآن کریم میں فرمایا:۔

"كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ" (آل عمران۔۱۱) تم وہ بہترین جماعت ہو جسے لوگوں کے فائدے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے، برائی سے روکتے اور اللہ پر

Marfat.com

ایمان رکھتے ہو۔

سب امت پر عمومی حیثیت سے دعوت و ارشاد کو فرض ٹھہرایا۔ پھر امت میں ایک ایسے گروہ کے وجود کو ضروری قرار دیا۔ جو اپنی زندگی کو اسی کام کے لئے وقف کر دیں۔

قرآن میں فرمایا:۔

"وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ اُمَّةٌ يَدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (آل عمران ۱۰۴)

تم میں سے ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہیئے جو بھلائی کی دعوت دے، نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔

اس آیت میں امت کے ذمہ شہادت حق کا وہی فریضہ عائد ہوتا ہے جو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد تھا۔

"لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ" (الحج ۔ ۷۸)

تاکہ پیغمبر تم پر گواہ ہو۔ اور تم تمام انسانوں کے سامنے حق کے گواہ بنو۔

ارکین حکومت کے بارے میں فرمایا:۔

"اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ" (سورۃ الحج)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں تو نماز قائم کریں گے زکوٰۃ ادا کریں گے۔ نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے باز رکھیں گے۔

ان آیات میں واضح ہوتا ہے کہ اسلامی ریاست اپنے شہریوں کی تعلیم و تربیت، تہذیب و اصلاح اور تبلیغ و ارشاد کی بھی ذمہ دار ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دین اسلام ایک کامل و اکمل دین ہے اس کے مبلغ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء تھے جن کے بعد رسالت و نبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے بند کر دیا گیا ہے۔ اب آپ

Marfat.com

کے بعد دین کی اشاعت و تجدید کے لئے کوئی نیا نبی مبعوث ہو کر نہیں آئے گا۔ بلکہ تا قیام قیامت اصحاب علم مسلمان خطۂ ارضی کے دُور افتادہ کونوں تک اس کی دعوت و تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے رہیں گے۔ دنیوی مشاغل میں منہمک ہو کر جب دینی جذبات سرد پڑ جاتے ہیں تو ان کو گرمانے اور از سرِ نو زندہ کرنے کے لئے بھی تبلیغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بنابریں مسلم، غیر مسلم دونوں کو دینی احکام سے روشناس کرانے کے لیے ہر دَور میں تبلیغ کی شدید ضرورت ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے خطرات سے بے پرواہ ہو کر پیامِ الٰہی کو لوگوں تک پہنچایئے اور اگر ایسا نہ کیا تو آپ نے فریضۂ رسالت انجام ہی نہیں دیا۔

قرآن میں فرمایا :-

"یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ ط وَاللّٰہُ یَعْصِمُکَ مِنَ النَّاسِ" (سورۃ المائدہ۔ ۱۰)

اے رسول تیرے پروردگار کی طرف سے جو کچھ تیری طرف اترا ہے اس کو پہنچا دے۔ اگر تُو نے ایسا نہ کیا تو تُو نے خدا کا پیغام نہیں پہنچایا۔ اور تجھ کو خدا لوگوں سے بچائے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاں دیگر فرائض و مناصب تفویض کئے گئے تھے وہاں معلم اعظم کا عہدۂ جلیلہ بھی عطا ہوا۔ جب آپ مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ایک مسجد تعمیر کی جو بعد میں مسجد نبوی کے نام سے مشہور ہوئی۔ یہ مسجد جہاں عبادت گاہ تھی وہاں اسے ایک مکتب کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ مسجد کے آگے ایک چھوٹا سا سائبان تھا جسے صُفّہ کہتے تھے۔ اسلام کے اوّلین طلبہ جن کو اصحابِ صُفّہ کہا جاتا ہے اسی مکتب میں زیرِ تربیت تھے۔ اصحابِ صُفّہ چند مفلس صحابہ تھے جو شمعِ نبوی کے گرد پروانوں کی طرح منڈلاتے رہتے تھے۔ اِن کا مقصدِ وحید صرف

Marfat.com

تحصیل علم تھا۔ ابوہریرہؓ جیسے جلیل القدر صحابی اور مایۂ ناز حافظِ حدیث اصحابِ صفہ ہی میں شامل تھے۔ فضیلتِ علم ہی کا نتیجہ تھا کہ آنحضورؐ نے اشاعتِ علم کی جانب خصوصی توجہ مبذول فرمائی۔ آغازِ اسلام میں صرف چند آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ آپؐ کی کوشش سے لکھنے پڑھنے کا رواج عام ہوا۔ جنگِ بدر میں جب کفار کے ستر آدمی گرفتار ہو کر آئے تو آپؐ نے ان قیدیوں کو رہا کرنے کا وعدہ کیا جو دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔ ان حقائق سے واضح ہوتا ہے کہ ظہورِ اسلام سے اشاعتِ علم کو حد درجہ تقویت حاصل ہوئی تھی۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے آنحضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے عبرانی زبان سیکھی تاکہ یہود سے قومی معاملات میں آسانی رہے۔ تعلیم کو پھیلانے کے لئے آپ مختلف مقامات پر تعلیمی و تبلیغی وفود بھیجا کرتے تھے۔ مدینہ کے باہر کے لوگوں کے لئے آپؐ نے یہ قاعدہ مقرر کیا تھا کہ ان میں سے ہر گروہ کے لوگ اپنے میں سے ذہین افراد کو مدینہ بھیجیں جہاں وہ تعلیم حاصل کرتے اور واپس جا کر اپنے اپنے علاقہ میں تعلیم پھیلاتے۔ باہر سے جو لوگ آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ ان میں سے سمجھ دار لوگوں کو آپؐ ان کی تعلیم پر مامور کر لیتے۔ جن لوگوں کو سرکاری عہدوں پر مقرر کرتے ان کو علم پھیلانے کی ہدایت دیتے۔ جب آپؐ نے عمرو بن حزمؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو انہیں یہ نصیحت فرمائی۔

"حق پر قائم رہیں اور لوگوں کو بھلائی کا حکم اور بھلائی کی بشارت دیں۔ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں اور ان کو با سمجھ بنائیں۔ لوگوں کو ناپاکی کی حالت میں قرآن کو چھونے سے روکیں۔ لوگوں سے نرم سلوک روا رکھیں تاکہ لوگوں میں دین کا فہم حاصل کرنے کی رغبت پیدا ہو" (سیرت ابن ہشام جلد ۲ صفحہ ۲۴۱)

علم کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت کا تقاضا ہے کہ اسلام نے معاشرے کے ہر شعبہ میں علم ہی کو وجہِ فضیلت اور عزت و وقار کے لئے معیار و مدار مقرر کیا ہے۔ امامت و خطابت سے لیکر اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ داروں تک جس چیز کو سب سے پہلے دیکھا جاتا ہے وہ قرآن و

Marfat.com

حدیث کا علم ہے۔ آنحضورؐ نے اسلامی مملکت کے ہر کونہ میں معلم مقرر کر دیئے تھے جو لوگوں کو کتاب و سنت کی تعلیم دیتے تھے۔ یہ اسی تعلیم کا فیض تھا کہ ایک طرف دین کا علم شہر شہر، گاؤں گاؤں، محلہ محلہ اور گوشہ گوشہ میں پہنچ گیا اور دوسری جانب اسلامی ریاست کو ہر موقع پر ایسے اہل علم اور صاحب فہم و ادراک کارکن میسر آتے گئے جو ہر طرح قیادت و سیادت کی صلاحیتوں سے بہرہ ور تھے۔

تاریخ اسلام کے اوراق اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ مسلمانوں نے ہمیشہ علم کو قدر و قیمت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ مسلمان تاریخ کے ہر دور میں علم کی سرپرستی کرتے رہے ہیں۔ اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ تمام شہریوں کیلئے ضروری اور بنیادی تعلیم کا انتظام کرے۔ نظام تعلیم میں علوم دینیہ کو اولین اہمیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ مفید علوم و فنون کو حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ البتہ بے مقصد علوم سیکھنے میں اپنا وقت اور مال ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ تاریخ اسلام سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے تعلیم کا معاوضہ کبھی وصول نہیں کیا۔ اسلامی حکومتوں میں فیس وصول کرنے کا رواج نہ تھا۔ ہر قسم کے علوم بلا فیس لوگوں کو پڑھائے جاتے تھے۔ تعلیم کے پہلو بہ پہلو اسلامی ریاست اخلاقی تربیت اور کردار سازی کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے۔ یہ ریاست صرف مسلم شہریوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام نہیں کرتی بلکہ پوری کائنات تک اسلامی تعلیمات کو پہنچاتی ہے۔

مذکورہ صدر بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست ایک معلم کی طرح اپنے شہریوں کی تربیت کرتی اور دنیا کے سامنے اسلام کی دعوت کو پہنچاتی ہے۔ اس حیثیت سے یہ ریاست ایک طرف تو لوگوں کے معیار علم و اخلاق کو اونچا کرتی ہے اور دوسری طرف اسلام کی عالمگیر دعوت کو عام کرتی ہے۔ اس کی دعوت ہمہ گیر اور غیر محدود ہے۔ یہ کسی قوم و ملک اور خطہ ارضی تک محدود نہیں بلکہ پوری کائنات کے لئے ہے۔ اس اعتبار سے یہ ریاست منفرد اور اپنی مثال آپ ہے۔

Marfat.com

اسلامی تصورِ قومیت

سوال نمبر ۱۰۰:۔ نظریہ قومیت سے کیا مراد ہے؟ وہ کونسے عوامل ہیں جو تاریخ میں قومیت کو جنم دیتے رہے ہیں؟

جواب:۔ مل جل کر رہنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسانوں میں تعاون و ہمدردی پائی جاتی ہے۔ تعاون و اشتراک کا جذبہ ہی قومیت کی اساس ہے۔ قوم انسانوں کے گروہ کا نام ہے جو مل جل کر رہنے کا خواہاں ہو اور اجتماعی وحدت نے جس کی شیرازہ بندی کر دی ہو اس گروہ کے افراد میں مل جل کر رہنے کا جو احساس پایا جاتا ہے اسی کا نام قومیت ہے۔ اس احساس سے بے جا طرفداری اور حمایت کا جذبہ ابھرتا ہے اسے عصبیت یا تعصب کہتے ہیں۔ اسی تعصب کے نتیجہ میں قوم اپنے افراد سے محبت کرتی ہے۔ اور دوسروں کو اجنبی اور بیگانہ تصور کرتی ہے۔ اس جذبہ میں جب شدت وحدت کے آثار رونما ہونے لگتے ہیں تو اس سے دوسری قوموں کے خلاف نفرت و حقارت کے احساسات ابھرنے لگتے ہیں۔ اسی کے زیر اثر لوگ اپنی قوم کا ساتھ دیتے ہیں قطع نظر اس سے وہ حق پہ ہو یا باطل پر۔ نظریۂ قومیت کو دورِ حاضر کی سیاسی اصطلاح میں نیشنلزم (NATIONALISM) کہتے ہیں۔

قومیت کے عوامل | قومیت کو پیدا کرنے والے عوامل یوں تو بہت سے رہے ہیں مگر ان میں سے اہم یہ ہیں۔

۱۔ نسل:۔ ایک نسل کے لوگ اپنے آپ کو ایک قوم سمجھتے ہیں۔ ان کی قومیت کی بنیاد وحدتِ نسل ہے۔ اس کی مثال یہودیت اور جرمنی کا نازی ازم ہے ان دونوں تحریکوں کی بنیاد نسل پر رکھی گئی ہے یہودی مذہب دراصل ایک نسلی مذہب ہے جو بنی اسرائیل کی

Marfat.com

نسل میں محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ نازی ازم جرمن قومیت کا دعویدار ہے۔ اسلام میں حسب و نسب اور نسل کی بنیاد پر کوئی قوم نہیں بنتی۔ اس کی نگاہ میں سب انسان آدم کی اولاد ہیں اور سب کی نسل ایک ہے۔ اسلام ایسی نسلی تفریق کا قائل نہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں نسلی تفریق اور فخر بالآباء کو مٹانے آیا ہوں۔

۲۔ رنگ :۔ کسی خاص رنگ مثلاً کالے یا گورے کو بھی قومیت کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ ایک رنگ کے لوگ اپنے آپ کو ایک قوم سمجھتے ہیں اور دوسروں کو اپنے میں شامل نہیں کرتے۔ افریقہ میں گورے اور کالے کا امتیاز اور امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں حبشی اور غیر حبشی کی تفریق اسی تصور کی یادگار ہے۔ اسلام کسی خاص رنگ کو وجہ امتیاز نہیں ٹھہراتا اس کے نزدیک کالے گورے اور عربی عجمی میں رنگ کی بنا پر کوئی فرق و امتیاز نہیں پایا جاتا عظمت و فضیلت کا معیار سیرت و کردار اور افعال و اعمال ہیں۔

۳۔ زبان :۔ ایک زبان بولنے والوں کو ایک قوم تصور کیا جاتا ہے۔ اور جو لوگ یہ زبان نہ بولتے ہوں وہ اس سے خارج سمجھے جاتے ہیں۔ زبان صرف اظہار مافی الضمیر کا ایک ذریعہ ہے۔ اسلام اسے قومیت کی بنیاد قرار نہیں دیتا۔ دورِ حاضر میں عرب قومیت کی تحریک زبان کے اتحاد پر ہی کھڑی کی گئی ہے۔

۴۔ معاشی اغراض اور نظامِ حکومت :۔ معاشی اغراض و مقاصد کی یگانگت اور ایک ہی نظامِ حکومت کے زیرِ سایہ رہنے سے بعض اوقات قومیت کا جذبہ ابھرتا ہے۔ جن لوگوں کے معاشی مسائل یکساں نوعیت کے ہوتے ہیں وہ اپنے آپ کو ایک قوم کے افراد تصور کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک حکومت میں رہنے والے بھی ایک قوم سمجھے جاتے ہیں۔ اسلام اس چیز کو بھی قومیت کی اساس قرار نہیں دیتا اس لئے کہ معاشی مسائل اور نظامِ حکومت میں تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ کسی ناپائیدار چیز کو حکومت کی بنیاد ٹھہرانا درست نہیں۔

۵۔ وطن:۔ ایک خاص وطن میں بود و باش رکھنے کو بھی قومیت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ ایک ایسے خطۂ ارضی میں رہتے ہیں جن کو جغرافیائی حدود نے ایک علیحدہ ملک کی صورت دے دی ہو وہ ایک قوم ہیں۔ جو لوگ اس محدود رقبہ میں آباد نہیں وہ اس کی قومیت سے خارج ہیں۔ قومیت کے تمام عوامل میں سے آج وطن کا چرچا سب سے زیادہ ہے۔ وطنیت کا جذبہ بے جا حمایت و عصبیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

یہ وہ بنیادی عوامل ہیں جن کو انسانی تاریخ کے مختلف ادوار میں قومیت کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاتا رہا ہے مگر اسلام ان میں کسی کو بھی قومیت کی بنیاد قرار نہیں دیتا بالفرض اگر یہ تمام عوامل یکجا ہو جائیں تو بھی ان سے قومیت کی تشکیل نہیں ہوتی۔

سوال نمبر ۱۰۱:۔ جن عوامل کو آج قومیت کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے دلائل سے ثابت کیجئے کہ وہ قومیت کی بنیاد نہیں بن سکتے۔

جواب:۔ جن امور کو قومیت کے عوامل قرار دیا گیا ہے درا صل ان میں سے کوئی بھی عامل ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ ان عوامل سے کوئی انسانی ضرورت پوری نہیں ہوتی بلکہ ان سے انسانیت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور وہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں اور گروہوں میں بٹ جاتی ہے جس کا نتیجہ بے جا تعصب و حمایت اور ظلم و تعدی کی صورت میں نکلتا ہے۔ ان کو قومیت کی اساس قرار دینا عقل و فطرت کے بھی منافی ہے۔ اتحاد نسل سے کسی قوم کی تشکیل نہیں ہو سکتی۔ خون کا رشتہ بیشک اہم ہوتا ہے مگر چند نسلوں کے بعد وہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ پھر یہ کہ کسی نسل کے خالص ہونے کی کیا ضمانت ہے؟ اور اس کی کیا دلیل ہے کہ اس میں کوئی آمیزش نہیں ہوتی؟ علاوہ ازیں اگر نسل ہی کا اعتبار ہے تو آدم و حوا کو اس کا نقطۂ آغاز کیوں نہ بنایا جائے؟ جب کہ سب انسان حضرت آدم کی اولاد ہیں۔ اسلام رشتۂ رحم کو غیر اہم نہیں سمجھتا۔ اس میں صلہ رحمی کا حکم دیا گیا ہے اور

Marfat.com

قطع رحم سے روکا گیا ہے۔ مگر اسلام اس رشتہ کو قومیت اور سیاسی مرکزیت کے لئے ایک بنیادی عامل تسلیم نہیں کرتا۔ اگر نسلی اتحاد قومیت کی تشکیل کے لئے ایک بنیادی عامل ہوتا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد اور نوح علیہ السلام کے بیٹے کو ان سے الگ نہ کیا جا سکتا۔

اسی طرح رنگ کی بنیاد پر انسانوں کی تفریق بھی ایک غیر فطری خلافِ عقل اور بعید از انصاف فعل ہے۔ آب و ہوا اور طرز بود و باش کے اختلاف سے بھی رنگ کا اختلاف ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ اسی طرح نسلی توارث سے بھی اس کے پیدا ہونے کا امکان ہے ان میں سے کوئی بات بھی انسانوں کے سیاسی و معاشرتی مسائل میں کوئی دخل نہیں رکھتی بلکہ اس سے حسد و بغض اور عداوت کینہ توزی کے جذبات ابھرتے ہیں جس سے فتنہ و فساد کا بازار گرم ہوتا اور خدا کی زمین خون ریزی و سفاکی کے واقعات سے لالہ زار بن جاتی ہے۔ جن ممالک میں رنگ کے اختلاف کو بنیادی حیثیت حاصل ہے وہاں کبھی امن و چین کی فضا قائم نہیں ہوتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی فضیلت نہیں۔ اگر ایک حبشی غلام کو بھی تم پر حاکم مقرر کیا جائے تو اس کی اطاعت کرو۔"

زبان کے اتحاد کو بھی قومیت کی تشکیل سے کوئی تعلق نہیں۔ زبان صرف اظہارِ خیال کا ایک ذریعہ ہے، قومیت کی اساس نہیں ہے۔ زبان کے اتحاد سے زیادہ اہمیت تو افکار و آراء اور جذبات و احساسات کی یکرنگی و ہم آہنگی کو حاصل ہے۔ زبان صرف ان کے اظہار کا ایک وسیلہ ہے عربی زبان نے امرؤالقیس جیسے بلند پایہ شاعر کو جنم دیا جو اپنے کمال فن کی وجہ سے ملک الشعراء کہلاتا تھا۔ چونکہ اس نے جن شاعرانہ خیالات کا اظہار کیا وہ باطل اور لغو تھے اس لئے افصح العرب صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے "اَشْعَرُ الشُّعَرَاءِ وَقَائِدُهُمْ اِلَى النَّارِ" (سب سے بڑا شاعر مگر دوزخیوں کا امام) کا لقب دیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ بھی عربی کے بلند پایہ شاعر تھے۔ آپؐ ان کے

Marfat.com

بیجد مدّاح تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل اہمیت صحتِ فکر و نظر کو حاصل ہے اور زبان صرف ایک ذریعۂ اظہار ہے۔ ورنہ امرؤ القیس اور حضرت حسان دونوں کی زبان عربی تھی۔

اشتراکِ وطن کو بھی قومیت کی بنیاد نہیں بنایا جا سکتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ وطن ہر کسی کو عزیز ہوتا ہے۔ وطن سے محبت ایک فطری جذبہ ہے۔ جس سے انبیاءؑ تک بھی مستثنےٰ نہیں ہے۔ مگر قابلِ غور بات یہ ہے کہ آیا وطن کو قومیت کی تشکیل کے لئے بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ قومیت کی تشکیل افکار و نظریات اور عقائد کے اتحاد و اشتراک پر کی جاتی ہے وطن کی بنیاد پر نہیں۔ نظریات وہ چیز ہیں جن پہ وطن کو بھی قربان کر دیا ہے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین صحابہؓ نے ایمان کی خاطر وطن کو ترک کر دیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان عالمِ وجود میں آیا۔ لاکھوں مسلمان اپنے ایمان کو بچانے کے لئے بھارت سے پاکستان ہجرت کر آئے اگر غور کیا جائے تو جس زمین پر ایک شخص پیدا ہوتا ہے وہ چند گز سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اگر اسے پھیلا کر پورے ملک کو محبت کا مرکز بنایا جا سکتا ہے۔ تو پھر ملک سے آگے بڑھ کر اس محبت کو ساری دنیا تک کیوں وسیع نہ کر دیا جائے۔ دینِ اسلام وطن کی محبت کو مٹاتا نہیں لیکن اتحاد اور وفاداری کی اصل بنیاد وطن کی بجائے اصول و نظریات کے اتحاد اور دین کو قرار دیتا ہے۔ دین ایسی اہم چیز ہے کہ اس کے لئے وطن کو خیرباد بھی کہا جا سکتا ہے علامہ اقبالؒ نے صحیح فرمایا تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے جانا اور وہاں اسلامی ریاست کی تشکیل کرنا قومی وطنیت کے نظریہ پہ ایک کاری ضرب کی حیثیت رکھتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ تمام عوامل عقلی اور اصولی طور پر قومیت کی بنیاد قرار نہیں پا سکتے۔ ان کے اجتماع سے جو قوم بنتی ہے وہ غیر فطری ہے اس میں الفت و محبت کی بجائے تعصب تنگ نظری اور حسد و عداوت کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اس میں انسانوں کے مسائل کو حق و باطل کی بجائے ایک مخصوص قومی نقطۂ نظر سے دیکھا اور پرکھا جاتا ہے۔ وہ انسانوں

Marfat.com

کو جوڑتی نہیں توڑتی ہے۔ اس کے وجود سے تنگ نظری اور تعصب کی آگ بھڑکتی ہے۔
اور یہ دنیا ایک جہنم بن جاتی ہے۔

سوال نمبر ۱۰۲:۔ وہ کونسے امور و اسباب ہیں جو اسلامی قومیت کو جنم دیتے ہیں! تفصیلاً بیان کیجئے؟

جواب:۔ اسلام کا نظریۂ قومیت سب سے الگ ہے یہ رنگ و نسل اور وطن و زبان میں سے کسی کو بھی قومیت کی بنیاد قرار نہیں دیتا۔ اسلام ایک انقلابی پیغام کا علمبردار ہے وہ قومیت کی بنیاد اسلام پر رکھتا ہے۔ وہ ایک ہمہ گیر اور جامع نظریۂ حیات کا داعی ہے۔ جو شخص اس دعوت پر لبیک کہتا ہے وہ اس کی قومیت میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور جو اس سے انکار کرتا ہے وہ کافر ہو جاتا ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

اسلام رنگ و نسل اور قوم و زبان کی غیر فطری تقسیم کو مٹانے کے لئے آیا ہے وہ خالص عقلی بنیاد پر ایک قوم کی تعمیر کرتا ہے وہ انسانوں کو ارضی و مادی بنیاد پر تقسیم نہیں کرتا بلکہ روحانی و جوہری امتیاز کا قائل ہے۔ اسلام خدا کی اطاعت و عبادت نفس کی پاکیزگی، عمل صالح اور تقویٰ کی دعوت دیتا ہے۔ وہ اس دعوت کو قبول کرنے اور اس سے انکار کرنے والوں کے درمیان خط امتیاز کھینچ کر کفر و اسلام دو قوموں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان وجہ فرق و امتیاز عقیدہ اور عمل ہے، نسل و نسب یا قوم و زبان نہیں۔ ایک باپ کے دو بیٹے کفر و اسلام کی بنیاد پر جدا جدا ہو جاتے ہیں۔ دو بالکل اجنبی آدمی جن کے درمیان کوئی رشتہ داری نہ ہو اسلام کے رشتۂ اتحاد کی بنا پر ایک شیرازہ میں منسلک ہو سکتے ہیں یہاں وطن کا اختلاف بھی اتحاد سے روک نہیں سکتا۔ بلال حبشی رضی اللہ عنہ اور صہیب رومی رضی اللہ عنہ اختلاف نسل و وطن کے باوجود ایک ہی قوم کے فرد بن سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے

Marfat.com

کہ ایک شہر ایک محلہ اور ایک گھر کے دو آدمیوں کی قومیتیں اسلام اور کفر کے اختلاف کی وجہ سے مختلف ہو جائیں اور ایک سوڈانی رشتۂ اسلام میں مشترک ہونے کی وجہ سے ایک پاکستانی کا قومی بھائی بن جائے۔

رنگ کے اختلاف کو بھی اسلام کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ یہاں ظاہری رنگ کا اعتبار نہیں بلکہ باطن کا رنگ معتبر ہے۔ باطنی رنگ اللہ کا رنگ ہے اس لئے وہ اصلی اور حقیقی رنگ ہے۔ قرآن میں فرمایا:۔

"صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً" (البقرہ۔ ۱۳۸) — اللہ کا رنگ اختیار کرو اللہ کے رنگ سے بہتر اور کس کا رنگ ہو سکتا ہے۔

ایک گورا اور ایک کالا شخص اسلام کے رشتۂ اتحاد کے باعث ایک ہی قوم کے فرد ہو سکتے ہیں۔ اور کفر کی بنا پر دو گورے آدمی الگ الگ قومیت کے فرد ہوں گے۔ اسلام زبان کے اختلاف کو بھی وجہ تفریق قرار نہیں دیتا۔ وہ زبان کے اختلاف سے دل کے اختلاف کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ دو آدمیوں کی زبان مختلف ہو لیکن دونوں کے دل ایک ہوں تو وہ دونوں ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور وہ دو آدمی جن کی بولی ایک ہو لیکن دل مختلف ہوں دونوں الگ الگ قوم کے فرد ہوں گے۔

معاشی اور سیاسی نظام کو بھی اسلام قومیت کی بنیاد قرار نہیں دیتا۔ ہو سکتا ہے کہ دو شخصوں کا ذریعہ معاش ایک ہو۔ مگر کفر و اسلام کے اختلاف کی بنا پر وہ ایک قوم کے فرد نہ ہوں۔ اسی طرح دو مختلف نظاموں کے زیر سایہ رہتے ہوئے بھی دو شخص ایک ہی قومیت (اسلام) کے فرد ہو سکتے ہیں۔ اسلام کے یہاں جس چیز کو اہمیت حاصل ہے وہ زر و مال نہیں بلکہ دولت ایمان ہے۔ یہاں سوال انسانی سلطنت کا نہیں خدا کی بادشاہت کا ہے۔ جو لوگ حکومت الٰہی کے وفادار ہیں اور خدا سے عہد وفا باندھ چکے ہیں وہ سب ایک ہی قوم کے فرد ہیں خواہ وہ کہیں رہتے ہوں اور کسی حکومت کی اطاعت کرتے ہوں

جو خدا کی حکومت کے نافرمان ہیں وہ مسلمانوں سے ایک الگ قوم ہیں خواہ کسی مملکت کے زیر سایہ رہتے ہوں۔

اسلام نے قومیت کی جو حدبندی کی ہے وہ جغرافیائی اور مادی حدبندی نہیں اس نے قومیت کو ایک عقلی دائرہ میں محدود و محصور کیا ہے۔ جس کا مرکز کلمہ طیبہ ہے۔ عداوت و محبت کا انحصار اسی ایک کلمہ پر ہے۔ اس کا اقرار بنی نوع انسان کو ایک شیرازہ میں باندھ دیتا ہے۔ اور اسی کا انکار انہیں جدا جدا کر دیتا ہے۔ اسلام کے سیاسی نظام میں ملتِ اسلامیہ کی وحدت ایک بنیادی اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر مسلمان مختلف ممالک میں رہتے ہوں تو بھی انہیں خالص وطنی قومیت کے مقابلہ میں اسلام کی نظریاتی قومیت کی حمایت کرنا چاہیئے۔ کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ کرۂ ارضی کے سب مسلم ممالک مل کر اپنی ایک دولتِ مشترکہ قائم کریں۔ دورِ حاضر میں پاکستان اسلامی قومیت کے نظریہ کی پیداوار ہے۔ یہ ایک نظریاتی ریاست ہے جس کے قیام میں ہندوستان کے سب مسلمانوں نے یکساں حصہ لیا ہے۔ یہ جغرافیائی وحدت یا نسل و زبان اور رنگ کے اتحاد کی بنا پر عالم وجود میں نہیں آیا۔ اس میں جغرافیائی وحدت کا کوئی نشان ہے نہ اتحادِ زبان و بیان کا کوئی امکان۔ صرف دین و ایمان اور نظریۂ حیات کی وحدت نے دو دُور افتادہ ملکوں کو جوڑ رکھا ہے۔ اسی کو قائم کرنے کے لئے یہ ملک عالمِ وجود میں آیا اس کا تقدس ہماری نگاہ میں صرف اس امر سے وابستہ ہے کہ یہ اسلامی نظریۂ حیات کا داعیہ لے کر اٹھا ہے۔

خارجہ پالیسی کے بنیادی اصول

سوال نمبر ۱۰۳:۔ اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی کے اصول بیان کیجئے؟

جواب:۔ جو ریاست اسلامی نظریۂ قومیت پر ایمان رکھتی ہے اس کی خارجہ پالیسی

Marfat.com

کے بنیادی اصول حسب ذیل ہے۔

۱۔ دعوت اسلام کی تبلیغ اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی کا پہلا اصول یہ ہے کہ یہ ریاست خدا کی شریعت کی داعی اور مبلغ ہے قرآن نے اس کو امت وسط "قرار دیا اور شہادت حق کو اس کا فریضہ ٹھہرایا ہے۔ یہ ریاست اپنے قول و عمل اور طریق کار سے دین حق کی شہادت دیتی اور اس کی صداقت کو اقوام عالم پر روشن کرتی ہے۔ یہ ریاست کوئی ایسا طرز عمل اختیار نہیں کر سکتی جس سے اس کی یہ حیثیت باقی نہ رہے۔

۲۔ عوام کی فلاح و بہبود اسلامی حکومت رعایا کے مفاد کا ہر طرح خیال رکھتی ہے وہ عوام کی صلاح و فلاح کو کسی وقت بھی نظر انداز نہیں کرتی۔ اسلامی حکومت ایک فلاحی ریاست ہوتی ہے جس کا مطمح نظر ہی لوگوں کا آرام و آسائش، ان سے حقیقی خیر خواہی و ہمدردی اور ان کے حقوق کے لئے جدوجہد ہے۔ یہ ملک میں امن و امان قائم کرتی ہے۔ فتنہ و فساد کو دور کرتی ہے۔ اور ملک میں سکون و اطمینان کی فضا پیدا کرتی ہے۔ اسلام وطن کی محبت کو علامت ایمان قرار دیتا ہے۔ مگر وہ یہ نہیں کہتا کہ حق و ناحق ہر حال میں وطن کی طرفداری کی جائے۔ اسلام حق کی صورت میں تعاون کا حکم دیتا ہے اور ناحق ہونے کی حالت میں مخالفت کو فرض قرار دیتا ہے۔ ایک دفعہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اپنے بھائی کی مدد کر خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم" صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ! جب وہ مظلوم ہو تو اس کی مدد سمجھ میں آتی ہے۔ اگر وہ ظالم ہو تو پھر اس کی مدد کیسے کی جا سکتی ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا "اس کی مدد اسی طرح کرو کہ اس کو ظلم سے روک دو۔"

۳۔ دولت مشترکہ کا قیام اسلام کرۂ ارضی کے مسلمانوں کو ایک امت قرار دیتا ہے اس لئے اسلامی ریاست کو دیگر مسلم ممالک کے ساتھ تعاون و اشتراک کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ تمام مسلم ممالک کو چاہیئے کہ باہمی تعاون و اتحاد سے ایک دولت مشترکہ قائم کریں۔ مسلم ریاستوں کو باہم محبت، خیر سگالی، اتحاد و اتفاق اور یک جہتی کی فضا پیدا کرنی چاہئے۔ خارجی پالیسی

Marfat.com

کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ جو مسلمان غیروں کے غلام ہوں ان کو غلامی سے نجات دلانے کی کوشش کی جائے۔ مسلمان صرف خدا کی غلامی کے لئے پیدا ہوا ہے۔ اس لئے کسی غیر کا غلام نہیں رہ سکتا۔ کرۂ ارضی پر اگر ایک مسلم بھی غلامی میں گزرتا ہے تو اسے آزاد کرانا سب مسلمانوں پر فرض ہے۔ اسلامی فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر ایک مسلمان عورت مشرق میں قید ہو تو فدیہ دے کر اسے رہا کرانا مغرب میں بسنے والے مسلمانوں پر فرض ہے۔ خواہ اس کے لئے سب مسلمانوں کا مال دینا پڑے۔ جب ایک عورت کا چھڑانا ضروری ہے تو اسلامی ممالک کو اغیار کی غلامی سے نجات دلانا کس قدر اہم ہوگا۔

قرآن میں فرمایا :-

"اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ" (المومنون - ۵۲)

تمہاری یہ امت ایک ہی جماعت ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں پس مجھ سے ڈرو۔

دوسری جگہ فرمایا :-

"وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا" (آل عمران - ۱۰۳)

سب مل جل کر اللہ کی رسی کو تھام لو اور ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاؤ۔

ان آیات سے مسلمانوں کا ایک امت ہونا واضح ہوتا ہے۔

۴۔ **قیام امن** اسلام امن کا پیام لیکر آیا ہے یہ امن عالم کا علمبردار ہے۔ اس لئے اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی کا مقصد امن عالم کا قیام ہے۔ قرآن خون ریزی کو عظیم جرم قرار دیتا ہے۔ قرآن میں فرمایا :-

"مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا" (المائدہ - ۳۲)

جس نے قصاص لینے یا ملک میں فساد پھیلانے والوں کو سزا دینے کے علاوہ کسی انسان کو قتل کیا تو اس نے گویا تمام انسانوں کا قتل کیا اور جس نے کسی کی جان بچائی گویا اس نے

تمام انسانوں کو زندگی بخشی۔

قرآن میں دوسری جگہ فرمایا:۔

"وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا" (المائدہ۔ ۸)

ایسا نہ ہو کہ ایک گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات پہ آمادہ کر دے کہ تم عدل کرنا چھوڑ دو۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام قیام امن کا خواہاں ہے وہ انسانی زندگی کو دولت امن سے مالا مال کرنا چاہتا ہے۔ اسلام صرف قیام امن کی تاکید ہی نہیں کرتا بلکہ ان اسباب کی نشاندہی کرتا ہے جو قیام امن کی راہ میں رکاوٹ ہوتے ہیں۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ فتنہ وفساد کے ذرائع و وسائل ختم کرنے پر ہی حقیقی امن و سکون قائم ہو سکتا ہے۔

قرآن میں فرمایا:۔

"وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ فَإِنِ انتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ" (البقرہ۔ ۱۹۳)

اور ان سے اس وقت تک لڑتے رہو جب تک فتنہ وفساد ختم نہ ہو جائے اور دین خالص اللہ کیلئے نہ ہو جائے۔ اگر وہ فساد سے باز آجائیں تو ظالموں کے سوا کسی پر زیادتی نہیں کرنا چاہیئے۔

۵۔ انسانی مساوات اسلام جغرافیائی حدود کی اساس پر انسانوں کو تقسیم نہیں کرتا وہ ایک بین الاقوامی برادری قائم کرنے کا متمنی ہے جو ایک قانون کی پیروی کرنے والی اور ایک مرکز سے وابستہ ہو۔ اسلام ایک ایسی برادری قائم کرنا چاہتا ہے جس میں نسب و نسل، زبان و بیان، کالے وگورے، اور عربی و عجمی کا کوئی امتیاز نہ ہو۔ پوری انسانی برادری ایک خاندان کی طرح یک رنگ و ہم آہنگ ہو۔ اگر اس میں کوئی فرق و امتیاز پایا جاتا ہو تو صرف ایمان و تقویٰ کی بنیاد پر۔ ایمان و تقویٰ ایک ایسی چیز ہے جو کسی کی میراث نہیں۔ اس پر کسی کی اجارہ داری نہیں۔ پوری انسانیت اس میں مساوی حیثیت رکھتی ہے۔ ہر شخص محنت و

خلوص سے اس دولت کو پا سکتا ہے۔ حدیث نبوی میں سب کائنات کو خدا کا کنبہ کہا گیا ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

"اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ" (بیہقی) — ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شخص سے بہت محبت کرتا ہے جو اس کے کنبہ سے نیک سلوک روا رکھتا ہے۔

۶۔ ایفاءِ عہد ایفاءِ عہد بھی اسلامی ریاست کا طرۂ امتیاز ہے۔ اسلام معاہدہ کی پابندی کا حکم دیتا ہے۔ قرآن میں فرمایا:۔

"یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ" (المائدہ۔۱) — اے ایمان والو! اپنے معاہدے پورے کرو۔

معاہدہ شکنی کی اس صورت میں اجازت ہے جب دوسرا فریق بھی اس کی خلاف ورزی کر رہا ہو۔ جب معاہدہ توڑنا ہو تو برملا دشمن سے کہہ دیا جائے کہ اب معاہدہ کی پابندی نہیں ہوگی۔

"فَاَتِمُّوْۤا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ" (التوبۃ۔۴) — پس ان سے ان کا عہد ان کے وعدہ تک پورا کرو۔

۷۔ انتقام کی اجازت بین الاقوامی معاملات میں انتقام لینے کی اجازت ہے مگر انتقام میں ظلم و تعدی کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ ظلم اتنا ہی کیا جائے جتنا کیا گیا ہو۔ اس سے بھی بہتر یہ ہے کہ انتقام سرے سے لیا ہی نہ جائے۔ بلکہ درگذر سے کام لے کر معاف کر دیا جائے۔

قرآن میں فرمایا:۔

"وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا" (الشوریٰ۔۴۰) — برائی کا بدلہ تو بس اس کے برابر برائی ہی ہو سکتا ہے۔

Marfat.com

دوسری جگہ فرمایا:-

"فَمَنِ اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ" (البقرہ - ١٩٤)

پس جو تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس کے برابر زیادتی کرکے اس کا بدلہ لے سکتے ہو۔

نیز فرمایا:-

"وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ" (النحل - ١٢٦)

اور اگر کسی کو سزا دو تو چاہیئے کہ اتنی ہی دو جتنی تمہیں دی گئی ہو۔ اور اگر تم نے صبر کیا تو بیشک وہ صبر کرنے والوں کیلئے بہتر ہے۔

مذکورہ صدر آیات اس حقیقت کی آئینہ داری کرتی ہیں کہ اسلامی حکومت اگرچہ دوسرے ممالک سے انتقام لینے کی مجاز ہے مگر عفو و درگزر کا مقام بلاشبہ انتقام سے بلند تر ہے۔ تاہم واقعات و حقائق ہی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کس موقع پر انتقام لیا جائے اور کہاں عفو و درگزر کو ترجیح دی جائے۔

اسلام کے تقاضے

اسلام کا تصورِ دین

سوال نمبر ۴۱:- مذہب کے بارے میں آجکل کونسے تصورات پائے جاتے ہیں؟ کونسا تصور قابلِ ترجیح ہے اور کیوں؟

جواب:- مذہب کے بارے میں آجکل تین تصورات پائے جاتے ہیں۔

۱- رہبانیت: مذہب کے بارے میں ایک تصور تو یہ ہے کہ یہ دنیا انسان کے لئے ایک قیدخانہ اور دارالعذاب ہے۔ انسان اس سے جتنی جلدی نجات حاصل کرسکے بہتر ہے۔ انسانی روح

Marfat.com

جسم کے پنجرہ میں بند ہے۔ وہ جب تک اس پنجرہ کو توڑ پھوڑ کر آزادی حاصل نہ کرلے اپنے مقصد کو نہیں پا سکتا۔ انسان اسی صورت میں قربِ خداوندی کو حاصل کر سکتا ہے۔ کہ وہ دنیوی لذت اور عیش و مسرت سے کنارہ کش ہو کر جنگلوں، پہاڑوں، غاروں اور انسانی آبادی سے دور دراز صحراؤں میں جاکر محوِ عبادت رہے۔ انسانی جسم کو جتنا الم و رنج پہنچایا جائے، بھوکا اور پیاسا رکھا جائے، اس کی جائز خواہشات کو پورا نہ کیا جائے، روح کو اسی قدر لطافت اور پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔ اس مذہبی طرزِ فکر کا نام "رہبانیت" یا "یوگ" ہے۔

۲۔ ناقص دینداری مذہب کے بارے میں دوسرا تصور یہ ہے کہ مذہب ایک نجی معاملہ ہے جس کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے ہے۔ انسان روحانی عظمت کے حصول کیلئے خدا کی عبادت کرے اور اس کا تقرب حاصل کرنے کے لئے صدقات و خیرات دے۔ مگر اجتماعی زندگی میں اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں۔ انسان اجتماعی معاملات میں بالکل آزاد ہے۔ جیسے چاہے کرے۔ مذہب اس بارے میں کوئی دخل اندازی نہیں کر سکتا۔ عبادت فرد کا کام ہے جماعت کا نہیں۔ مذہب بندے اور خدا کے درمیان ایک پرائیویٹ معاملہ ہے۔ یہ مذہب کا محدود تصور ہے۔ اسے "ناقص تدین" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مغربی تعلیمیافتہ طبقہ میں عیسائیت کے زیرِ اثر یہ نظریہ عام طور سے مقبول ہے۔

۳۔ اسلام تیسرا نظریہ یہ ہے کہ سابقہ دونوں تصورات افراط و تفریط پر مبنی ہیں۔ دنیا سے کنارہ کش ہونا اور مذہب کو نجی زندگی تک محدود رکھنا یہ دونوں نظریات غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی اسلام کے تابع ہے۔ انسان کو جو قوتیں اور صلاحیتیں دی گئی ہیں وہ اس لئے دی گئی ہیں کہ بندہ ان کو خدا کی عبادت و اطاعت کے لئے استعمال کرے۔ اسلام ان صلاحیتوں اور قوتوں کو نہ بالکل آزاد چھوڑنا چاہتا ہے کہ ان پر کوئی پابندی ہی نہ رہے اور نہ ان کو کچلنا چاہتا ہے کہ یہ بالکل ناکارہ ہو جائیں۔ کامل دینداری یہ ہے کہ انسان کا ہر لمحہ خدا کی اطاعت میں بسر ہو اور دنیوی زندگی کے تمام شعبوں کو اللہ تعالیٰ کی

Marfat.com

عطا کردہ ہدایات کے تابع کر دیا جائے۔ یہ اسلام کا نقطۂ نظر ہے۔

سوال نمبر ۱۰۵:۔ دلائل کی روشنی میں ثابت کیجئے کہ اسلام ہی عقلی اور فطری دین ہے

جواب:۔ اسلام نے دین کا جو تصور پیش کیا ہے اس کا رہبانیت سے کچھ تعلق نہیں خلاق عالم نے جو حقیقی قانون ساز بھی ہے پوری زندگی کے لئے احکام و قوانین بنائے ہیں۔ اسلام نے بنیادی عقائد و اعمال مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کی صحیح ادائیگی کے لئے اجتماعیت کو اوّلین شرط قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر ان عبادات کو ادا کرنے سے وہ مقاصد پورے نہیں ہوتے جو شریعت میں مقصود ہیں۔ اجتماعیت کے بغیر اسلامی احکام کی ادائیگی کا کوئی امکان نہیں۔ اسلام میں رہبانیت سے بے تعلقی کا اعلان کیا گیا ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا:۔

"وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ" (الحدید۔ ۲۷)

اور انہوں نے رہبانیت کی خود ساختہ راہ اختیار کر لی ہے ہم نے تو انہیں اس کا حکم نہیں دیا تھا۔

حدیث میں فرمایا:۔

"لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ" اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رہبانیت کی تعلیم کسی آسمانی مذہب میں بھی نہیں دی گئی جس طرح دین میں رہبانیت کیلئے کوئی جگہ نہیں اور اس کے عقائد و اعمال بھی اس سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ اسی طرح اسلام کی تفصیلی تعلیمات بھی رہبانیت کے خلاف ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس کام سے منع فرمایا جو کسی حد تک بھی رہبانیت سے ملتا جلتا یا اس کی طرف لیجانے والا تھا۔ مثلاً شادی بیاہ سے کنارہ کشی اختیار کرنا۔ ہمیشہ روزہ سے رہنا۔ خاموشی اختیار کرنا یا راتوں کو جاگتے رہنا یا ایسی عبادات اختیار کہ تاکہ ان کی بنا پر جسم راحت و آرام سے محروم ہو جائے یا جس کے نتیجہ میں اہل و عیال کو ان کے ضروری حقوق سے محروم کر دیا جائے۔

Marfat.com

ناقص دینداری کا تخیل بھی اسلام سے بہت بعید ہے۔ دین انسان کا پرائیویٹ معاملہ نہیں ہے اگر دین اسلام کا نجی معاملہ ہوتا تو اس کی تعلیمات انسان کی انفرادی زندگی تک ہی محدود ہوتیں اور اسلام میں نماز، روزہ اور اخلاقی تعلیمات کے سوا دوسرا کوئی مسئلہ ہی نہ ہوتا حقیقت یہ ہے کہ دینِ اسلام انسان کی انفرادی و اجتماعی زندگی سے متعلق ہدایات دیتا ہے۔ خدا کا ہر فرمان اور آنحضورؐ کا ہر ارشاد جزوِ دین ہے۔ ان کا کوئی حکم زائد اور غیر ضروری نہیں ہے۔ اسلام ایک کامل نظامِ زندگی ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اسلامی احکام کی اطاعت سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ پھر اسلام کو انفرادی زندگی تک محدود رکھنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام میں نہ ترکِ دنیا کی اجازت ہے نہ اس کے احکام انفرادی زندگی تک محدود ہیں۔ اس کے برخلاف وہ ایک کامل ضابطۂ حیات اور اجتماعی مسلک ہے۔ امتِ مسلمہ وہ با اصول جماعت ہے جس کا نصب العین اپنی پوری زندگی کو اسلامی اصول و ضوابط کے سانچہ میں ڈھالنا ہے۔ اسلام ٹھوس حقائق کا آئینہ دار ہے۔ اس کا پیغام عالمگیر اور دائمی ہے۔ یہ تغیرِ زمان و مکان سے بدلتا ہے۔ یہ جغرافیائی اور قومی و لسانی حد بندیوں سے آزاد ہے۔ انسانی علوم و افکار اور تجربات اس کے غیر متبدل حقائق کو بدل نہیں سکتے۔ یہ ایک ایسا کامل نظام ہے جو انسانی زندگی کے اعتقادی، فکری، اخلاقی، روحانی اور عملی پہلوؤں کو پوری طرح محیط ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ رضائے الٰہی کے لئے جینے اور اسی کے لئے مرنے کا نام اسلام ہے۔ سچا مسلمان وہ ہے جو عالمِ آخرت کو نصب العین بنائے رکھے۔ اور کسی وقت اسے نظر سے اوجھل نہ ہونے دے۔ نہ اس کے مفاد پر کسی اور مفاد کو ترجیح دے۔ یہ ایک مسلمہ بات ہے جس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں کہ اسلام کو ایک دین کی حیثیت سے قبول کرنا اخروی فلاح و نجات کا موجب ہے قرآن میں فرمایا:۔

بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ   کیوں نہیں جس نے اپنا رخ اللہ کی طرف

مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (البقرہ۔ ۱۱۲)

کر دیا (اسلام قبول کیا) اور وہ نیک نیت ہے تو اس کے لئے اس کے پروردگار کے ہاں اس کا اجر ہے۔ اور نہ اس کا کوئی خوف ہی ہوگا۔ اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔

اس آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ جو شخص کامل اخلاص اور نیک نیتی سے دین اسلام کو اختیار کرتا اور اپنی زندگی کو اس کے سانچے میں ڈھالتا ہے، وہ خدا کے یہاں اجر اور ثواب پائے گا، اور غم وہم سے ہر طرح آزاد ہوگا۔

اسلام کی دنیوی برکتیں

سوال نمبر ۱۰۱ :۔ اخروی اجر و ثواب کے علاوہ وہ کونسی دنیوی نعمتیں ہیں جن کا اسلام اپنے پیروؤں سے وعدہ کرتا ہے؟ مدلل لکھیے۔

جواب :۔ جو لوگ اسلام کی دعوت پر لبیک کہتے اور عملی زندگی میں اس کی تعلیمات کو معمول بناتے ہیں اسلام ان سے فارغ البالی اور خوشحالی کی زندگی کا وعدہ کرتا ہے۔ اسلام کا وعدہ یہ ہے کہ اس کی پیروی کرنے والے آزادی، خوشحالی، عزت و وقار اور اقبال مندی و سربلندی کی زندگی بسر کریں گے۔ انبیائے کرام اپنی اپنی امت کو یہی امید دلاتے رہے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے اسی وعدہ خداوندی کو دہرایا تھا فرماتے ہیں۔

"لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ" اگر تم نے شکر گزاری کا رویہ اختیار کیا تو تمہیں مزید انعامات دوں گا۔

موسیٰ علیہ السلام کی قوم جب تک اس روش پر گامزن رہی خدا کا یہ وعدہ پورا ہوتا رہا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کو دنیا میں بڑی عزت و شوکت اور اقتدار حاصل ہوا۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :۔

"یٰبَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ" (البقرہ ـ ۱۲۲)

اے بنی اسرائیل! میں نے تم کو جو نعمتیں دی تھیں ان کو یاد کرو اور اس بات کو بھی یاد رکھو کہ میں نے تمہیں دنیا کی سب قوموں پر برتری عطا کی تھی

جب بنی اسرائیل نے اس طرزِ واراز کو ترک کر دیا تو عزت و شوکت کے سب راستے ان پر مسدود کر دیئے گئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :۔

"وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْکَنَةُ" ان پر ذلت اور مسکینی چھا گئی۔

قرآن کریم میں فرمایا :۔

"اگر اہل کتاب تورات و انجیل پر عمل کرتے اور ان کی ہدایتوں کو اپناتے جو ان کے رب کی طرف سے بھیجی گئی تھیں تو رزق ان کے اوپر سے بھی برستا اور نیچے سے بھی ابلتا" (سورۃ المائدہ)

قرآن کریم اس ضمن میں یہ قانون بیان کرتا ہے۔

"وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ" (الاعراف ـ ۹۶)

اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ کی راہ چلتے تو ہم ان کے اوپر زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

جو لوگ ایمان و عبادت کا شیوہ اختیار کرتے ہیں ان کی شان میں فرمایا۔

"فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْیَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ" (آل عمران ـ ۱۴۸)

اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کا اجر دیا اور آخرت کا بھی بہترین اجر فرمایا۔

یہ بات کسی طرح قابلِ تسلیم نہیں کہ دنیوی انعامات کی جو بارش امم سابقہ کے صلحاء و اتقیاء پر ہوتی رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ امتِ مسلمہ کے بارے میں اپنا یہ ضابطہ بدل لیتا۔ چنانچہ اس نے اس امت سے بھی دنیوی فلاح و بہبود کا وہی وعدہ کیا جو سابقہ امتوں سے

Marfat.com

کیا تھا۔ یہ وعدہ مکہ کی زندگی میں بھی کیا جو مسلمانوں کیلئے بڑی صبر آزما تھی اور مدینہ منورہ میں بھی جہاں ہر وقت خطرہ کے بادل منڈلاتے رہتے تھے۔ دنیوی انعامات کے وعدہ میں مسلمان بھی شامل تھے اور وہ بھی جو ابھی تک دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے تھے۔ قریش مکہ کو ان الفاظ میں دعوت اسلام دی۔

"وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا"

(ہود۔ ۳)

اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی طلب کرو اور پھر اس کی طرف رجوع کرو تو وہ تمہیں زندگی کا اچھا سامان عطا کرتا رہے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ان الفاظ میں دنیوی کامیابی و کامرانی کا یقین دلایا تھا

"اگر تم میرا پیغام قبول کر لو گے تو وہ دنیا میں بھی تمہاری خوش نصیبی کا باعث ہو گا اور آخرت میں بھی"۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابو طالب سے فرمایا تھا۔

"میں تو قریش کو ایک ایسی بات کی تلقین کرتا ہوں جس کی بدولت سارا عرب ان کے سامنے سرنگوں ہو جائے گا اور سارا عجم ان کا باجگذار ہو گا۔

قرآن میں اہل ایمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِى ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا" (سورۃ نور۔ ۵۵)

اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ایماندار وں اور نیکو کاروں سے وعدہ کیا ہے کہ پہلے مومنوں کی طرح انہیں بھی ضرور زمین کی حکومت دے گا اور اپنے پسندیدہ دین کو ان کے لئے ضرور قائم کرے گا۔ اور ان کے خوف کو امن سے تبدیل کر دے گا۔

دنیا اس بات کی گواہ ہے کہ یہ وعدہ کیسے پورا ہوا۔ عرب کے بادیہ نشین گڈریے

قوموں کی قسمت کے مالک بن گئے۔ مشرق و مغرب ان کے زیر نگیں ہو گیا۔ اس آیت میں دنیوی فلاح و صلاح کے لئے ایمان اور عمل صالح کو اسی طرح شرط قرار دیا گیا ہے جس طرح اخروی نجات کے لئے ایمان و عمل شرط ہے۔ ایمان و عمل کے بغیر نہ اخروی سعادت حاصل ہو سکتی ہے اور نہ دنیوی کامیابی و کامرانی کے حصول کا امکان ہے۔

امت مسلمہ کے عروج و زوال کا انحصار اسی شرط پر ہے۔ قرآن میں فرمایا:۔

"وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ" (آل عمران۔ ۱۳۹) سست مت پڑو اور غمگین مت ہو اگر تم مومن ہو تو تم ہی بلند ہو کر رہو گے۔

مسلمانوں کے دنیا میں سرسبز ہونے اور پھلنے پھولنے کا قانون دوسری قوموں سے مختلف ہے۔ دوسری قوموں کے لئے خدا کا قانون یہ ہے کہ اگر وہ اپنی ذات میں کچھ اخلاقی اوصاف پیدا کر لیں اور ان مادی امور و اشیاء سے بہرہ ور ہوں جو ترقی کے لوازم میں سے ہیں تو ان کو دنیا میں سربلندی حاصل ہو سکتی ہے۔ مگر امت مسلمہ کے لئے صرف مادی لوازم کا حصول ترقی کی ضمانت نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ امت دنیا میں خدا کے دین کو سربلند کرنے اور دوسری قوموں کے سامنے حق کے پیغام کو پیش کرنے اور اس کی شہادت دینے کیلئے عالم وجود میں لائی گئی ہے۔ دنیا میں دوسری کوئی قوم اپنے سامنے ایسا بلند نصب العین نہیں رکھتی۔ نصب العین کے اختلاف سے حقوق اور ذمہ داریوں میں بھی فرق پڑ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ امت اپنے اوپر جو کڑی ذمہ داریاں رکھتی ہے دوسری کوئی قوم نہیں رکھتی یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اگر کوئی دوسری قوم حق کی راہ سے منحرف ہو گی تو اس کا یہ جرم اس قدر گھناؤنا اور قابل نفرت نہ ہو گا۔ اس کے مقابلہ میں اگر یہ امت اس جرم کی مرتکب ہو گی تو اس کا گناہ زیادہ شدید اور نفرت و حقارت کے لائق ہو گا۔ دوسری قومیں خدا کی نافرمان ہوتے ہوئے بھی دنیا میں خوشحال و کامران ہو سکتی ہیں مگر اس امت کو یہ رعایت حاصل نہیں اور یہ عین تقاضائے عدل و انصاف ہے اس لئے کہ جو شخص جس قدر انعامات خداوندی سے

Marfat.com

سرفراز ہوا ہے ان کی ناشکری اور ناقدردانی کی صورت میں وہ اسی قدر معتوب بھی ہوتا ہے۔

سوال نمبر ۱ :- مذہب تو دنیا سے بے رغبتی کی تعلیم دیتا ہے پھر یہ بات کس طرح درست ہے کہ مذہب پر عامل ہونے سے دنیوی فارغ البالی حاصل ہوتی ہے؟

جواب :- اسلام کی عظیم خصوصیت یہ ہے کہ یہ دیگر مذاہب کی طرح ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں دیتا۔ یہ دنیوی ساز و سامان کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ دولت و ثروت جاہ و عزت، قوت و شوکت ان میں سے کوئی چیز بھی بجائے خود اسلام میں معیوب نہیں بلکہ یہ انعاماتِ خداوندی ہیں۔ قرآن میں ان کو فضلِ الٰہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اسلام میں دین اور دنیا کی دوئی کا تصور نہیں ہے۔ دنیوی معاملات کو دین کی روشنی میں انجام دینے کا نام دین ہے۔ اسلام دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی طلب کرنے کا حکم دیتا ہے۔ قرآن میں یہ دعا سکھائی گئی ہے۔

"ربنا آتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار" — اے ہمارے پروردگار تو ہمیں دنیا اور آخرت میں بھلائی عطا کر اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ دنیا و آخرت کی بھلائی باہم لازم و ملزوم ہیں۔ آخرت کی کامیابی کا راستہ دنیا میں سے ہو کر گذرتا ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ کسی اور راستہ سے آخرت تک پہنچ جائیں۔ لہٰذا دنیوی زندگی کا راحت و آرام، اچھا لباس، اچھی خوراک، عمدہ رہائش پاکیزہ روزی اور حلال و طیب رزق۔ ان میں سے کوئی چیز بھی مذمت کے قابل نہیں۔

سورۂ مائدہ میں فرمایا:-

"اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جب اس نے تم میں سے انبیاء پیدا کئے اور تمہیں سلطنت و حکومت سے سرفراز کیا۔" (سورۂ مائدہ)

سورۂ نحل میں دنیوی راحت و آرام اور خوشحالی کی زندگی کو "انعم اللہ"

(خدا کی نعمتیں) کہا گیا ہے۔ سورۂ جمعہ میں اس کو "فضل" قرار دیا۔ ارشاد ہوتا ہے۔
"وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ" (الجمعۃ) اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب خوشحالی و فارغ البالی کی زندگی فضلِ ربی ہے تو پھر قرآن وحدیث میں طلبِ دنیا کی مذمت کیوں کی گئی ہے؟ نیز یہ بات کہاں تک صحیح ہے کہ مومنِ کامل وہ ہے جو ہمیشہ آخرت پر نگاہ رکھے اور اس کو دنیا پر ترجیح دے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن وحدیث میں جس دنیا کی مذمت کی گئی ہے وہ اور ہے اور جس کو فضلِ خداوندی کہا گیا ہے وہ دوسری چیز ہے۔ کتاب وسنت میں اس دنیا کو مذموم ٹھہرایا گیا ہے جو خدا سے غافل کر دے اور جس کے تقاضوں میں الجھ کر انسان احکامِ شریعت ادا کرنے سے قاصر رہے۔ مگر جو چیزیں شرعی احکام کی ادائیگی سے روکنے کی بجائے مددگار ثابت ہوں وہ ترک کرنے کے قابل نہیں بلکہ محبوب ومطلوب ہیں۔

قرآنِ کریم کے متعدد مقامات پر ان چیزوں کو کسی جگہ "حَسَنَۃ" کہا کہیں "حیاۃً طیبۃً" اور دوسرے مقام پر "ثوابُ الدنیا" سے تعبیر فرمایا۔ مولانا جلال الدین رومی دنیا کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

چیست دنیا از خدا غافل شدن نے قماش ونقرہ وفرزند وزن

مطلب یہ ہے کہ دنیوی ساز وسامان مثلاً سونا، چاندی اور بیوی بچوں کا نام دنیا نہیں ہے۔ دنیا یہ ہے کہ آدمی خدا سے غافل ہو جائے اور اس کی طاعت وعبادت پر کاربند نہ رہے۔ ایک مومن کے لئے وہی چیز دنیوی فلاح وبہبود کا باعث ہو سکتی ہے جو شرعی احکام کی ادائیگی سے مانع نہ ہو۔ جو چیز خدا کی اطاعت سے روک دے وہ کتنی ہی پُرکشش اور دلفریب کیوں نہ ہو ایک سچے مسلمان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ اصل بات یہ ہے کہ خدا سے غفلت اور دین سے بے تعلقی کے سوتے نفسِ انسانی سے پھوٹتے ہیں۔ کوئی چیز بذاتِ خود خدا سے غافل نہیں کرتی بلکہ وہ خود دانستہ غفلت کی تمیز ہو جاتا ہے۔ ایک

ہی چیز کے اثرات دو انسانوں پر مختلف ہوسکتے ہیں۔ ایک معمولی شخص تھوڑی سی جائداد یا دولت پاکر دین سے منحرف ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایک دوسرا شخص تخت سلطنت پر فائز ہوکر بھی دین کی ذمہ داریوں کو فراموش نہیں کرتا۔ مسلم سلاطین و خلفاء وقت کی عظیم ترین سلطنتوں کے حکمران ہونے کے باوجود خدا سے غافل نہ ہوسکے اس لئے یہ حقیقت ہے کہ دولت و ثروت یاقوت و شوکت میں سے کوئی چیز بھی بذات خود قابل احتراز نہیں۔ دراصل انسان کا غلط طرز عمل اور طرز فکر ہی اس کو دین کی راہ سے برگشتہ کر دیتا ہے۔ چونکہ مومن خدا کی دی ہوئی نعمتوں کو کبھی بھی غلط طریقہ سے استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ ان کو رضائے الٰہی کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس لئے دنیوی انعامات ایک سچے مسلم کے لئے مذموم نہیں بلکہ محبوب و مطلوب ہیں۔

آخرت کو دنیا کے مقابلہ میں ترجیح دینے کا یہ مطلب نہیں کہ دنیا کو بالکل ہی ترک کر دیا جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کو طلب کرتے وقت یا اس کے حصول کے بعد اس کو استعمال کرتے وقت دین کے تقاضوں کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ دنیوی امور کو اس طریقہ سے انجام دیا جائے کہ اخروی مفاد کو ٹھیس نہ لگے۔ شرعی حدود میں محدود رہ کر دنیا سے استفادہ کیا جائے۔ آخرت کو دنیا کے مقابلہ میں ترجیح دینے کے ساتھ ساتھ مومن کے لئے دنیوی فلاح و کامرانی کی راہ بھی کھلی ہے۔ اسلام نے جہاں مومن کا اصلی نصب العین آخرت قرار دیا وہاں اخروی فلاح کا جو راستہ بتایا وہ دنیوی کامیابیوں سے کترا کر نہیں جاتا بلکہ دنیا کے اندر سے ہوکر گذرتا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دی جائے۔ مگر فائدہ دنیا سے بھی حاصل کیا جائے اور اپنے آپ کو اس سے محروم نہ رکھا جائے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ انسان کو اس دنیا میں خدا کا خلیفہ و نائب بنا کر بھیجا گیا ہے۔ خلیفہ خداوندی ہونے کے اعتبار سے اس خطہ ارضی پر انسان کا منصب یہ ہے کہ وہ زمین کا انتظام سنبھالے اور اسے اپنے مالک کی رضامندی و خوشنودی کے مطابق چلائے۔ ان تفصیلات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ دنیوی جاہ و عزت اور دولت و اقتدار ہرگز ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے تعلق نہ رکھنا اور فائدہ اٹھانا دین و ایمان کے منافی ہو۔ اس لئے تمام چیزیں جو "اللہ کا فضل" اور اس کی "نعمت" ہوں وہ اس کے نیک بندوں کے لئے ممنوع قرار ہو

Marfat.com

سکتی۔ اللہ تعالےٰ فرماتے ہیں۔

"قُلْ هِيَ لِلَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ" (الاعراف۔۳۲)

فرما دیجئے کہ یہ سب چیزیں دنیا کی زندگی میں (دراصل) اہلِ ایمان ہی کے لئے ہیں اور قیامت کے دن تو خالص انہی کے لئے ہوں گی۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے اصل حقدار اللہ کے فرمانبردار بندے ہی ہیں پھر یہ چیزیں ان کے ناپسندیدہ کیونکر ہوسکتی ہیں۔ یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ خلیفۂ خداوندی ہونے کے تقاضے کیا ہیں؟ جب اللہ تعالیٰ نے اس لئے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے کہ وہ اس کے احکام کے مطابق اپنے اختیارات استعمال کرے۔ اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اپنے اس فرض کا احساس رکھنے والے لوگوں کی موجودگی میں زمین کا اقتدار ان لوگوں کو عطا کیا جائے جو اس فرضِ منصبی کے منکر ہیں اور اپنے آپ کو خدا کا نائب تسلیم ہی نہیں کرتے۔ یہ بات حکمتِ خداوندی اور اس کے عدل و انصاف سے بہت بعید ہے۔ کہ زمین کا اقتدار ان لوگوں کو سونپا جائے جو اس کائناتِ ارضی پر خدا کی حاکمیت کی بجائے کسی اور کی حکومت قائم کرنے کے خواہاں ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

"اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ" (الانبیاء۔۱۰۵)

زمین کے وارث میرے نیک بندے ہی ہوں گے۔

یہ پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ خدا کے فرمانبردار بندے بذاتِ خود بھی خلافتِ ارضی کے کاموں سے بے نیاز نہیں ہوسکتے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو اپنے فرضِ خلافت کی ادائیگی سے قاصر رہیں گے۔ حالانکہ یہ ان کی زندگی کا حاصل ان کا اولین فرض بلکہ ان کی زندگی کا مقصدِ وجود ہے۔ خلافتِ ارضی کے تعلقات کا انجام دینا ان کے لئے ایک پسندیدہ فعل ہی نہیں ایک اہم فریضہ بھی ہے۔ ان تفصیلات سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے۔ کہ مسلمان صرف اخروی فلاح ہی کا نہیں بلکہ دنیوی کامرانی و شادمانی کا بھی حقدار اور طلبگار ہوتا ہے۔

اسلام کی امتیازی خصوصیات اور ان کا تقاضا

سوال نمبر ۹۰۱۔ اسلام کی امتیازی خصوصیات قلمبند کیجئے۔

جواب:۔ سابقہ مباحث سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آچکی ہے کہ اسلام دوسرے تمام مذاہب سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دین کامل ہے کہ جس میں کوئی کمی اور نقص نہیں پایا جاتا ہے۔ یہ پوری کائنات کے لئے خدا کا آخری پیغام ہے۔ اخروی نجات حاصل کرنے کے لئے اس کی پیروی ضروری ہے۔ خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی جامع و کامل دعوت کے بعد اب کسی نبی کی ضرورت نہیں یہ ہدایت دائمی ہے۔ اور ہر زمان و مکان کے لئے کافی ہے۔ اب ذیل میں تفصیلاً اسلام کی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں۔

۱۔ عالمگیر نبوت:۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم عالمگیر نبوت لیکر تشریف لائے تھے۔ آپؐ کی رسالت زمان و مکان کی تنگنائیوں میں محدود نہیں۔ آپ کسی خاص خطۂ ارضی کسی خاص سرحد یا کسی خاص قوم کے لئے نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے بلکہ آپ پوری کائنات کے لئے خدا کا آخری پیغام لے کر مبعوث کئے گئے تھے۔ قرآن کریم میں فرمایا۔

"وَمَا أَرْسَلْنٰكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا" (سورہ سبا۔ ۲۸) ہم نے آپؐ کو تمام لوگوں کے لئے خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اس کا اعلان کیا تھا۔

"يٰأَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعًا" (الاعراف۔ ۱۵۸) لوگو! میں تم سب کے لئے اللہ کا رسول ہوں۔

یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس میں آپؐ تمام سابقہ انبیاء سے منفرد تھے۔ ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا۔

"كَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلٰى قَوْمِهِ خَاصَّةً وَبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ عَامَّةً" (بخاری و مسلم) مجھ سے پہلے ہر نبی کو اس کی مخصوص قوم کی طرف نبی بنا کر بھیجا جاتا تھا لیکن مجھے

تمام لوگوں کے لئے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

۲۔ ابدی نبوت :- آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت جسطرح عالمگیر ہے اسی طرح ابدی اور دائمی بھی ہے۔ آپؐ کی ذات پر رسالت ونبوت کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا اب قیامت تک کوئی نیا رسول پیدا نہیں ہوگا۔ قرآن میں فرمایا۔

"وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ" (الاحزاب - ۴۰)
بلکہ وہ اللہ کے رسولؐ اور انبیاءؑ کے سلسلہ کو ختم کرنے والے ہیں۔

اس ضمن میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے الفاظ ہیں۔

"خُتِمَ بِيَ الْبُنْيَانُ وَخُتِمَ بِيَ الرُّسُلُ" (بخاری و مسلم)
مجھ سے قصرِ نبوت کی تکمیل ہوگئی اور میرے ذریعہ رسولوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

۳۔ دین کامل :- یہ دین ہر لحاظ سے کامل ہے اس میں کوئی خامی اور نقص نہیں۔ سابقہ شریعتوں میں سے کسی کو بھی یہ امتیاز نہیں ملا یہ شرف اللہ تعالیٰ نے صرف اسلام کے لئے مخصوص کر رکھا تھا کہ وہ دین کامل ہو۔ قرآن کریم میں فرمایا۔

"اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا" (المائدہ - ۳)
لوگو! آج میں نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور دین کی حیثیت سے تمہارے لئے اسلام کو پسند کر دیا

اس آیت سے یہ حقیقت واشگاف ہوتی ہے کہ دینِ اسلام ہر لحاظ سے اتم واکمل اور خدا کا پسندیدہ دین ہے۔ جس میں کوئی خامی اور کوتاہی نہیں پائی جاتی۔ اس سے پہلے جتنے مذاہب بھی تھے وہ کسی نہ کسی طرح محدود و مقید تھے۔ مثلاً کسی خاص قوم تک یا مخصوص سرزمین تک یا متعین زمانہ تک جسطرح ان [illegible] کے مخاطبین کا دائرہ محدود تھا اسی نسبت سے اس کی تعلیمات میں بھی زیادہ وسعت نہ تھی جب مشیتِ ایزدی کا تقاضا ہوا کہ ایک ہمہ گیر پیغام بھیجا جائے۔ جو ابدی ہو اور پوری کائنات کے لئے ہو تو اس فیصلے کے پیشِ نظر ایسے دین کا نازل کرنا ضروری تھا جس کا مزاج بین الانسانی ہو۔ اور اس کی تعلیمات ہر زمانہ ہر ملک اور ہر طرح کے انسانی مسائل پر حاوی ہوں مذکورہ

Marfat.com

صدرِ آیت اسی فطری ضرورت کی تکمیل کا پتہ دے رہی ہے۔

۲۔ حفاظتِ قرآن:۔ دینِ اسلام کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کتاب اتاری گئی وہ چودہ صدیاں گذرنے کے باوجود ہر لحاظ سے محفوظ ہے اور محفوظ رہے گی۔ یہ کتاب لاکھوں حفاظ کے سینہ میں محفوظ ہے۔ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اس کے اتارنے والے نے لیا ہے۔ اس کتاب کی زبان ایک زندہ و پائندہ زبان ہے۔ کروڑوں انسان دنیا کے گوشہ گوشہ میں اسے بولتے، پڑھتے اور سمجھتے ہیں یہ کتاب اس باب میں منفرد اور یگانہ ہے۔ دنیا کی کوئی کتاب ان صفات سے موصوف نہیں۔ یہ کتاب چودہ سو سال سے کائناتِ ارضی پہ بسنے والے انسانوں کو چیلنج دیتی آ رہی ہے کہ جو مجھے کلامِ ربانی نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ یہ انسانی کلام ہے وہ ایک چھوٹی سی سورت ہی بنا لائیں۔ مگر آج تک کوئی شخص اس کے چیلنج کو قبول نہیں کر سکا۔ عربوں میں بڑے بڑے خطیب و ادیب قسم کے لوگ موجود تھے جو اپنی فصاحت و بلاغت کے مقابلہ میں دوسروں کو عجم (گونگ) کہہ کر پکارتے تھے مگر قرآنی بلاغت نے ان کو مہر بلب کر دیا۔

یہ اسلام کی چند خصوصیات ہیں ورنہ اس کی تفصیل کے لئے دفتر درکار ہیں۔

سوال نمبر ۱۰۹:۔ دینِ اسلام جن امتیازی خصوصیات سے بہرہ ور ہے ان کے تقاضے کیا ہیں؟ تفصیل سے لکھئے۔

جواب:۔ دینِ اسلام کی یہ خصوصیات اپنے ساتھ کچھ لازمی تقاضے بھی رکھتی ہیں۔ ان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

۱۔ نسخِ ادیانِ سابقہ:۔ اسلام کی امتیازی حیثیت کا پہلا فطری تقاضا یہ ہے کہ تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں۔ اب خدا کا پسندیدہ دین صرف اسلام ہے۔ قرآن کریم میں آیا ہے۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ — بے شک اللہ کے نزدیک مقبول دین صرف اسلام ہے۔

(آل عمران۔ ۱۹)

اس آیت کی روشنی میں یہ ضروری ٹھہرتا ہے کہ ہر قوم ہر ملک اور ہر زمانے

Marfat.com

لوگ صرف اسلام ہی کی پیروی کریں۔ قرآن میں فرمایا

"وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ" (آلِ عمران۔ ۸۵)

اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا تو اللہ کے یہاں اس کی طرف سے یہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

چونکہ یہ دین پوری کائنات کے لئے نازل کیا گیا اور اس کے لانے والے کو پوری نوعِ انسانی کے لئے رسول قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا نہ اب کسی نئے دین کی گنجائش ہے نہ نئے پیغمبر کی ضرورت۔ رسول دنیا میں اس لئے آتا ہے کہ لوگ اسے خدا کا فرستادہ مانیں اور بلا توقف اس کے احکام کی پیروی کریں۔ قرآن میں فرمایا۔

"وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّٰهِ" (النساء۔ ۶۴)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا صرف اس لئے بھیجا کہ خدا کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے

۲۔ آپؐ کی رسالتِ عامہ پر ایمان: آنحضورؐ کی عالمگیر رسالت اور خاتم الانبیاء ہونے کا تقاضا ہے کہ ہر زمانے کا انسان آپؐ پر ایمان لائے اور آپؐ کے لائے ہوئے دین کو اپنا دین مان کر اس کی پیروی کرے۔ جو شخص آپؐ کی رسالت کو تسلیم نہیں کرتا وہ آپؐ کا نافرمان نہیں۔ بلکہ اس خالقِ کائنات کا باغی ہے۔ جس نے آپؐ کو پوری دنیا کا رہنما و پیشوا بنا کر بھیجا۔ آپؐ کے عمل سے بھی عیاں ہوتا ہے کہ دورِ حاضر میں اسلام ہی کی پیروی لازم ہے۔ اگر قرآن کے نزدیک موجودہ دور کے سب مذاہب سچے ہوتے اور کسی ایک نبی کی پیروی اخروی فلاح و نجات کی ضامن ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہود و نصاریٰ کو اسلام کی دعوت نہ دیتے کیونکہ ان کے پاس ایک آسمانی کتاب موجود تھی۔ اور وہ ایک سچے نبی کے پیرو ہونے کے دعویدار تھے۔ اور اگر دعوت دیتے بھی تو غالباً ان کو اسلام لانے کے لئے نہ کہتے بلکہ تورات و انجیل کی سچی پیروی کا حکم دیتے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ آپؐ نے اہلِ کتاب کو اسی طرح اسلام کی دعوت دی جس طرح مشرکینِ عرب کو آپؐ نے ان کیلئے اپنی پیروی کو اسی طرح لازم قرار دیا جس طرح مشرکین کے لئے آپؐ کی اطاعت ضروری تھی۔ قرآن میں فرمایا۔

"یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ آمِنُوْا
بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَکُمْ مِّنْ قَبْلِ
اَنْ نَّطْمِسَ وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا
عَلٰٓی اَدْبَارِهَآ اَوْ نَلْعَنَهُمْ"
(سورہ نساء ۴۷)

اے اہل کتاب! اس کتاب پر ایمان لاؤ جسے
ہم نے اتارا ہے جب کہ وہ اس کتاب کے
عین مطابق ہے جو تمہارے پاس ہے اس سے
پہلے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں اور انہیں پیچھے
کی طرف پھیر دیں یا ان پر لعنت کریں۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل کتاب کو نہ صرف دعوتِ اسلام دی بلکہ جن لوگوں نے آپؐ کی دعوت پر لبیک نہیں کہا تھا انہیں صریح الفاظ میں کافر ٹھہرایا۔ بلکہ بعض جگہ ان کے انکارِ اسلام کو "بدترین کفر" اور انہیں "پکا کافر" کہہ کر پکارا۔ قرآن میں فرمایا:

"جو لوگ اللہ کے ساتھ اور اس کے پیغمبروں کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔ اور اللہ اور اس کے پیغمبروں کے درمیان تفریق کرنا چاہتے اور کہتے ہیں کہ ہم بعض پیغمبروں کو مانیں گے اور بعض کو نہ مانیں گے (اور اس طرح کفر و ایمان کے درمیان کوئی راہ اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ پکے کافر ہیں ایسے کافروں کے لئے ہم نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے" (سورۂ نساء ۱۵۰-۱۵۱)

اہل کتاب کے انکارِ اسلام پر ایک جگہ قرآن میں یوں تبصرہ کیا گیا ہے:

"اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کتاب پر ایمان لاؤ جسے اللہ نے اتارا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتاری گئی تھی اور اس طرح وہ ہدایاتِ خداوندی کو تسلیم کرنے سے انکار کر جاتے ہیں" (البقرہ)

دعوتِ اسلام کے جواب میں اہل کتاب یہ طرزِ استدلال اختیار کرتے ہیں کہ آخر ہمارے پاس بھی تو آسمانی کتاب ہی ہے پھر اس کی پیروی کیوں نہ کریں؟ کیا اس کی اطاعت میں فلاح و نجات نہیں؟ آخر اس کتاب کے ہوتے ہوئے ہمارے لئے کسی اور کتاب کی اطاعت کیسے ضروری ہو گئی؟ جب کہ یہ کتاب اپنی جگہ سچی ہے اور مسلمانوں کی کتاب اپنی جگہ برحق ہے قرآن نے ان کے اس فلسفہ کو کفر کا فلسفہ اور باطل استدلال قرار دیا۔ قرآن اہل کتاب کے اس اندازِ فکر کو ٹھکراتا ہے کہ "یہ بھی حق وہ بھی حق"

۲۔ قرآن کا ناسخ الکتب ہونا: جب اس کرۂ ارضی پر سرے سے ایسی کوئی آسمانی کتاب

Marfat.com

ہی موجود نہیں جو تغیر و تبدل سے پوری طرح محفوظ ہو اور جس کی زبان زندہ و پائندہ ہو تو پھر دوسری شریعتوں اور کتابوں کی پیروی کیونکر ممکن ہے؟ ان کتابوں کا غیر محفوظ ہونا بذات خود اس بات کا اعلان ہے کہ اب وہ قابلِ اطاعت نہیں رہیں۔ ان کی اطاعت کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اور اب وہ منسوخ ہیں۔

جب ہر شخص کے لئے اسلام ہی کی پیروی ضروری ٹھہری اور اس کے سوا کوئی اور دین خدا کا پسندیدہ دین نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلام کی پیروی کے سوا کسی شخص کی نجات ممکن نہیں۔ جب پہلی شریعتیں خدا نے منسوخ کر دی ہیں تو اب ان کی پیروی پر اجر و ثواب دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فیصلے کا اعلان ان الفاظ میں کر دیا ہے "وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ" ایسا شخص آخرت میں ناکام رہے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس فیصلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔

"اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے جس شخص تک میری رسالت کا پیغام پہنچا اور اس کے باوجود وہ میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مر گیا تو وہ دوزخی ہوگا۔" (صحیح مسلم)

جب یہود و نصاریٰ پر اہلِ کتاب اور ایک آسمانی دین کے حامل ہونے کے باوصف آپ کی دعوت پر ایمان لانا ضروری ہے تو جو قومیں سرے سے آسمانی کتاب اور دین کو مانتی ہی نہیں۔ ان کے لئے آپؐ کی اطاعت اور بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اقوام عالم میں سے صرف یہود و نصاریٰ ہی وہ دو گروہ ہیں جن کو قرآن نے اہلِ کتاب کہہ کر پکارا ہے۔ جب اہل کتاب کیلئے آپ کی رسالت پر ایمان لانا شرطِ نجات ہے تو دوسری قوموں کے لئے جو اہلِ کتاب نہیں یہ فریضہ اور بھی زیادہ ضروری ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ اسلام نے دو ٹوک اور غیر مبہم الفاظ میں اپنی پیروی کو پوری انسانیت کے لئے مدارِ نجات قرار دیا ہے۔ صرف وہ شخص اس حکم سے مستثنیٰ ہے جس تک اسلام کی دعوت ہی نہ پہنچی ہو۔ دعوتِ اسلام کو ہر شخص تک پہنچانا اور شہادتِ حق دینا امتِ مسلمہ کی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ کرۂ ارض کے گوشہ گوشہ تک خدا کا پیغام پہنچا دیں۔

Marfat.com

امتِ مسلمہ کی ذمہ داریاں

ڈالئے۔
سوال نمبر ۱۱:۔ امتِ مسلمہ کے فرائض اور ذمہ داریوں پہ روشنی
کامل اور آخری دین ہے
جواب:۔ یہ امر اظہر من الشمس ہے کہ دینِ اسلام ایک ہمہ گیر
جس کی ہدایات و تعلیمات پوری انسانیت کے لئے ہیں۔ اس کی اطاعت مدارِ نجات ہے اخروی
فلاح و بہبود کا انحصار صرف اسی کی پیروی پر ہے۔ اسلام کی اس امتیازی حیثیت کا تقاضا ہے
کہ اس کی دعوت کو عام کرنے کیلئے سعی و جہد کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے۔ اس کے
پیغام کو دنیا کے چپہ چپہ میں پھیلانے کی کوشش کی جائے۔ دنیا کی ہر قوم تک اس کا پیغام پہنچایا
جانا چاہیئے۔ کوئی فرد اس کی دعوت سے بیگانہ نہ رہنے پائے۔ اس لئے کہ جو شخص اس کے
پیغام سے آشنا نہ ہوگا۔ وہ اس پر ایمان کیونکر لائے گا۔ ایمان سے پہلے پہچان کی ضرورت
ہے۔ یہ بات بعید از انصاف ہے کہ جو شریعت دنیا میں پھیلانے اور ہر جگہ پہنچانے کے لئے
آئی ہے وہ لوگوں کے لئے راز سربستہ بنی رہے اور انہیں بے خبری میں پکڑ لیا جائے۔
اگر انسانیت پر اسلام کی پیروی ضروری ہے تو پیروی سے قبل اس سے آگاہی لازم ہے
اگر دعوتِ اسلام کو پھیلانے کا کما حقہ اہتمام نہ کیا جائے تو اسلام بیگانہ ہو کر رہ جائے گا جو اس
پر ظلم ہے اور اگر انسانیت کو اسلامی دعوت سے آگاہ کرنے کی فکر دامنگیر نہ ہو تو اس عظیم نعمت
سے اس کی محرومی یقینی ہے جو ظلم سے کسی طرح کم نہیں۔
جب تک داعی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم بقیدِ حیات رہے امکانی حد تک اشاعتِ اسلام کا
اہتمام کرتے رہے۔ آپ کے بعد بھی اسلام اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس کا یہ ضروری حق ادا
کیا جاتا رہے۔ اسلام تا قیام قیامت اس فرض کی ادائیگی کا مطالبہ کرتا رہے گا۔ اب تو رسالت و
نبوت بھی ختم ہو چکی ہے۔ کوئی نبی آکر بھی یہ فریضہ ادا نہیں کرے گا۔ اشاعتِ اسلام کا سوال،
امتِ مسلمہ کے لئے ایک بڑا نازک مسئلہ ہے۔ اسلام اگر خدا کا بھیجا ہوا دین ہے اور اسے ساری
دنیا کے لئے اور ہمیشہ کے لئے بھیجا گیا ہے تو اس مسئلے کا کوئی حل نکالنا چاہیئے۔ قرآن کریم

Marfat.com

اس عظیم مسئلہ کا حل ان الفاظ میں پیش کرتا ہے۔

"وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا" (البقرہ۔ ۱۴۳)

اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک درمیانی امت بنایا ہے تاکہ تم دوسرے تمام لوگوں کیلئے شاہد ہو اور ہمارا رسول تمہارے لئے شاہد ہے۔

اس آیت کی روشنی میں اس حل کی عملی شکل یہ قرار پاتی ہے کہ:-

۱۔ اشاعتِ اسلام کا جو کام حضور بہ نفسِ نفیس کرتے تھے اب وہ مسلمانوں کے ذمے ہو گیا ہے۔ یہ لوگ جب تک اس کرۂ ارض پر موجود ہیں اس کام کے ذمہ دار ہیں۔

۲۔ اسلام کو دوسروں تک پہنچانے کا مطلب صرف عام طرز کی تبلیغ ہے جسے "شہادت" کہا جا سکتا ہے۔

۳۔ اسلام کی شہادت دینے کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام کو لوگوں تک بالکل اسی طرح پہنچایا جائے جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ تک اس کے پہنچانے کا انتظام کیا تھا۔

مذکورہ صدر بیان سے واضح ہوا کہ امم سابقہ پر صرف ایک ہی ذمہ داری تھی کہ کامل خلوص کے ساتھ اپنے دین کی پیروی کرتی رہیں۔ امتِ مسلمہ اس عام ذمہ داری کے ساتھ ایک اور ذمہ داری بھی رکھتی ہے اور وہ یہ کہ بیرونی دنیا کے سامنے اسلام کی اس طرح گواہی دیتی رہے جس طرح گواہی دینے کا حق ہے۔ چونکہ یہ امت مجموعی حیثیت سے اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے اس لئے اس کی زندگی کا مشن وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔

امتِ مسلمہ کی یہ ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ ذمہ داری اسی قدر اہم ہے کہ وہی اس امت کا مقصدِ وجود بھی ہے۔ قرآن میں فرمایا۔

"كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ"

تم ایک بہترین امت ہو جو سارے انسانوں کی اصلاح کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ باقی امتوں کی طرح یہ ایک عام امت نہیں ہے۔

Marfat.com

بلکہ ایسی امت ہے جو ساری نوعِ انسانی کی رہنما اور پوری انسانیت کی پیشوا بنائی گئی ہے یہ اس امت کی زندگی کا اولین مقصد بھی ہے اور آخری بھی۔ اسی امت کی وقعت و اہمیت اس فریضہ کی ادائیگی سے وابستہ ہے۔ یہ جب تک دنیا کے سامنے حق کی گواہی دیتی رہے گی اس وقت تک "خیر امت" اور "امتِ وسط" رہے گی۔ ورنہ ان القاب و آداب سے یکسر محروم ہو جائے گی۔ اس لئے کہ یہ صفاتی نام اس امت کو اپنی ذمہ داریوں کی بنا پر دیئے گئے ہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا:۔

"اس نے تمہیں منتخب کیا ہے اور تمہارے لئے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔ اپنے باپ ابراہیم کے راستہ کی پیروی کرو۔ اس نے پہلے ہی تمہارا نام مسلم رکھا ہے تاکہ رسولؐ تمہارے لئے (دینِ حق کا) شاہد ہو اور تم دوسرے لوگوں کے لئے شاہد بنو" (الحج ۔ ۷۸)

اس آیت میں جہاں امتِ مسلمہ کا نام اور مقام بتایا وہاں اس کے مشن سے بھی آگاہ کیا جو اس کو تفویض کیا گیا ہے۔ یہ جب تک اس فریضہ کو انجام دیتی رہے گی اس نام سے موسوم رہے گی۔ یہ اس عظیم فریضہ کی ادائیگی کے لئے خدا کے حضور جواب دہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بارگاہِ ربانی میں جہاں ایک مسلمان کو اپنی انفرادی ذمہ داریوں کے بارے میں جواب دہی کرنی ہوگی وہاں پوری امت کو بحیثیت مجموعی (اجتماعی جواب دہی بھی) کرنی پڑے گی۔ یہ اسی قسم کی جواب دہی ہے جیسے انبیاء بحیثیت نبی ہونے کے خدا کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔ گویا یہ ایک پیغمبرانہ مسئولیت ہے۔ اس لئے کہ گو امتِ مسلمہ اصطلاحاً نبی نہیں مگر پیغمبری کی ذمہ داری (تبلیغ) ضرور رکھتی ہے۔ قرآن میں فرمایا:۔

"فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِيْنَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ"

جن لوگوں کی طرف پیغمبر بھیجے گئے ہم ان سے بھی سوال کریں گے اور پیغمبروں سے بھی حساب لیں گے۔

(الاعراف ۔ ۶)

شہادتِ حق

سوال نمبر ۱۱۱:۔ جس "شہادتِ حق" کو امتِ مسلمہ اور انبیاءؑ پر فرض کیا گیا ہے اس

کی حقیقت بیان کیجئے۔

جواب :۔ شہادت کے لغوی معنی یہ ہیں کہ جو بات کسی کو یقینی طور سے معلوم ہو وہ صحیح طور پر دوسروں کو بتا دے۔ دین حق کی شہادت کا لغوی و عرفی مفہوم یہ ہے کہ لوگوں پر ٹھیک ٹھیک اسلام کو واضح کر دیا جائے۔ اصطلاحی اعتبار سے شہادت حق کے مفہوم میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مقدسہ کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ شہادت حق کے دو پہلو ہیں۔

(الف) قولی شہادت :۔ قولی شہادت کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی عقائد و احکام کو پوری دنیا کے سامنے اس وضاحت و صراحت کے ساتھ بیان کیا جائے کہ اس میں کوئی ابہام باقی نہ رہے اور اس کی صداقت ہر ایک پر واضح ہو جائے۔ یہاں تک کہ غیر مسلم بھی اپنے مسلک کی غلطی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوں۔ اور اسلام کو قبول کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ قولی شہادت کے لئے مندرجہ ذیل باتوں کی ضرورت ہے

۱۔ اسلام کی صداقت و حقانیت عقلی دلائل کی روشنی میں واضح کی جائے۔ اسلام کے بنیادی مسائل مثلاً توحید، رسالت اور آخرت وغیرہ کو فطرت و وجدان کی شہادت سے مبرہن و مدلل کیا جائے اور بتایا جائے کہ اسلام انسانی زندگی کے تمام شعبہ جات کیلئے واضح ہدایات دیتا اور ایک مکمل لائحہ عمل پیش کرتا ہے۔

۲۔ اسلام کی صداقت کو واضح کرنے کے لئے ضروری ہے کہ بنظر غائر دیگر مذاہب ان کے افکار و آراء اور نتائج کا مطالعہ کر کے ان پر بھرپور تنقید کی جائے۔ جب تک غیر مذاہب کے نظریات کو تنقید کے نشتروں سے چھلنی نہ کیا جائے اسلام کی صداقت واضح نہیں ہوتی اس لئے غیر اقوام پر اسلام کی خوبیوں کو اجاگر کرنے کے لئے تنقید کے مرحلہ سے گذرنا از بس ضروری ہے۔

۳۔ اسلام کی تائید اور دیگر مذاہب کی تردید کے لئے مناظرانہ و معاندانہ طرز بیان کی بجائے دل نشین اور شیریں طرز و انداز اختیار کیا جائے۔ طرز استدلال اور انداز بیان ایسا ہو جو اذہان و قلوب کو اسلام کی طرف مائل کر سکے۔ گفتگو کا انداز ایسا ہو جس سے

Marfat.com

آج کل کے لوگ مانوس ہیں۔ دلائل میں ایسی معقولیت ہو جسے سائنس بھی تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہو۔ اس لئے کہ یہ کوشش جدل وبحث کی خاطر نہیں بلکہ دین حق کا نام روشن کرنے اور اس کا بول بالا کرنے کے لئے ہے۔ قرآن کریم نے دعوت اسلام کے لئے انتہائی معقول طریق بحث اور نہایت مانوس ومعیاری زبان وبیان اور طرز استدلال اختیار کیا ہے۔

۳۔ تبلیغ میں حکمت ومصلحت شیریں طرز ادا اور دل نشین پیرایۂ بیان کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔ یہ پیغمبرانہ طرز دعوت وارشاد ہے۔ قرآن میں فرمایا۔

"اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ"

اے پیغمبر! اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور بہترین نصیحت کے ساتھ بلائیے اور بہت اچھے طریقہ سے بحث کیجئے۔

۴۔ مبلغ میں خلوص کا جذبہ کارفرما ہو۔ جو بات کہی جائے شفقت ومحبت خیر خواہی اور احساس فرض کے پیش نظر کہی جائے۔ دعوت وارشاد میں کبر وغرور، حریفانہ اکھاڑ پچھاڑ اور مناظرانہ ذوق کا کوئی شائبہ نہیں ہونا چاہیئے۔

(ب) **عملی شہادت:** عملی شہادت کا مطلب یہ ہے کہ مبلغ منہ سے جو بات کہے عمل سے اس کی تائید پیش کرے۔ وہ صرف گفتار ہی کا غازی نہ ہو بلکہ کردار کا بھی دھنی ہو۔ امت کے افراد اپنی انفرادی حیثیت میں اور پوری امت اجتماعی طور پر اسلام کا عملی نمونہ ہو۔ اسلام کے افکار وعقائد ان میں رچے بسے ہوتے ہوں اور ان کی صداقت ان کی ایک ایک ادا سے ٹپک رہی ہو۔ ان کی زندگی کا ایک ایک شعبہ اسلام کی ترجمانی کر رہا ہو۔ عملی شہادت کا درجہ قولی شہادت سے بڑا ہے۔ جب تک کوئی شخص یا گروہ دین کی کسی بات پر عمل نہ کر رہا ہو اسے کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ وہ دوسروں کو اس کا حکم دے۔ ایسا شخص اگر حکم دے گا بھی تو اس کی کوشش نتیجہ خیز ثابت نہ ہوگی۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ جب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام کا آغاز کیا تو اس وقت آپ پیکر ایمان و ایقان بن چکے تھے۔ جب دوسروں کو خدا کا حکم سنایا تو اپنا سر نیاز سب سے پہلے جھکا دیا۔ اس ضمن میں آنحضور کے الفاظ یہ ہیں۔

Marfat.com

"اَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِیْنَ" میں سب سے پہلا ایمان لانیوالا ہوں

"اَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ" میں سب سے پہلا اطاعت کرنیوالا ہوں

آنحضورؐ کے ان ارشادات سے یہ حقیقت اجاگر ہوتی ہے کہ آپؐ کوئی بات کہنے سے پہلے خود اس پر عمل پیرا ہوتے تھے۔

یہ امر انسان کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ پسماندہ و درماندہ اقوام کے طریق زندگی ان کے طرز فکر و نظر اور ان کے فکر و فلسفہ کو وقعت و اہمیت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ اقوام عالم کو اسلام کا گرویدہ بنانے کے لئے ضروری ہے کہ مسلمان علمی و اقتصادی ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے پیچھے نہ رہیں۔ دورِ حاضر میں مسلمانوں کی درماندگی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان میں جذبۂ عمل اور جہد و سعی کا فقدان ہے۔ سہل انگاری و تغافل شعاری ان کی رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے جب تک مسلمان ان عاداتِ قبیحہ کو ترک نہیں کریں گے نہ ان کو دنیا میں فلاح و صلاح حاصل ہوگی نہ اخروی نجات و سعادت سے بہرہ ور ہو سکیں گے۔ مسلمان خود درماندہ و پسماندہ رہیں گے اور ان کی وجہ سے اسلام بھی رسوا ہوتا رہے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دوسری قوموں کے لئے اسلام میں کوئی کشش باقی نہیں رہے گی بلکہ خود مسلمان بھی جادۂ اسلام سے منحرف ہو کر اپنے لئے زندگی کی نئی راہیں تلاش کرنے لگیں گے۔ یہی چیز ہے جو دورِ حاضر میں مسلم معاشرہ کو بربادی کے جہنم میں دھکیل رہی ہے مسلمان اسی وقت شہادتِ اسلام کا حق ادا کر سکتا ہے جب ہمت، جہد و سعی اور انہماک سے کام لے کر اپنے لئے ایک نئی راہ نکال لے۔

موانع اور ان کا سدِ باب

سوال نمبر ۱۱۲:۔ شہادتِ حق کے سلسلہ میں جو موانع پیش آتے ہیں انہیں دور کرنے کیلئے اسلام کیا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے تفصیلاً لکھیئے۔

جواب:۔ کائناتِ ارضی خیر و شر کی رزم گاہ ہے۔ یہاں بھلائی اور برائی کی دونوں

Marfat.com

قوتیں دنیا میں پھلتی پھولتی اور آزادی سے نشو و نما پاتی ہیں۔ ان میں تصادم بھی ہوتا رہتا ہے یہ دونوں باہم برسرِ پیکار رہتی ہیں اور ایک دوسرے کو مغلوب کرنے کے لئے قوت آزمائی کرتی رہتی ہیں اس لئے کچھ بعید نہیں کہ کسی وقت شر غالب ہو کر اسلام کا راستہ روک لے اور تبلیغ و اشاعت کی سب راہیں مسدود کر کے اس کو دنیا میں پہنچنے نہ دے۔ ہر دعوت کی تاریخ میں ایسے مواقع آتے رہتے ہیں۔

دعوتِ اسلام میں حائل ہونے والی ان رکاوٹوں کو دور کرنا ضروری ہے۔ اگر ان مشکلات کو دور نہ کیا جائے تو تبلیغ اسلام کا راستہ ہمیشہ کے لئے مسدود ہو جائے۔ اشاعتِ اسلام کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے جو کوشش کی جاتی ہے۔ اس کو "جہاد فی سبیل اللہ" کہتے ہیں۔ جہاد کے معنی ہیں کوئی کام انجام دینے کے لئے بھرپور کوشش کرنا اور اپنی ساری طاقت صرف کر دینا۔ خدا کی راہ میں جہاد کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ صرف رضائے تعالیٰ، اس کے دین کی پیروی اور شہادت کا حق ادا کرنے کے لئے وہ سب کچھ کر ڈالا جائے جو انسان کے بس میں ہو۔ اس مقصد کی خاطر پوری قوت صرف کر دینے کا نام جہاد ہے۔

جہاد (کوشش) کی صورتیں بہت سی ہو سکتی ہیں۔ جیسی قسم کے حالات درپیش ہوں اسی قسم کی کوشش کی جائے گی۔ اسلام نے مختلف حالات کیلئے جہاد کی تین مختلف شکلیں مقرر کی ہیں:۔

۱۔ داخلی جہاد
۲۔ دعوتی اور فکری جہاد
۳۔ مسلح جہاد

اب جہاد کی ان تینوں قسموں کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

۱۔ داخلی جہاد:۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں جو برائیاں سر اٹھائیں کوشش کر کے انہیں ختم کر دیا جائے۔ نیکیوں کو پھیلنے پھولنے اور پروان چڑھنے کا موقع دیا جائے۔ کیونکہ برائیوں کی وجہ سے اشاعت اسلام کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طویل حدیث کا ایک حصہ یہ ہے۔ آپؐ نے فرمایا:۔

Marfat.com

"پس جس نے احکام خداوندی کو نظر انداز کرنے والوں کے خلاف اپنے ہاتھوں سے جہاد کیا وہ مومن ہے۔ اور جس نے اپنی زبان سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے اور جس نے اپنے دل سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے۔ اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان کا کوئی درجہ موجود نہیں۔" (صحیح مسلم)

اس حدیث سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ مسلم معاشرے میں جو برائی اور ضلالت پیدا ہو اسے ختم کرنے کی کوشش کو "جہاد" کہتے ہیں۔

۲۔ اس حدیث میں آپ نے برائی کو ختم کرنے کی تین صورتیں بیان فرمائیں اور ان کا الگ الگ درجہ بھی بتایا۔

(الف)۔ برائی کو ختم کرنے کی افضل ترین صورت یہ ہے کہ اس کے خلاف قوت استعمال کر کے اس کو نیست و نابود کر دیا جائے۔

(ب)۔ اگر برائی کو ہاتھ سے ختم کرنے کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے اس کی مذمت کی جائے۔ اس پر کڑی تنقید کی جائے۔ آخرت کی سزا سے ڈرایا جائے۔ خدا کا قہر و غضب یاد دلایا جائے۔ جب ان باتوں سے کام نہ چلے تو زجر و عتاب سے کام لیا جائے۔

(ج)۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ برائی کو نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ بارگاہِ ایزدی میں اس کو مٹانے کے لئے دعا کی جائے۔

مسلم معاشرے سے برائی کو مٹانے کی یہ تینوں ہی عملی شکلیں ہیں۔ ان میں سے ہر صورت جہاد ہے۔ کیونکہ یہ بھی حق کو دنیا میں قائم رکھنے اور اس کی شہادت دینے کی ایک کوشش ہے۔ اور حق کی خاطر جدوجہد کو "جہاد فی سبیل اللہ" کہتے ہیں۔

برائی کو مٹانے کی جن کوششوں کو اس حدیث میں جہاد کہا گیا ہے دوسری حدیث میں ان کو "تغییر منکر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم میں سے جو شخص کوئی برائی (منکر) دیکھے تو چاہیئے کہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے اور اگر ایسا نہ کر سکتا ہو تو اس کے لئے اپنی زبان سے کام لے اور اگر اس

کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنے دل سے کوشش کرے اور یہ ایمان کا سب سے نچلا درجہ ہے۔ اس کو "نہی عن المنکر" بھی کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا:

"وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (سورۃ لقمان)	بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا:

"ائتمروا بالمعروف وتناهوا عن المنكر"	ایک دوسرے کو نیکی کی تلقین کرو اور برائی سے روکو۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر امت کا اجتماعی فریضہ ہے نہ امت کے افراد اس سے بری ہیں نہ ریاست۔ بلکہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس عظیم فریضہ کو ادا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ قرآن کریم میں فرمایا:

"وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ" (التوبۃ۔ ۷۱)	مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کی رفیق ہیں وہ ایک دوسرے کو بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا ایک مسلمان کی دائمی صفت ہے یہ ایمان و اسلام کے ساتھ لازم ہے جہاں مسلمان ہوگا وہاں یہ کام بھی ضرور کیا جاتا ہوگا۔ مسلمان جب قوت واقتدار پر فائز ہوں تو یہ امر ان کی ذمہ داری میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسلامی ریاست کی خصوصیت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

"الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ" (الحج۔ ۴۱)	یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین پر اقتدار بخش دیں تو نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے۔ بھلائی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمان جس طرح انفرادی حیثیت میں اس بات کو برداشت نہیں کر سکتے کہ برائی پھلے پھولے اسی طرح مسند اقتدار پر فائز ہو کر بھی برائی کے وجود کو

Marfat.com

گوارا نہیں کرسکتے۔ منکرات کو صفحۂ ہستی سے مٹا نا ان کے بنیادی مقاصد میں شامل ہو جاتا ہے۔

۲۔ دعوتی اور فکری جہاد:۔ دعوتی اور فکری جہاد کا مطلب یہ ہے کہ غیر مسلموں کی طرف سے جو دلائل پیش کئے جائیں ان کا شافی جواب دیا جائے ان کے شکوک و شبہات کی تردید کی جائے۔ اس ضمن میں صبر و تحمل اور بردباری کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا جائے۔ معاندانہ و مجادلانہ انداز بیان کی بجائے مشفقانہ طرز استدلال اختیار کیا جائے۔ مخالف عقل و استدلال کی جن قوتوں سے بھی کام لے ان کو تردید و تنقید کے تیروں سے چھلنی کر دیا جائے وہ جن آلات سے مسلح ہو کر اسلام پر حملہ آور ہو ان کو کند کر دیا جائے۔ اس سلسلہ کو اس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک مخالف کے تمام عقلی و فکری اسلحے ختم نہ ہو جائیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی سراسر جہاد تھی۔ قرآن میں فرمایا۔

"فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُمْ بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا" (الفرقان۔۵۲)	آپ منکرین اسلام کا کہنا نہ مانیں اور قرآن کے ذریعے ان سے پورا پورا جہاد کرتے رہیں۔

قرآن کے ذریعے جہاد کرنے کا مطلب یہی ہے کہ منکرین اسلام کے سامنے قرآنی دلائل سے اسلام کی صداقت و حقانیت واضح کریں۔ اور اس طرز استدلال سے ان کے موقف کی کمزوری عیاں کرتے رہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو زبان کا جہاد قرار دیا ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:۔

"جَاهِدُوا الْمُشْرِكِينَ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَأَلْسِنَتِكُمْ" (ابوداؤد)	مشرکوں سے اپنے مالوں، اپنی جانوں اور اپنی زبانوں کے ذریعے جہاد کرو۔

ان آیات و احادیث سے معلوم ہوا کہ دعوتی اور فکری جہاد عقل و استدلال کے ہتھیاروں سے انجام دیا جاتا ہے۔ یہ فکری جہاد اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک منکرین اسلام کے سب فکری قلعے مسمار نہ ہو جائیں۔ قرآن کریم نے مشرکین عرب کے اعتراضات کی دھجیاں جس طرح فضائے آسمانی میں بکھیریں وہ محتاج بیان نہیں۔ سامری کے بارے میں قرآن کے یہ فیصلہ کن الفاظ کافی ہیں۔

"وَلَا یَاْتُوْنَکَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰکَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِیْرًا" (الفرقان ۳۳) یہ لوگ جس قسم کا اعتراض بھی پیش کریں گے ہم اسکا برحق جواب اور بہترین وضاحت آپ کو بتا دیں گے۔

اس فکری جنگ کے لئے قرآن نے براصولی ہدایت دی ہے۔

"وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ" جدل و بحث کیلئے احسن طریق اختیار کیجئے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ طرزِ دعوت اور طریقِ جدل و بحث بڑا مشفقانہ، دل نشین اور مدلل ہونا چاہیئے۔ اس میں مخاطب کے ذہن، عقل و فہم اور نفسیات کو پیش نظر رکھا جائے۔ یہ دباری اور صبر و تحمل اس جہاد کی شرطِ اولین ہے۔ داعی کے لئے لازم ہے کہ وہ درشت کلامی، گالی گلوچ، ایذا رسانی اور مخالفت کا جواب عالی ظرفی دلسوزی، شفقت و محبت اور سنجیدگی کے ساتھ دے۔ قرآن کریم میں صحابہ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا اَذًی کَثِیْرًا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ" (آل عمران ۱۸۶) اور تمہیں اہل کتاب اور مشرکین کی طرف سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سننی پڑیں گی اور ایسے وقت تم نے صبر سے کام لیا اور تقوی کی روش پر جمے رہے تو بیشک یہ بڑے حوصلے کی بات ہوگی۔

ان آیات کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں کا صبر و تحمل اور بردباری، بزدلی اور ذلت کے ساتھ مصالحت کی حدود میں داخل نہ ہوجائے بلکہ صبر و تحمل کے ساتھ ساتھ، مسلمانوں میں جرات و جلالت اور شجاعت و بسالت کا وجود بھی ضروری ہے قرآن میں فرمایا

"فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِکِیْنَ" (الحجر ۹۴) جس بات کا آپ کو حکم دیا گیا ہے اسے کھل کر کہہ دیں اور مشرکوں کی پرواہ نہ کریں۔

۳۔ مسلح جہاد:- یہ جہاد کی تیسری اور افضل ترین صورت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دین کی تبلیغ و اشاعت کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے اور اسی کو مٹانے کیلئے

سے روکتے ہوں ان کے خلاف نبرد آزما ہوں۔ مخالفین کے ساتھ جنگ وپیکار کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک یہ لوگ دعوت وارشاد کا راستہ کھلا نہ چھوڑیں، اس کے افضل الجہاد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اس میں اپنا تن، من، دھن سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ یہ جہاد کی بہت کڑی اور صبر آزما قسم ہے۔ مسلح جہاد اسلامی ریاست کی قیادت میں ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔ اسلامی ریاست کے تحفظ وبقاء اور مسلمانوں کی جان ومال اور ناموس کو بچانے کے لئے مسلح جہاد ناگزیر ہے۔ قرآن میں فرمایا۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (البقرۃ ۲۱۶)

مسلمانو! تم پر دین کی حفاظت فرض کر دی گئی ہے اگرچہ تم کو وہ ناگوار محسوس ہوتی ہو۔ ممکن ہے کہ تم ایک چیز کو ناگوار محسوس کرو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔

جہاد کی غرض وغایت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا۔

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ۔

اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین خدا کے لئے ہو جائے۔

اس آیت میں بتایا کہ مسلح جہاد کی غرض وغایت فتنہ کا انسداد ہے تاکہ خدا کے دین کی اشاعت اور اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کا راستہ کھل جائے اور اس میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ قرآنی اصطلاح میں "فتنہ" کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو خدا کی پیروی کرنے کا حق نہ دیا جائے اور انہیں معبود حقیقی کی بندگی سے روک دیا جائے۔ کسی کو خدا کی اطاعت وعبادت سے روکنا اتنا بڑا جرم ہے کہ خون ناحق کی بھی اس کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں۔ کسی کو قتل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے چند روزہ عیش وعشرت

Marfat.com

سے روک دیا۔ اس کے برخلاف کسی کو خدا پرستی سے روکنے اور اپنے رب کا بندہ بننے سے ہٹا دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو حقیقی زندگی سے محروم کر اور اسے آخرت کی ابدی و دائمی نعمتوں کے قابل نہ رہنے دیا۔ بے شک کسی کو قتل کرنا بھی نہایت مذموم فعل ہے مگر خدا پرستی سے روکنا اس سے بھی عظیم تر جرم ہے۔

اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ — "فتنہ قتل سے بھی زیادہ بری چیز ہے"

ایک اور آیت میں غرض جہاد ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ	اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے
بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ	ذریعے سے دفع نہ کرتا تو صومعے، کلیسے
وَصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ	عبادت گاہیں اور مسجدیں ڈھا دی جاتیں
فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۗ وَلَيَنْصُرَنَّ	جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے اور
اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۔ (الحج۔ ۴۰)	اللہ اپنے دین کی مدد کرنے والوں کی ضرور مدد کرے گا

اس آیت سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اگر دین کی حفاظت کے لئے جنگ کر کے فتنہ کو ختم نہ کیا جائے تو دین کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اگر مخالفین اسلام سے لڑ کر فتنہ پردری کا انسداد نہ کیا جائے تو خدا کی زمین پر اس کا نام لینا مشکل ہو جائے گا اور خدا پرستی کے ایک ایک نشان کو نیست و نابود کر دیا جائے گا۔ اس لئے مسلح جہاد کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ دعوت دین کے لئے جبر و تشدد استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

لَاۤ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ — دین میں جبر کی اجازت نہیں

مندرجہ ذیل مقاصد کے لئے اسلام میں مسلح جہاد کی اجازت ہے۔

Marfat.com

۱۔ دفاعی :۔ اعدائے دین جب مسلمانوں پر حملہ آور ہوں تو دین و مذہب مال و جان، ناموس و آبرو اور اسلامی ریاست کے تحفظ کے لئے اسلام میں جنگ کی اجازت ہے۔

۲۔ دفع فتنہ :۔ جب انسانوں کو ظلم کی آماجگاہ بنایا جائے۔ دعوتِ اسلام کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں اور خدا کے بندوں کو خدا کے بجائے انسانوں کا غلام بنایا جائے تو شر اور فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے طاقت کو استعمال کرنا درست ہے۔ اسلام شیطانیت کی گردن کو توڑنے کے لئے تو طاقت استعمال کرتا ہے مگر کسی فرد یا گروہ کو بزور و جبر اسلام میں داخل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اسلام کی تعلیم اس ضمن میں یہ ہے کہ ہر شخص کے سامنے دین کی صداقت واضح کر دی جائے۔ حق کو باطل سے نکھار دیا جائے۔ اب اسے اختیار ہے کہ حق کو قبول کرے یا اسے رد کرے۔ ہمارا فرض طاغوتی طاقتوں کو نیچا دکھانا، ظلم کی راہیں مسدود کرنا اور دعوتِ حق کو عام کرنا ہے۔ اس کے بعد جو شخص اس دعوت کو قبول کرتا ہے تو وہ اس امت میں داخل ہو جاتا ہے اور اگر رد کر دیتا ہے تو اسے یہ حق بھی حاصل ہے۔ دعوتِ حق کو قبول نہ کرتے ہوئے بھی اگر کوئی شخص ذمی ہونے کی حیثیت سے اسلامی ریاست میں سکونت گزیں ہے تو اس کی جان و مال اتنی ہی محفوظ اور اس کی ناموس و آبرو اسی طرح قابلِ احترام ہے جس طرح ایک مسلمان کی۔ ہمارا کام اشاعتِ دین ہے۔ اگر ہم صحیح طور پر یہ فریضہ ادا کر رہے ہیں تو ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا اور اگر ہم اس فرض کو ادا کرنے میں سہل انگاری اور تغافل شعاری سے کام لے رہے ہیں تو ہم اس کے لئے بارگاہ خداوندی میں جوابدہ ہوں گے۔

رہنمائے

اسلامی نظریہ حیات

(سوالاً جواباً)

بمطابق جدید نصاب

برائے امتحان بی۔ اے اسلامیات پنجاب یونیورسٹی

بتجدید نظر و اضافہ

غلام احمد حریری

یم ۔ اے (عربی) ایم ۔ اے (علوم
سلامیہ) ایم ۔ او ۔ ایل (عربی)،
اضل السنہ شرقیہ ۔ فاضل درس نظامی
لوم اسلامیہ مغربی پاکستان زرعی یونیورسٹی
لائلپور

امتیاز احمد سعید

ایم اے (علوم اسلامیہ)
ایم ۔ اے (عربی)، جے ۔ ڈی ۔ ڈبلیو
پی ۔ ای ۔ ایس شعبہ علوم اسلامیہ
گورنمنٹ کالج لاہور ۔

مجید بک ڈپو

بھوانہ بازار لائلپور

اردو بازار لاہور

Marfat.com